ہر گھر کی زینت

ماہنامہ

دوشیزہ

کراچی

March

2015

باتیں ملاقاتیں

ناول

مکمل ناول

ناولٹ

افسانے

انتخابِ خاص

رنگِ کائنات

دوشیزہ میگزین

افسانے

زرِ سالانہ بذریعہ رجسٹری
پاکستان (سالانہ)......890 روپے
ایشیا، افریقہ، یورپ......5000 روپے
امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا......6000 روپے

پبلشر: منزہ سہام نے سٹی پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔ مقام: سی OB-7 تالپور روڈ۔ کراچی
Phone : 021-35893121 - 35893122
Email : pearlpublications@hotmail.com

ماہِ مارچ

موسم دھیرے دھیرے تبدیل ہوا چاہتا ہے۔ لیجیے سرما کے بعد اِدھر خزاں نے دھرتی پہ سے رنگ غائب کیے، اُدھر بہار نے ہر طرف رنگ ہی رنگ سے دھرتی کی چنری سجادی۔

اپنی مادرِ وطن کے دن، (یوم پاکستان) کیا لکھوں...... کیا امید باندھوں، کہ لفظ بانجھ ہونے لگے ہیں مگر... مجھے امید کی کرن واضح طور پر دکھائی دے رہی ہے۔ ظلم کے بادل نے جب اپنے گیلے گیلے پنجوں سے دستک دی تھی تو لہو کھل کر برساتھا۔ اِس رنگین موسمِ بے ثبات میں ڈیسنس آف ہیومر رکھنے والی ماؤں کی پیدائش ہوئی تھی۔ ان ماؤں نے جاتے جاتے وقت کی پگڈنڈی پر ہمت کی کشتیاں رواں کردی تھیں۔ یہ وہی امید کی کشتیاں ہیں جو آج مادرِ وطن کی شکل میں ستون بنی دھرتی کے نقشے پر سینہ ٹھونک کر کھڑی ہیں۔

اس بات کی اس سے بڑی گواہی اور کیا ہوگی کہ اسی ماہ مارچ میں ہم 'پاکستان ڈے' مناتے ہیں اور اِسی ماہ میں 'ویمن ڈے' منایا جاتا ہے۔

آج بھی عورت اپنی عظمت کو اپنے حوصلوں میں پرو کر وطن کے سپوتوں کو پروان چڑھا رہی ہے۔ پاکستانی عورت آج ہر محاذ پر سینہ سپر ہے۔ سولہ دسمبر کی لہو رُلاتی صبح میں اپنے جگر گوشوں کا خون میں لتھڑا، چھلنی وجود لیے اے پی ایس کے دروازے سے نکلتی عورت ہو یا سیلاب سے تباہ برباد، کاندھوں پر خاندان کا بوجھ اٹھائے تیرتی ہوئی عورت۔ زلزلے میں اپنے زخم زخم وجود لیے اپنے پیاروں کو ڈھونڈتی ہوئی عورت ہو یا خلاؤں میں آسمان پر کمندیں ڈالتی عورت۔ پاک فوج کے کاندھوں سے کاندھا ملائے فرض ادا کرتی عورت ہو یا اسپتالوں میں زخمی مریضوں کو حوصلہ دیتی عورت۔ عدالت میں کالا کوٹ پہنے انصاف کے لیے برسرِ پیکار عورت ہو یا کھیتوں سے فصل کاٹتی کسان عورت۔ پاکستانی عورت نے ہر میدان میں اپنا آپ منوایا ہے۔ بس اتنا کہنا ہے کہ اگر آپ سچے پاکستانی ہیں تو عورت کا احترام کریں۔

کاشی چوہان

منورہ نوری خلیق

زادِ راہ

دین کی دعوت اور روحانی علوم کی اشاعت کے لیے بے شک تھوڑا کام کیجیے، لیکن مسلسل کیجیے۔ لوگوں کو روحانی صلاحیتوں سے استفادہ کرنے کی دعوت دیجیے اور اس راہ میں پیش آنے والی مشکلات، تکالیف اور آزمائشوں کا خندہ پیشانی سے......

زندگی کو آسان، باعمل اور ایمان افروز بنانے کا روشن سلسلہ

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔ ''اپنے رب کے راستے کی طرف دعوت دیجیے۔ حکمت کے ساتھ، عمدہ نصیحت کے ساتھ اور مباحثہ کیجیے ایسے طریقے پر جو انتہائی بھلا ہو۔''

قرآن پاک کی اس آیت سے ہمیں تین اصولی ہدایات ملتی ہیں۔

۱۔ شر سے محفوظ رہنے اور خیر کو اپنانے کے لیے دعوت، حکمت کے ساتھ دی جائے۔

۲۔ نصیحت ایسے انداز میں نہ کی جائے جس سے دل آزاری ہوتی ہو۔ نصیحت کرتے وقت چہرہ بشاش ہو، آنکھوں میں محبت اور یگانگت کی چمک ہو، آپ کا دل خلوص سے مامور ہو۔

۳۔ اگر کوئی بات سمجھاتے وقت بحث و مباحثہ کا پہلو نکل آئے تو آواز میں کرختگی نہ آنے دیں۔ تنقید ضروری ہو جائے تو یہ خیال رکھیں کہ تنقید تعمیری ہو، دلسوزی اور اخلاص کی آئینہ دار ہو۔ سمجھانے کا انداز ایسا دلنشیں ہو کہ مخاطب میں ضد، نفرت، تعصب اور طبیعت کے جذبات میں اشتعال پیدا نہ ہو اور اگر مخاطب کی طرف سے ضد اور ہٹ دھرمی کا اظہار ہونے لگے تو فوراً اپنی زبان بند کر لیجیے کہ اس وقت یہی اس کے حق میں خیر ہے۔

دین کی دعوت اور روحانی علوم کی اشاعت کے لیے بے شک تھوڑا کام کیجیے، لیکن مسلسل کیجیے۔ لوگوں کو روحانی صلاحیتوں سے استفادہ کرنے کی دعوت دیجیے اور اس راہ میں پیش آنے والی مشکلات، تکالیف اور آزمائشوں کا خندہ پیشانی سے استقبال کیجیے۔

نبی کریم ﷺ کا ارشادِ عالی مقام ہے۔

''بہترین عمل وہ ہے جو مسلسل کیا جائے، چاہے وہ کتنا ہی تھوڑا ہو۔''

دین کو پھیلانے کے لیے ہمیشہ دو طریقے رائج رہے ہیں۔ ایک طریقہ یہ ہے کہ مخاطب کی ذہنی صلاحیت کو سامنے رکھ کر اس سے گفتگو کی جائے اور حسن اخلاق سے اس کو اپنی طرف مائل کیا جائے۔ اس کی ضروریات کا خیال رکھا جائے۔ اس کی پریشانی کو اپنی پریشانی سمجھ کر تدارک کیا جائے۔

دوسرا طریقہ یہ ہے کہ تحریر و تقریر سے اپنی بات

دوسروں تک پہنچائی جائے۔ موجودہ دور تحریر و تقریر کا دور ہے۔ فاصلے سمٹ گئے ہیں، زمین کا پھیلاؤ ایک گلوب میں بند ہوگیا۔ آواز کے نکتۂ سفر سے امریکا اور کراچی کا فاصلہ ایک کمرے سے بھی کم ہوگیا ہے۔

کراچی میں بیٹھ کر لندن، امریکا کی سرزمین پر اپنا پیغام پہنچا دینا روزمرہ کا معمول ہوگیا ہے۔ یہی صورتِ حال تحریر کی ہے۔

نشرواشاعت کا ایک لامتناہی سلسلہ ہے۔ امریکا یا دور دراز کسی بھی ملک میں ٹائپ ہونے والی تحریر کراچی یا اسلام آباد میں اس طرح پڑھی جاتی ہے کہ جیسے کراچی میں ہی لکھی جارہی ہو۔

تحریر قاری کے اوپر ضرور تاثر چھوڑ دیتی ہے ایسا تاثر جو ذہن کے اندر فکر و فہم کی تخم ریزی کرتا ہے اور پھر یہی فکر و فہم ایک تناور درخت بن جاتا ہے۔

اپنی تحریر اور تقریر میں ہمیشہ اعتدال کا راستہ اختیار کیجیے۔ الفاظ کی نشست و برخاست ایسی ہو کہ سننے اور پڑھنے والے کے اوپر امید اور تعلقِ خاطر کی کیفیت طاری ہو جائے۔ خوف کو درمیان میں نہ لایئے کہ خوف پر مبالغہ آمیز زور دینے سے بندہ خدا کی رحمت سے مایوس ہوجاتا ہے اور اسے اپنی اصلاح اور نجات نا صرف مشکل بلکہ محال نظر آتی ہے۔

تحریر میں ایسے الفاظ لکھیے جن میں رجائیت نہ ہو۔ خدا سے محبت کرنے کا ایسا تصور پیش کیجیے کہ خوف کی جگہ ادب واحترام ہوتا کہ وہ خدا کی رحمت اور بخشش کو اس کے پورے ادب اور احترام کے ساتھ قبول کرے۔

حضرت علیؓ فرماتے ہیں۔ ''بہترین عالم وہ ہے جو لوگوں کو ایسے انداز سے مخلوقِ خدا کی طرف دعوت دیتا ہے کہ خدا سے بندے مایوس نہیں ہوتے اور نہ ہی خدا کا ایسا تصور پیش کرتا ہے کہ وہ خدا کی نافرمانی کی سزا سے بے خوف ہوجائیں۔''

☆☆☆

دوشیزہ کی محفل

محبتوں کا طلسم کدہ' خوب صورت رابطوں کی دلفریب محفل

خط بھجوانے کے لیے پتا: ماہنامہ دوشیزہ ڈائجسٹ۔ 88-C II۔خیابانِ جامی ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی۔فیز-7،کراچی
E-mail:pearlpublications@hotmail.com

بہت پیارے ساتھیو!

آپ سب کو اپنی نئی میزبان رضوانہ پرنس کا سلام قبول ہو۔ پیار محبت اور خلوص سے مہکتی اِس محفل کی دوبارہ میزبانی کرتے ہوئے نہ جانے کیوں دل کو یقین سا ہے کہ آپ لوگ ہمیں بھولے نہیں ہوں گے۔ بھئی ہمیں تو ایسا ہی لگ رہا ہے جیسے گزرے ہوئے یہ چند سال ہمارے درمیان آئے ہی نہیں ہیں۔ کیوں ٹھیک ہے نا؟ تو ساتھیو! نفرتوں اور عداوتوں سے بہت دور محبتوں کی چھاؤں میں جو یہ محفل سجی ہے اِس میں بیٹھ کر ہم ایک دوسرے کا دُکھ سُکھ بانٹیں گے، آنسو شیئر کریں گے، ہنسیں گے، مسکرائیں گے اور دوشیزہ پر آپ کی تعریف اور تنقید دونوں کا خیر مقدم کرتے ہوئے آپ کی ہر بات سنیں گے۔ تو آیئے دیکھتے ہیں کہ آج ہمارے یہ پیارے پیارے سے مہمان ہم سے کیا کہنا چاہ رہے ہیں۔

✉: ہماری پہلی مہمان کراچی سے ریحانہ مجاہد ہیں جو کافی خوش نظر آرہی ہیں، لکھتی ہیں ڈیئر رضوانہ پرنس۔ السلام علیکم۔ ماہنامہ دوشیزہ میں ایڈیٹر کے طور پر آپ کا نام پڑھ کر بے حد خوشی ہوئی۔ آپ کو ہم دوشیزہ کے پرانے قاری خوش آمدید کہتے ہیں اور اُمید کرتے ہیں کہ آپ اس خوبصورت رسالے کو مزید چار چاند لگادیں گی کیونکہ آپ کے پرستار بہت بڑی تعداد میں ہیں اور آپ کو پڑھنا چاہتے ہیں۔ میں یوں تو ہر ماہ دوشیزہ خرید کر پڑھتی ہوں لیکن اب اس کی سالانہ خریدار بننا چاہتی ہوں۔ اس سلسلے میں آپ میری مدد فرمائیں۔ میری جانب سے منزہ اور دوشیزہ تمام اسٹاف کو سلام۔ نیک خواہشات کے ساتھ ریحانہ مجاہد۔

ﷺ: بہت پیاری ریحانہ تمہارا اپنایت بھرا خط دل کو ڈھیر ساری خوشیاں دے گیا۔ لیکن دیکھو اب تمہیں ہر ماہ اِس محفل کو رونق بخشنا ہوگا غائب نہ ہوجانا۔ سالانہ خریدار بننے کے لیے **890** روپے کا منی آرڈر دوشیزہ کے پتے پر بھیج دو۔ یہ حسین دوشیزہ ہر ماہ خود تم سے ملنے تمہارے گھر آجایا کرے گی۔ منزہ اور تمام اسٹاف تمہیں وعلیکم السلام کہہ رہا ہے۔

✉: کراچی سے ہی شگفتہ شفیق بھی مسکراتی ہوئی کچھ کہنا چاہ رہی ہیں، لکھتی ہیں میرے پیارے دوشیزہ، ہمیشہ تمہاری جگمگاہٹیں قائم و دائم رہیں۔ بہت طویل عرصے کے بعد اپنے ان پیاروں سے مخاطب ہوں جن کی محبت اور دعائیں مجھے موت کی چوکھٹ سے واپس لے آئی ہیں۔ آپ سب یقین کریں کہ میں آپ سب کی محبت

کی ایسی مقروض ہوں کہ میں ہر نماز کے بعد اپنے آپ پر فرض سمجھتی ہوں کہ پہلے آپ سب کی خوشیوں اور صحت و سلامتی کی دعا کروں۔ پیاری منزہ سے اکثر ملاقات رہی ہے اور ہر بار ملنے کے بعد محبت میں مزید اضافہ ہی ہوا ہے۔ قاصد نے یہ اطلاع دی ہے کہ ہماری رضوانہ نے دوبارہ دوشیزہ جوائن کرلیا ہے، بے حد مبارک باد۔ ہمارا مارچ میں انشاء اللہ لاسٹ کیموتھراپی ہے اور اس کے بعد ہم بھی آپ کے ساتھ ریگولر ہونے کی کوشش کریں گے۔ آج کل اپنی دو نئی کتابوں پر بھی کام کررہی ہوں، آپ سب کے افسانے اور کہانیاں پڑھتی رہی ہوں سب دوستوں کو میری طرف سے خوشیوں کی آمد پر مبارک باد اور ناگہانی صدمات پر یہ پیغام کہ ہمت اور حوصلے سے کام لیں یہ وقت انشاء اللہ گزر جائے گا آخر میں آپ سب کے لیے ڈھیر ساری دعائیں۔

ط: پیاری سی دوست تم اتنی بے شمار دعاؤں کے حصار میں ہو کہ انشاء اللہ صحت اور سلامتی کے ساتھ ایسے ہی ہمیشہ خوش اور مسکراتی رہو گی۔ اور دیکھو ریگولر آنے والی بات پر قائم رہنا۔

✉: تلمیہ سے اُمِ جلال بخاری اپنے طویل خط کے ساتھ تشریف لائیں ہیں، لکھتی ہیں۔ سلام خلوص! جنوری کے دونوں شمارے ملے۔ میرا دل چاہ رہا ہے کہ 'سچی کہانیاں' میں میں بھی اپنی سچی کہانی لکھوں کیا مجھے جگہ ملے گی۔ اب میں آتی ہوں تبصرے کی طرف۔ (بالکل جگہ ملے گی) میں جس طرح اب زندگی کے ایام گزار رہی ہوں۔ وہ زندہ انسانوں کی زندگی نہیں۔ دوہری خوشی، نئے سال کا پہلا شمارہ اور وہ بھی سال گرہ نمبر۔ بھئی پیاری دوشیزہ تمہیں سال گرہ مبارک میرے لیے خوشی کی بات کہ تمہارے صفحات پر میرا نام بھی آگیا، میری منی سی نور العین گڑیا بھی شاعری کے حوالے سے۔ بلیک ڈے صرف بلیک ڈے نہیں بلکہ ایسی کالی آندھی گھٹا ٹوپ اندھیری جس نے ہزاروں گلوں گلزاروں غنچوں نونہالوں کو موت کی گھٹا ٹوپ وادی میں دھکیل دیا۔ ایسے ہیں کہ بڑھتے جارہے ہیں۔ دکھوں اور مصائب نے تو پاکستان کی راہ دیکھ لی ہے۔ امن وسکون تو بس اب خواب ہوا جاتا ہے۔ موت کا عفریت انسانوں کو نگل رہا ہے۔ اس دفعہ بے حد پیارا دلنشین موضوع چنا ہے۔ منورہ نوری خلیق صاحبہ

نے 'زادِراہ' نے میں، انہوں نے معاشرے کی نبض پر ہاتھ رکھا ہے۔ خود میں اسی المیے کا شکار ہوں۔ سید محمد جلال حیدر اور سیدہ نورالعین زاہرا۔ایسی دو ہستیاں ہیں جو واحد میری زندگی کا مرکز ہیں۔

دوشیزہ کی محفل میرے پسندیدہ صفحات پر مشتمل ہوتا ہے۔ اِس میں میری پسند کیا ہے؟ مختلف بہنیں مختلف شہروں سے مختلف خیالات، مختلف تبصرے ہر رائٹر اپنے گھر کا نمائندہ۔ اپنے شہر کا۔ اقبال بانو کی ڈولی، گویا میری نور کی کہانی ہے۔ فرزانہ آغا کا اک کوہ گراں اور اُم مریم کا ناول رحمٰن رحیم، سدا سائیں نور کا پسندیدہ ناول ہے۔ عرفان رامے منجھا ہوا رائٹر ہے۔ شجر ممنوعہ نے میرا دل مٹھی میں جکڑ لیا۔ بعض لوگ ایک موت سے دوسری موت میں چلے جاتے ہیں۔ فہیم کے بارے میں کیا کہوں؟ عرفان تم نے کمال کر دیا ہے۔ ایک ایسا المیہ جو آج کل ہو رہا ہے۔ روشانے کا ناول صبغت اللہ سورۃ بقرہ کی ایک آیت کے موضوع پر ہے کہ اللہ کا رنگ سب رنگوں سے خوبصورت اور خوش نما ہے سیمار ضا ردا بہت اچھی رائٹر بھی ہیں اور کینوس میں اپنی تحریر کا رنگ دکھایا ہے۔ نعمان اسحٰق 'میرے پرندۂ دل' چوتھی قسط کا انتظار ہے۔ رضیہ مہدی میری فیورٹ ترین رائٹر ہیں۔ 'قصاص' لکھ کر انہیں احساس خود بھی ہوا ہوگا کہ ورکنگ وومن سب کے لیے اپنے لیے پیسہ کمانے والی مشین کے سوا کچھ نہیں رہتی۔ وہ خود بھی ورکنگ وومن ہیں۔ جذبوں کی شدت اور مجبوریوں کے الاؤ دو متضاد چیزیں ہیں۔ شمارے کی جان قصاص۔ نیرٔ شفقت نے بالکل حقیقت بیان کی ہے۔ بیٹے کی خواہش میں لوگ اندھے ہو کر ایسا ہی کرتے ہیں۔ رولنگ سٹون لگائی گک (اور وہ جو زندگی میں سب سے عزیز ہوتی ہے) اڑائی اور وہ کٹی پتنگ کی طرح رُل گئی۔ راحت وفا راجپوت اور راحت وفا دونوں ہی رائٹرز بھی ہیں اور لیکچرر بھی۔ راحت وفا راجپوت کی 'محبت' میں آخری بات جو حلالی خون کی پہچان تھی کہ طبیب نے جو کہی۔ جس گھر میں کھاتے ہیں نمک کی تو پوچھ گچھ ہوگی اچھا اور فکر انگیز خیال سمجھا یا راحت ویلڈن۔ ابھی تو میں نے اب ہی تو شروع کیا تھا پڑھنا۔ آئینہ عکس اور سمندر مگر یہ کیا کیا موٹی ہرنی جیسی آنکھوں والی عقیلہ حق تم نے؟؟ اس پر تبصرہ ابھی محفوظ کیونکہ میں سابقہ شمارے نکالوں گی اور مکمل پڑھ کر انجوائے کروں گی۔ انتخاب خاص میں تو میری روح اٹکی ہوئی ہے۔ میری جان ہے جان۔ اور پھر قندِ مکرر کی طرح یہی ادبی لوگوں کی قد آور تحریریں ہیں۔ جو چاشنی اندر تک گھل جاتی ہے اور بانو آپا ہوں یا اشفاق احمد، کرشن چندر ہو یا پریم چند۔ امرتا پریتم ہو یا سعادت حسن منٹو، الطاف فاطمہ ہو یا قرۃ العین حیدر، راجندر سنگھ بیدی ہو یا ممتاز مفتی۔ اس کے بعد تمام اشیاء، تمام اوراق اچھے مگر قیمہ میری پسندیدہ ڈش ہے شملہ مرچ کے ساتھ تو پھر۔ مگر۔ اے بسا آرزو کہ خاک شدہ۔ بڑے کا قیمہ میں کھاتی نہیں اور بکرے پہنچ سے ہی باہر لہٰذا چپکے سے آگے بڑھ گئے۔ حکیم صاحب اور بیوٹی گائیڈ کو دیکھا اور...... نورالعین کی پوئٹری۔ یہ اُس کے دل کی آواز ہے۔ بچپن میں میں پردہ کی وجہ سے بہت محدود ماحول میں پلی ہے۔ چار سال کی عمر میں برقعہ اوڑھا۔ گھر میں روحانی سلسلے کی وجہ سے عورتوں کے ساتھ بچیاں آتیں تو مٹی کے برتن بنا کر گھر گھر کھیلتی۔ مگر افسوس شادی شدہ ہونے پر نہ گھر ملا نہ گھر کا سامان نہ شوہر کا پیار ملا نہ شوہر کی کمائی۔ اُس کی حوصلہ افزائی کرتی رہیے۔ آپ سب کے لیے نیک خواہشات کے ساتھ اب اجازت چاہتی ہوں۔ خط ضرور لگائیے گا مجھے انتظار رہے گا۔ اللہ نگہبان و حافظ و ناصر۔

ﮬ: محترمہ اُم جلال بخاری صاحبہ۔ آپ کا طویل جذباتی خط پڑھ کر آپ کے دکھ اور آنسو ہم نے اپنے دل پر محسوس کیے ہیں، جگہ کی تنگی کے باعث صرف تبصرہ شامل کر رہے ہی۔ آپ بچی کہانیاں میں اپنی آپ

بھی ضرور بھیجیں۔

✉: کراچی سے صبوحی کاظمی بھی خراماں خراماں چلی آرہی ہیں، لکھتی ہیں۔ محترمہ ایڈیٹر صاحبہ۔ السلام علیکم۔ آج بہت عرصے بعد دوشیزہ کی محفل میں شرکت کررہے ہیں۔ رضوانہ پرنس کی مقناطیسی شخصیت کھینچ لائی۔ اللہ آپ کی دوشیزہ کی دوشیزگی ہمیشہ برقرار رکھے۔ یہ سدابہار دوشیزہ ہے وقت کی گرد اس پر کوئی اثر نہ ڈال سکی، ماشاء اللہ۔ آج ماں کے بارے میں ایک غزل لے کر حاضر ہوئے ہیں۔

✍: ڈیر صبوحی محفل میں خوش آمدید۔ دوشیزہ کے لیے دعاؤں کا بہت شکریہ لیکن کیا ہم امید کرلیں کہ آئندہ آپ مفصل تبصرہ کے ساتھ آکر ہمیں مزید خوش ہونے کا موقع دیں گی۔

✉: سنگھ پورہ لاہور سے یاسمین اقبال لکھتی ہیں، السلام علیکم۔ ڈھیر ساری دعاؤں کے ساتھ اللہ آپ کو خوش اور سلامت رکھے۔ سب سے پہلے نظم شائع کرنے پر بہت شکریہ۔ ایک شکایت ہے کہ رسالہ بہت لیٹ ملتا ہے۔ فروری کا خوبصورت شمارہ ہاتھوں میں ہے۔ منورہ آپی کا ایمان افروز سلسلہ زادِ راہ سے مستفید ہوئے۔ دلشاد نسیم کی دل کی باتیں دل میں گھر کرگئیں، اللہ ان کی والدہ کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے آمین۔ یوں تو تقریباً سبھی کہانیاں اچھی تھیں۔ مگر شمیم فضل خالق کی تحریر اندھیرے کے مسافر بڑی زبردست تحریر تھی۔ ہمیں اللہ کی رحمت سے کبھی بھی مایوس نہیں ہونا چاہیے۔ رفعت سراج کا نیا ناول دامِ دل کی پہلی قسط ہی زبردست تھی۔ ہمارے معاشرے کی کڑوی حقیقتوں پر مشتمل یہ ناول ضرور پڑھنے والوں کے دل میں گھر کرے گا۔ سنبل کا لکھا مکمل ناول محبت اسمِ اعظم ہے، اچھا لگا۔ انتخابِ خاص بھی اچھا تھا اور رنگِ خاص میں مکان خالی ہے، نے ہمیں بھی اپنے بے بس مالک مکان ہونے کی یاد دلادی۔ نئے لہجے نئی آوازیں میں سدرہ انور علی کے دوشیزہ موبائل سے خوب لطف اندوز ہوئے۔ سباس گل کی غزل اور رشتوں سے گلہ کرتی ثمینہ عرفان کی شاعری کے ساتھ ساتھ فصیحہ آصف

”ایک تقریب ملاقات“

بہت عزیز قارئین!

ہم نے سوچا کہ رائٹرز کے ساتھ تو گیٹ ٹو گیدر ہوتے ہی رہتے ہیں، کیوں نہ بہار کے اِس خوبصورت موسم میں اِس بار اپنے دوشیزہ پڑھنے والے قارئین کے ساتھ ایک شام منائی جائے کہ دوشیزہ کی یہ جگمگاہٹ آپ سب پڑھنے والوں کے دم سے ہی تو ہے سو محبتوں اور رابطوں کے اِس بندھن کو مضبوط کرنے کے لیے ہم نے اگلے ماہ ”ایک تقریب ملاقات“ کا اہتمام کیا ہے، جس میں ہم اپنے قارئین کے ساتھ چائے پر کچھ لمحات کو یادگار بنائیں گے اور پھر اِس تقریب خاص کی تصویری جھلکیاں اگلے ماہ کے شمارے میں شائع کی جائیں گی تو قارئین اِس تقریب ملاقات میں شرکت کے لیے فوری طور پر مندرجہ ذیل ٹوکن پُر کرکے ہمیں آج ہی پوسٹ کردیں۔ دیر سے ملنے والے کوپن تقریب کے دعوت نامے میں شامل نہیں ہوسکیں گے۔

بھیگی سردیوں میں کسی کو پکارتی اچھی لگیں۔ فریدی فری کے سفر نے ہمیں بھی تھکا دیا۔ فریدہ کی شاعری زبردست ہوتی ہے ان کی صحت کے لیے دل کی گہرائیوں سے دعا ہے، اللہ آپ کو صحت اور تندرستی کے ساتھ سلامت رکھے۔ آمین۔ اپنی ایک اور نظم ارسال کر رہی ہوں، امید ہے ضرور شائع کریں گے، آپ کے لیے اور تمام اسٹاف کے لیے دعائیں اور سلام، ایک بے حد خوبصورت شعر کے ساتھ اجازت چاہوں گی۔

محبت کی جڑیں پھوٹ ہی پڑتی ہیں کہیں سے　　دل سوکھ بھی جائے تو بنجر نہیں ہوتا

ج: اچھی یاسمین شعر واقعی بہت ہی پیارا ہے بے اختیار واہ واہ کہنے کو دل چاہ گیا۔ تمہاری نظم شائع ہو جائے گی کہ اپنی امی کے چلے جانے کے بعد ماں پر لکھی ہوئی ہر چیز دل میں اتر سی جاتی ہے۔ اپنی رضوانہ آپی کو دعاؤں میں یاد رکھنا۔

✉: راحت وفا راجپوت لاہور سے رقم طراز ہیں۔ لکھتی ہیں، محترم ایڈیٹر صاحب، سدا مثل گل خنداں رہیں۔ آداب، خیریت بہ عافیت نیک مطلوب! میرے پاس الفاظ نہیں ہیں۔ آپ کا شکریہ ادا کرنے کے لیے۔ آپ نے میری تحریر 'محبت' کو اپنے رسالے میں جگہ دے کر میرا مان بڑھا دیا ہے۔ بلاشبہ دوشیزہ کا معیار بہت بلند ہے۔ اس میں چھپنا میرے لیے اعزاز کی بات ہے۔ بہت بہت نوازش۔ ایک افسانہ 'مذاق' بھیج رہی ہوں۔ رنگ کائنات کے سلسلہ کے لیے بھی تحریر 'تبصرہ' بھیج رہی ہوں۔ اس امید کے ساتھ کہ میری تحریر آپ کے معیار پر پوری اترے۔ پسند آئے تو ضرور حوصلہ افزائی کیجیے گا۔ آپ کے لیے ڈھیروں دعاؤں کے ساتھ۔

ج: پیاری راحت تمہاری 'محبت' سچی اور اچھی تھی۔ اس لیے دوشیزہ نے قبول کی۔ اب انشاء اللہ تمہارا 'مذاق' بھی دوشیزہ کو ضرور پسند آئے گا۔

✉: سیدہ نور العین زاہرہ شاہ تلمبہ سے ہماری محفل کی مہمان بنی ہیں۔ السلام علیکم! کیا حال ہیں جی آپ کے، میرا لیٹر لگا کر دل خوش کر دیا۔ آپی دردانہ نوشین خان اتنی خاموشی کیوں؟؟؟ لائف بہت ٹف ہے آج کل۔ چھوٹے چھوٹے اداس دن، صبح سے شام کا پتا ہی نہیں چلتا۔ پھر آپ نے کہا ہے کہ تفصیلی تبصرہ چاہیے تو حاضر ہوں لائٹ نہیں ہے، رات کا ٹائم ہے، سیل فون کی مدھم لائٹ پر لکھ رہی ہوں!!! سب سے پہلے تو 'نگہت نسیم کی ابو پاری' یقین کریں میں رو پڑی۔ دل کو چھو گئی۔ ویلڈن نگہت نسیم۔ ابھی فی الحال اک کہانی پڑھی ہے۔ باقی سلسلے بہترین تھے ہمیشہ کی طرح میری نظم کے لیے بہت بہت شکریہ۔ میری نظم آپ سب لوگوں کو کیسی لگی؟؟؟ اُم مریم جتنا پیارا آپ کا نام ہے اتنا ہی پیارا آپ کے ناول کا نام ہے، ویلڈن مریم جی۔ بلیک ڈے میں کیا لکھوں کیا کہوں؟؟ نہ الفاظ ہیں نہ حوصلہ۔

ہمیشہ جنازوں پہ پھول دیکھے تھے　　پہلی بار پھولوں کا جنازہ دیکھا

اللہ پاک ظالموں کو سزا ضرور دے گا۔ ابھی تبصرہ ادھورا ہے جس کے لیے معذرت، دعاؤں میں یاد رکھیں۔

اجازت۔ اللہ حافظ

سلجھا ہوا سا فرد سمجھتے ہیں مجھ کو لوگ　　الجھا ہوا سا مجھ میں کوئی دوسرا بھی ہے

ج: نور العین ڈیئر! سیل فون کی مدھم سی روشنی میں اتنا پیارا سا خط کیسے لکھ دیا تم نے؟ آئندہ بلب کی تیز روشنی میں رسالے پر مفصل تبصرہ لکھنا۔

قارئین کے نام کھلا خط

محترم قارئین!

"مسئلہ یہ ہے" کا سلسلہ میں نے خلقِ خدا کی بھلائی اور روحانی معاملات میں ان کی رہنمائی کے جذبے کے تحت شروع کیا تھا۔ سچی کہانیاں کے اوّلین شمارے سے یہ سلسلہ شاملِ اشاعت ہے۔ گزشتہ برسوں میں ان صفحات پر تحریر و تجویز کردہ وظائف اور دعاؤں سے بلاشبہ لاکھوں افراد نے نا صرف استفادہ کیا بلکہ اس مادی دنیا میں آیاتِ قرآنی اوران کی روحانی طاقت نے حیران کردینے والے معجزے بھی دیکھے۔
ساتھیو! عمر کی جس سیڑھی پر میں ہوں خدائے بزرگ و برتر سے ہر پل یہی دعا کرتا ہوں کہ اُس کے حضور پیش ہونے سے پیشتر کچھ ایسا کرجاؤں کہ میرے دُکھی بچے، بچیاں میرے بعد کسی بھی ذریعۂ روزگار کو بروئے کار لاتے ہوئے عزت کے ساتھ رزقِ حلال کماسکیں۔

اتنے برس بیت گئے۔ آپ سے کچھ سوال نہ کیا۔ وہ کون سی پیشکش تھی جو نہ ٹھکرائی۔ کیسے کیسے دولت کے انبار ایک طرف کردیے۔ مگراب...... وقت چونکہ ریت کی طرح ہاتھوں سے پھسلتا جارہا ہے۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ ایک ایسا ٹرسٹ، اپنی موجودگی میں قائم کرجاؤں جس سے نیکی اور بھلائی کا یہ سلسلہ جاری و ساری رہے۔

مجھے آپ کا تعاون درکار ہے۔

دکھی انسانیت کی فلاح کے لیے...... آیئے اور اپنے باباجی کا ساتھ دیجیے......

ٹرسٹ میں اپنے عطیات جمع کرائیے۔

مجھے امید ہے۔ اپنے دکھی بھائی بہنوں کا درد محسوس کرتے ہوئے آپ کا اگلا قدم...... ٹرسٹ میں اپنے تعاون کے لیے ہی اٹھے گا۔

✉: مسز نوید ہاشمی، نارتھ ناظم آباد، کراچی سے لکھتی ہیں۔ دوستو اور ساتھیوں السلام علیکم! امید کرتی ہوں آپ سب خیریت سے ہوں گے۔ 16 دسمبر کا دن واقعی Black Day کا جھومر بن گیا ہے۔ منورہ نوری خلیق زادِ راہ کو بہت خوبصورتی سے پیش کرتی ہیں۔ جنوری میں دوشیزہ کی محفل کا ذکر کرتے ہیں۔ نسیم نیازی ایک نام ایک پہچان، آپ کو نئی کتاب (چراغ دل جلائے ہیں) پر مبارک باد پیش کرتی ہوں۔ زمر نعیم کے بھتیجے کی آمد اور صفیہ سلطان مغل، شمع حفیظ، سلمٰی غزل، آسیہ اعوان کو سال گرہ کی بہت بہت مبارکباد۔ احمد سجاد بابر کا نعتیہ مجموعہ کلام کی منظر عام پر آنے پر مبارک باد اور بیٹے کی بہت بہت مبارک باد۔ ماشاءاللہ سے دوشیزہ 43 سال میں بھی جوان تر و تازہ فریش لگتا ہے۔ ہر ناول افسانے دوشیزہ گلستان نئے لہجے، نئی آواز، لولی وڈ، کچن کارنر مزے مزے کے کھانے حکیم جی کا علاج، بیوٹی گائیڈ اِن سب چیزوں نے مل کر ہی اسے اتنی مقبولیت دی ہے۔ اب بات کرتے ہیں آئینہ عکس اور سمندر کی جو عقیلہ حق نے لکھا اور کیا خوب لکھا، آپ کا پہلا ناول کہیں سے نہیں لگتا ہے بے حد پیارا شاندار ناول تھا۔ شجر ممنوعہ محمد عرفان رامے بہت خوبصورت افسانہ تھا ایسا درد جس کی دوا نہیں تھی، صبغت اللہ روشانے عبدالقیوم کا ناول مجھے بہت پسند آیا۔ خدا پر ایمان پر بے یار و مددگار نکلنے والی لڑکی کی کہانی جو خدا کے راہ پر نکلی اور اللہ تعالیٰ نے کیسے اسے اپنے پناہوں میں لے لیا، نگہت نسیم کا افسانہ ابو پاری بہت جاندار تھا جو بے زبان ہو کر بھی یہ بتا گیا محبت کی اپنی زبان ہوتی ہے جو محبت کرنے والے ہی سمجھ سکتے ہیں۔ رضیہ مہدی نے قصاص بہت خوبصورتی سے پیش کیا، بانو قدسیہ کی چابی بہت پیاری تحریر تھی۔ فروری میں دوشیزہ کی محفل میں تشریف لا رہے ہیں۔ شگفتہ شفیق کو اپنی بیٹی کی شادی کی بہت بہت مبارک باد قبول فرمائیں۔ فریدہ مسرور اور صدف آصف کو سال گرہ کی مبارک باد۔ رضوانہ کوثر کے کزن کے بیٹے کے انتقال پر افسوس، خدا انہیں صبر عطا فرمائیں۔ دردانہ نوشین خان کے شوہر کو اللہ تعالیٰ صحت عطا فرمائیں۔ شوہر سب سے بڑا سائبان ہوتا ہے، سہارا ہوتا ہے جو اللہ تعالیٰ کا بہت پیارا انعام یا گفٹ ہے جس کا جتنا شکر ادا کرے کم ہے۔ طلعت اخلاق احمد کی والدہ کے انتقال اور بینا عالیہ کی والدہ کے انتقال پر افسوس ہوا خدا آپ کو صبر عطا فرمائیں۔ غم اور خوشی ساتھ ساتھ چلتے ہیں، کہیں خوشیوں کے پھول تو کہیں غم کی بارش یہ ہی زندگی ہے۔

ھ: مسز نوید ہاشمی۔ آپ کی آمد کا شکریہ۔ ایسے ہی اِس محفل کو رونق بخشتی رہیے گا۔

✉: سنبل کراچی سے لکھتی ہیں، السلام علیکم! اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ ہماری طرف سب خیریت ہے اور تم سب کی خیریت اللہ تعالیٰ سے نیک مطلوب ہے۔ بعد خیریت کے احوال یہ ہے کہ جنوری کا شمارہ نہیں ملا سو فروری کا بھی سنبھال کر رکھا ہوا ہے، کریم آباد جانا ہوا تو وہاں سے جنوری کا شمارہ لاؤں گی تو پھر سارے ایک ساتھ پڑھوں گی۔ جنوری کا شمارہ نہیں ملا سو خط نہیں لکھا حالانکہ سینے میں آگ لگی ہوئی تھی کہ لکھنا ہے مگر 16 دسمبر سے آج تک آنسو نہیں رکے اور آج تو یہ حالت ہے کہ یہ ہنستے کھیلتے بچوں کو دیکھ کر رونا آتا ہے کہ ان کا مستقبل کیا ہے؟ حد ہوتی ہے ظلم کی، بے رحمی کی، درندگی کی، ذلالت کی ننھے ننھے معصوم بچوں کو اتنی بے دردی سے مارا گیا ہے۔ پورے 20 کروڑ پاکستانیوں کی آنکھیں لہو روئیں۔ پہلی مرتبہ مجھے لگا کہ ہمارے سیاست دان اور حکمران صرف کھانے کے لیے ہیں اور ہماری عوام اور ہماری پاک فوج صرف قربانیاں دینے کے لیے ہیں۔ مجھے تو اپنا وہ بچہ نہیں بھولا جو کہ پیدا ہونے سے قبل ختم ہو گیا میں آج بھی سوچتی ہوں کہ وہ ہوتا تو وہ دو سال کا ہوتا۔ تو ان ماؤں کے دل کا کیا

ہوگا جنہوں نے نو مہینے ان بچوں کو اپنی کوکھ میں رکھا اور ایک لمبے عرصے ان کی محبتوں اور شرارتوں کو انجوائے کیا ہے۔ مجھے اپنی فوج سے اتنی محبت کبھی نہیں رہی جتنی APS کے واقعے نے کروادی اور دہشت گرد سمجھتے تھے کہ وہ ہمارے حوصلوں کو پست کردیں گے ہمارے بچوں کو گھر بٹھادیں گے مگر انہوں نے تو ہمارا موزال بلند کردیا 12 جنوری 2015ء کو دھمکیوں کے باوجود اسکولوں اور خصوصاً APS میں بچوں کی حاضری نے ان دہشت گردوں کے منہ پر طمانچہ رسید کیا اور آج انہوں نے ہر بچے کو مجاہد بنا دیا سب کو فوج جوائن کرنی ہے میں سلام پیش کرتی ہوں پرنسپل طاہرہ قاضی، اساتذہ کرام اور دیگر اسٹاف جن ہوں نے اپنی جانیں گنوائیں اس وجہ سے کہ بچوں کو چھوڑنے کے بجائے انہوں نے ان کی ڈھال بننا پسند کیا میں سلام پیش کرتی ہوں ان بچوں کو جنہوں نے اپنے زخمی دوستوں کی مدد کی جان کو خطرے میں ڈال کر اپنے دوستوں کو جانیں گنوا کر بچایا۔ آپ سب نے ہم پر جو قرض چڑھایا ہے وہ زندگی کی آخری سانس تک ہر پاکستانی کے سر پر دھرا رہے گا۔ ایک اور بات تو انٹرنیشنلی تمام اقوام نے مان لی ہے کہ مسلمان مرد کا کوئی مقابلہ نہیں کرسکتا اس لیے پہلے فلسطین اور اب پاکستان میں بچے اور عورتیں مشق ستم ہیں اور طالبان کو میں مسلمان نہیں مانتی کیوں کہ ہمارے پیارے نبی ﷺ کا فرمان ہے" جب بڑوں کا احترام اور بچوں سے شفقت نہیں کرتا وہ ہم میں سے نہیں ہے" اور جسے میرے نبی ﷺ نے کہہ دیا وہ ہم میں سے نہیں وہ ہم میں سے نہیں ہے۔ اور یوں بھی ہمارے نبی نے حالت جنگ میں بھی عورتوں، بچوں، ضعیفوں، معذوروں، اور ہرے بھرے درختوں کو نقصان پہنچانے سے منع فرمایا ہے یہاں تو سب حالت امن میں کہا گیا۔ اب اجازت دو میں اس پر اتنا لکھ سکتی ہوں کہ صفحات پر صفحات بھر سکتی ہوں سو اجازت۔

ج: پیاری سنبل تمہارا خط ہر حساس دل کا ترجمان ہے ہم کو یقین ہے کہ ان بے رحم و ظالم اور سفاک ترین لوگوں کو پیدا کرنے والی ماؤں کو اگر یہ معلوم ہوتا انہوں نے کیسے درندوں کو جنم دیا ہے تو وہ یقیناً اسی وقت ان کا گلا گھونٹ دیتیں۔

✉: فریدہ فری یوسف زئی ہمیں لاہور سے لکھتی ہیں۔ السلام وعلیکم! پندرہ تاریخ کو دوشیزہ ملا اور سچی کہانیاں دونوں ہی میرے فیورٹ میگزین ہیں دوشیزہ میں صرف شاعری بھیجتی ہوں مگر رسالہ سارا پڑھتی ہوں دوشیزہ کے افسانے اور ناول ایک سے بڑھ کر ایک ہوتے ہیں۔ شمیم فضل خالق ہر مرتبہ ایک اچھوتے موضوع کے ساتھ حاضر ہوتی ہیں اس مرتبہ بھی افسانہ بے حد پسند آیا خوش رہیں شمیم جی آپ کو بے حد دعا اور سلام۔ واقعی مانگنا ہے تو اللہ سے مانگو وہ ہر ایک کی دعا سننے والا ہے بشریٰ سعید صدیقی کا ایک الٹا ایک، نگہت غفار کا دوراہا اور امید کی پری اچھی تحریریں لگیں۔ مکمل ناول رحمٰن رحیم سدا سائیں مزا آ گیا ناول پڑھ کر۔ اپنی غزل دیکھ کر خوشی ہوئی سب سے زیادہ سدرہ انور علی کی غزل منفرد رہی، دوشیزہ موبائل اپنی جان سباس گل اور سب کی شاعری دل کو بھائی فصیحہ آصف کی سوال بھی خوب رہی۔ کچن کارنر میں سندھی مسالا گوشت اور گاجر کا حلوہ بے حد مزیدار لگا اچھا جی اللہ حافظ۔ تمام قارئین رائٹرز کو بے حد دعا اور سلام۔

ج: ڈیئر فریدہ! آپ کا مفصل تبصرہ یقیناً سب لکھاریوں کے دل میں خوشی بن کر جگمگا گیا ہوگا تعریف اور حوصلہ افزائی ایک آکسیجن کی مانند ہوتی ہے ہمارے رائیٹرز کے لیے۔ آپ کی خوبصورت غزل دوشیزہ نے قبول کی۔

دوشیزہ ستارے

دوشیزہ پڑھنے والا ہر قاری ہمارے لیے ایک ایسے ستارے کی مانند ہے جس کی روشنی میں دوشیزہ کا حسن مزید نکھر کر سامنے آتا ہے سوشکر گزاری کے اِس احساس کے ساتھ ہم خاص طور پر آپ لوگوں کے لیے ایک نیا سلسلہ ''دوشیزہ ستارے'' شروع کررہے ہیں جس میں ہر ماہ دو مختلف قارئین اپنی زندگی کا احاطہ کرتے ہوئے نظر آئیں گے۔ تو دوستو فوراً سے پیشتر اپنا قلم اٹھائیے اور پندرہ سے بیس سطروں میں اپنے بارے میں وہ سب کہہ ڈالیے جو آپ کے دل میں ہے تاکہ اگلے ماہ آپ ستارہ بن کر دوشیزہ میں جگمگاتے ہوئے نظر آئیں۔

✉: ذرفشاں فرحین پنجاب سوسائٹی لاہور سے ہم سے مخاطب ہیں۔ اسلام وعلیکم اللہ تعالیٰ بہت ساری رحمتوں میں آپ کو اور ادارے کو رکھے۔ آمین۔ بہت عرصے بعد قلم سنبھالا اور اپنی تحریر کے ساتھ حاضر ہوئی ہوں اس امید اور حوصلے کے ساتھ کہ ''دوشیزہ'' کی ادارت اپنے پرانے ساتھیوں کو کبھی فراموش نہیں کرتی۔ تحریر قابل اشاعت لگے تو پلیز ماہ مارچ کے شمارے کا حصہ بنا دیں کیوں کہ یہ عالمی یوم خواتین کے تناظر میں ہی ایک معمولی سی سعی ہے۔ اللہ آپ سب کا حامی وناصر ہو۔

ﷺ: اچھی ذرفشاں مارچ کا شمارہ تقریباً تیار اور تمہاری ''کانچ کی گڑیا'' ہمیں اب موصول ہوئی ہے لیکن فکر نہ کرو ہم اس پرچے سے فارغ ہوکر تمہارا افسانہ سب سے پہلے پڑھیں گے اور ہمیں یقین ہے کہ تمہاری یہ گڑیا بہت پیاری ہوگی۔

✉: خولہ عرفان کا یہ خط آیا ہے کراچی سے، لکھتی ہیں۔ السلام علیکم ڈھیروں دعاؤں اور نیک تمناؤں کے ساتھ آپ کی محفل میں پچھلی غیر حاضری پر معافی کے ساتھ اس ماہ حاضر ہوں، غیر حاضری کی وجہ پریشانی تھی کیوں کہ میری محسنہ جن سے آپ بہت اچھی طرح آگاہ ہیں علیل تھیں اور ان سے تعلق اتنا خوبصورت ہے کہ ان کے ماتھے کی شکن کے ساتھ جو کبھی نظر نہیں آئی اپنی سوچیں شکن آلود ہوجاتی ہیں اور ان کی مسکراہٹ ہی قلم کو طاقت دیتی ہے اب ان کی طرف سے مطمئن ہوں لیکن ان کو دعائے خیر میں یاد رکھیے گا اب اصل نکتے یعنی تبصرے کی طرف آتی ہوں آپ کا نہ صرف جنوری بلکہ فروری کا شمارہ بھی میرے ہاتھوں میں مہک رہا ہے جنوری کے شمارے کا جواب نہیں ماشاءاللہ! اس میں اپنا خط بھی پڑھا اور غزل بھی اور یقین کریں محبتوں اور خلوص کا اتنا حسین جواب پہلے کبھی موصول نہیں ہوا ماشاءاللہ دردانہ نوشین صاحبہ کا افسانہ ''ناتمام'' بہترین منظر نگاری کے ساتھ برف کی ٹھنڈک لے کر دل کو بھی گرما گیا۔ فرحت صدیقی صاحبہ کا ''ایک الٹا ایک سیدھا'' جینے کا حوالہ دیتا لگا کہ حوا کی بیٹی کے گھر کی بقا اس میں اپنی قوت برداشت اور صبر پر ہی منحصر ہے۔ بہت خوبصورت انداز تحریر تھا۔ کاوش صدیقی صاحب کا ناولٹ دوسرے کنارے پر...... پڑھ کر ایسا محسوس ہوا جیسے حسین رنگوں والی محبت کی تتلی لفظوں کی بارش میں بھیگ کر اپنے رنگوں سمیت اُن صفحات میں جذب ہوگئی ہے۔ بہت اعلیٰ! شمیم خالد صاحب کا

اندھیرے کے مسافر، بشریٰ سعید احمد کا اتالیق اعظم، معصومہ منصور صاحبہ کا امید کی پری، نگہت غفار صاحبہ کا دوراہا، سنبل صاحبہ کا ناول محبت اسم اعظم ہے محبت وحیات کے رموز کو اجاگر کرتا پروین حیدر کا افسانہ ''مٹی سے بہشت تک'' سب ایک سے بڑھ کر ایک تھے۔ انتظار حسین کا انتخاب خاص ''ماضی حال و مستقبل واقعی خاص تھا تاریخ اور مذہب حقیقت کے جھروکوں سے جھانکتے اور موجودہ دور سے مربوط ہو کر اپنے حال پر تفکر کی دعوت دیتے نظر آئے۔ سلسلہ وار ناولٹ میرے پرندہ دل اچھے انداز میں آگے کی منازل طے کر رہا ہے رفعت سراج کا نیا قسط وار ناول ''دام دل'' اور ''تیرے عشق نچایا'' مینا عالیہ صاحبہ کی اگلی قسط کے تجسس کے ساتھ اپنی تمام خوبیوں کے ساتھ محو سفر ہے ام مریم کا رحمن رحیم سدا سائیں قابل تعریف ہے دوشیزہ میگزین کے سارے سلسلے ہی اچھے تھے۔ دوشیزہ گلستاں میں لطیفوں اور حکایتوں کا معیار بہت عمدہ تھا۔ نئے لہجے نئی آوازیں میں سدرہ انور علی نے بہت خوبصورتی سے جدت پسندانہ رنگ میں اظہار محبت کیا ہے یہ ہوئی نا بات میں زین العابدین کے اچھوتے سوالوں پر دیے گئے جوابات بہت پسند آئے اور سب سے پہلی بات جو میں سب سے آخر میں کر رہی ہوں وہ ہے آپ کا حرف آخر لفظوں کے خوبصورت موتیوں سے آراستہ اس بار کو اپنی نگاہوں سے پہن کر اب سوچتی ہوں کہ اس خط کا آخر بھی کوئی نہیں زندگی بخیر لکھتے رہنا ہے آپ کی حوصلہ افزائی اور خلوص کی چھاؤں کے ساتھ ادبی سفر میں چار چاند لگ جائیں گے اللہ آپ کو کامیابیوں سے نوازتا رہے اور دوشیزہ کا یہ خوبصورت سفر آپ کی ادارت میں ترقی کے مدارج طے کرتا آگے بڑھتا رہے آمین۔ آپ کو دو تحریریں بھی ارسال کی ہوئی ہیں اگر قابل اشاعت ہیں تو کب تک ممکن ہیں باقی آپ جو بہتر سمجھیں آگاہ فرمادیں تو اطمینان ہو جائیگا۔

ج: خولہ ڈیئر! آپ کے تعریفی خط کا بہت بہت شکریہ ویسے دوشیزہ پر مثبت تنقید کا بھی آپ لوگوں کو پورا حق حاصل ہے ہم قطعی برا نہیں منائیں گے آپ کی تحریریں ہمارے پاس ہیں ابھی نہیں پڑھی لیکن وعدہ آپ کو زیادہ انتظار نہیں کروائیں گے۔

✉ : یہ خط ہے مومنہ بتول کا کراچی سے، لکھتی ہیں۔ میری کچھ طبیعت خراب رہی کچھ والدہ محترمہ کی طبیعت ناساز رہی۔ اسپتالوں کے چکر میں دن گزرے لہٰذا چاہنے کے باوجود حاضر نہ ہوسکی۔ اب میں تسلسل سے دوشیزہ کا مطالعہ کر رہی ہوں آپ کے زیر ادارت ماشاء اللہ بہت خوبصورت پرچہ مل رہا ہے افسانوں میں ایک الٹا ایک سیدھا، اتالیق اعظم، مٹی سے بہشت تک، بہترین رہے۔ رفعت سراج صاحبہ کا ناولٹ، ''دام دل بہت خاص اور اہم موضوع پر ہے ابھی سے اچھی اڑان بھر رہا ہے اللہ کرے زور قلم اور زیادہ ایک مشورہ لینا ہے رفعت سراج صاحبہ کا ہی افسانہ ''تجسیم سے تقسیم تک پڑھ کر...... کافی دنوں بعد میں نے بھی افسانہ بعنوان ''تجسیم سے تکریم لکھا ہے اگر اجازت ہو تو بھجوا دوں آپ شائع ضرور کرنا اور جواب بھی ضرور دینا میں منتظر ہوں۔ بہت محبتوں کے ساتھ سلام آخر۔

ج: پیاری مومنہ! سنبل ہماری بہت اچھی رائیٹر ہیں کبھی کبھی ایسا ہو جاتا ہے۔ اگر آپ کو ان کی تحریر سے یہ شکایت ہوتی ہے تو یقیناً وہ آئندہ اس بات کا خیال رکھیں گی بولڈ ٹاپک میں الفاظ کے چناؤ کا بہت بڑا دخل ہوتا ہے۔ آئندہ آپ کو شکایات کا موقعہ نہیں ملے گا اور ہاں اپنا افسانہ ضرور بھجوائیں ہم منتظر ہیں۔

✉ : ہماری نگہت غفار کراچی سے لکھتی ہیں۔ السلام وعلیکم رضوانہ جی! اس ماہ کا دوشیزہ منگوایا ہے یہ دیکھ کر

بہت خوشی ہوئی ہے کہ میرا افسانہ شائع ہوا تھا ڈھیروں ڈھیر شکر ہے۔ان گنت دعائیں۔ ہمیشہ کی طرح سب سے پہلے معالعہ سفر آغاز کرتی ہوں ہر سطر ہر لفظ پڑھ کر دل رسول پاک ﷺ کی محبت میں ڈوب رہا ہے واہ کیا شان رسول ﷺ مصطفے ہم بدنصیب ہیں جو اسلام سے سنت سے غفلت برت رہے ہیں اپنے صبح و شام اپنی ضروریات پوری کرنے اور ہوس دنیا میں لگے ہیں اپنے فرض سے یہ غفلت ہمیں تباہی کے راستے تک پہنچا چکی ہے مگر اب بھی ہم ہوش میں نہیں آ رہے ہیں۔ حرف آخر: بے شک اس سوال کا جواب ہر کوئی ڈھونڈ رہا ہے دیکھیں کیا اس کی کامیابی اس کے نصیب میں ہے کہ نہیں۔ رضوانہ کوثر کی کزن کے بیٹے پر بڑا دکھ ہوا رب کریم والدین اور عزیز اقارب کو صبر عطا فرمائے اور مرحوم کو جنت الفردوس میں جگہ دے۔ دردانہ نوشین کے خط سے پتا چلتا ہے کہ ان کے شوہر کی طبیعت ناساز تھی جس کے سبب وہ ہاسپٹلائز رہے سن کر دل کی گہرائیوں سے دعا نکلتی ہے کہ رب کائنات انہیں مکمل صحت لمبی عمر اور شفاء کاملہ عطا فرمائے۔ کاشی بیٹا آپ کی خالہ کے انتقال پر صدمہ ہوا اللہ تعالیٰ مرحومہ کے لواحقین کو صبر کی توفیق اور مرحومہ کو اعلیٰ درجات سے نوازے۔ طلعت اخلاق کی والدہ اور بینا عالیہ کی والدہ کے انتقال کا سن کر بہت افسوس ہوا جو مرضی معبود اللہ آپ سب کو صبر و تحمل عطا فرمائے اور مرحومین کو اپنے دربار میں بلند درجات نوازے (آمین) مسز تو ید ہاشمی کا خط پڑھا ہر لفظ سچا لگا، راہ سے بھٹکے ہوئے شقی القلب ظالم قاتل سفاک اپنے انجام سے بے خبر کیسی خطرناک منزل کی طرف رواں ہیں۔ اللہ کے قہر اور اپنی موت کو بھولے ہوئے ہیں۔ افسانوں میں سنبل کا افسانہ ''محبت اسم اعظم ہے''، معصومہ منصور ''امید کی پری''، اچھے لگے سلسلہ وار کہانیوں کی اگلی قسط کا انتظار رہے گا نئے لہجے نئی آوازیں میں سباس گل، فریدہ فری، شعبان کھوسو، کے کلام اچھے لگے۔ دوشیزہ گلستان میں فرمان الٰہی، حدیث نبوی ﷺ، حمد، رضوانہ کوثر کی یہ تحریریں اچھی تھیں۔ آخر میں انتہائی عاجزی وانکساری سے ساتھ دعا گو ہوں کہ پروردگار پیاری سی منزہ، اچھے بیٹے کاشی اور میری پیاری سی اپنی سی رضوانہ پرنس جی کو اپنی رحمتوں کے حصار میں رکھے دینو دنیا کی ہر خوشی اور کامیابی نصیب کرے ساتھ ہی تمام بہن بھائیوں اور بچوں کو بھی یہ دعائیں دے رہی۔ زندگی باقی رہی تو اگلے ماہ انشاء اللہ پھر ملاقات ہوگی۔

ج: نگہت جی آپ کے خلوص و محبت سے مہکتے ہوئے خط نے ہماری محفل کو معطر کر دیا خوش رہیے۔

✉ : روحیلہ خان اپنے خط میں لکھتی ہیں، جناب ایڈیٹر صاحب السلام علیکم۔ امید ہے آپ خیریت ہوں گے میں بھی بفضل خدا خیریت سے ہوں ایک طویل عرصے بعد قلم افسانے کے لیے سنبھالا ہے ایک کاوش ہے امید ہے آپ کو پسند آئے گی اس سے پہلے بھی ایک ناول بھیج چکی ہوں جس کا کوئی اتہ پتا نہیں آپ کے میسج سے کام آسان ہو جائے گا ورنہ کوریئر سروس **complane** کرنی ہوگی۔ شکریہ۔

ج: روحیلہ آپ کا افسانہ مل گیا ہے۔ ابھی پڑھا نہیں یقیناً اچھا ہی ہوگا اور اس صورت میں آپ کو زیادہ انتظار بھی نہیں کرنا پڑے گا۔ اور ہاں اگلی بار خط تبصرے کے ساتھ آنا چاہیے۔

✉ : ثمینہ عرفان کراچی سے لکھتی ہیں۔ السلام وعلیکم۔ سرورق بہت اچھا تھا۔ ''رضوانہ کوثر، طلعت، اخلاق احمد اور بینا عالیہ کے مرحومین کے لیے دعائے مغفرت۔ دنیا میں آنے والوں کو ان کی سال گرہ مبارک، شادی کے بندھن میں بندھنے والوں کو بہت مبارک باد۔ تمام ہی ''کالم'' اور افسانے، بہترین تھے، جس طرح

دُنیا میں کس جگہ
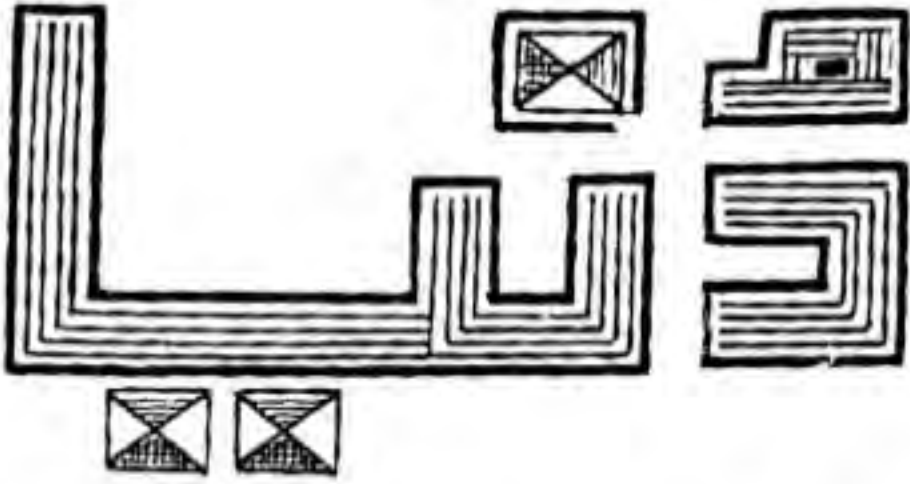
سچی کہانیاں کے چرچے نہیں

اِس لیے کہ "سچی کہانیاں" کے مصنفین پیشہ ور لکھنے والے نہیں بلکہ وہ لوگ ہیں جو زندگی کی حقیقتوں اور سچائیوں کو برتتے، دیکھتے، محسوس کرتے اور ہمیں لکھ بھیجتے ہیں۔ "سچی کہانیاں" کے قارئین وہ ہیں جو سچائیوں کے متلاشی اور انھیں قبول کرنے والے ہیں

یہی وجہ ہے کہ "سچی کہانیاں" پاکستان کا سب سے زیادہ پسند کیا جانے والا اپنی نوعیت کا واحد ڈائجسٹ ہے "سچی کہانیاں" میں آپ بیتیاں، جگ بیتیاں، اعترافات، جرم و سزا کی کہانیاں، ناقابلِ یقین کہانیاں، دلچسپ و سنسنی خیز سلسلوں کے علاوہ مسئلہ یہ ہے اور قارئین و مدیر کے درمیان دلچسپ نوک جھونک احوال۔ سب کچھ جو زندگی میں ہے وہ "سچی کہانیاں" میں ہے۔

پاکستان کا سب سے زیادہ پسند کیا جانے والا — اپنی نوعیت کا واحد جریدہ

ماہنامہ سچی کہانیاں۔ پرل پبلی کیشنز: 88-C II فرسٹ فلور۔ خیابانِ جامی کمرشل۔ ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی۔ فیز-7، کراچی

فون نمبرز: 021-35893121-35893122

ای میل: pearlpublications@hotmail.com

ہندوستانی فلموں میں ''خالصتاً'' اردو کے ساتھ کچھ الفاظ ہندی کے شامل کر کے وہ اسے ہندی زبان کی فلم کا نام دیتے ہیں۔ آپ تمام لکھنے والوں سے مؤدبانہ التماس ہے کہ آپ لوگ اپنی تحریر میں بلا وجہ 'ہندی' کے الفاظ استعمال نہ کریں تو زیادہ اچھا ہے۔ اتنا مختصر ٹھیک، لیکن یہ میرا حرف آخر نہیں ہے۔ 'حرف آخر' بھی بہت اچھا لگا مقصدیت کے لحاظ سے بھی اور لفظ یا نام ''عرفان'' کی وجہ سے بھی۔ یقین کرو آج بھی کہیں ''عرفان'' لکھا ہوا دیکھتی اور پڑھتی ہوں تو بس میرے تصور میں اپنے خوبصورت سے، ہینڈسم سے پاپا اپنی دلکش مسکراہٹ اور اپنی دھیمی دھیمی سی خوشبو کے ساتھ ذہن میں در آتے ہیں۔ دوشیزہ 12 تاریخ سے پہلے نہیں ملتا ہے اور میں مارچ کے مہینے میں بے انتہا مصروف ہوں اور پاکستان میں نہ ہونے کی وجہ سے مارچ میں خط نہیں لکھ پاؤں گی۔ دیور کے بیٹے کی شادی ہے شارجہ اور پھر ولیمہ لاہور، لاہور سے اسلام آباد اپنے صاحبزادے رمیز کی بات طے کرنے کے لیے۔ انشاء اللہ زندگی رہی تو اپریل میں میرا خط آپ کے ہاتھ میں ہوگا، مختصر اور جامع تبصرے کے ساتھ دوشیزہ کے تمام اسٹاف کے لیے سرکردہ لوگوں کے لیے اور تمہارے لیے ڈھیر ساری دعائیں، دعا کرنا سفر خیریت سے گزرے۔ (آمین)

ج: اچھی ثمینہ! مارچ میں تو آپ کی بہت خوبصورت مصروفیات ہیں ایسے ہی خوشیوں میں مہکتی رہیں۔ اور رہی آپ کی شکایت کی بات تو آئندہ ہم اس کا خاص خیال رکھیں گے۔ اب تو خوش ہیں نا۔

✉: کراچی سے عقیلہ حق کا پیارا سا خط موصول ہوا، لکھتی ہیں دوشیزہ میرے ہاتھ میں ہے اور دل چاہ رہا ہے کہ اتنا بھرپور اور مکمل رسالہ نکالنے پر تم کو ایک ایوارڈ دے دوں۔ اللہ تم کو خوش رکھے۔ (آمین) میری بہن رضوانہ کوثر میں آپ کے غم میں برابر کی شریک ہوں۔ سب سے پہلے یہ بتا دوں، چند دن پہلے چند ضرورت مند نوجوانوں نے میرا پرس چھین لیا اور میرے میاں کی بھی جیبیں جھڑوا لیں لیکن اس کے بعد بھی ان کا مسئلہ حل نہیں ہوا تو میرے غریب ڈرائیور کو بھی لوٹ لیا۔ سو میرا فون چلا گیا اور سب کے نمبر بھی چلے گئے۔ اب دوبارہ سم کھلوائی ہے تو پلیز ایک ایک میسج کے ساتھ اپنا نمبر عنایت کر دیں۔ مہربانی ہوگی۔ دردانہ نوشین خان کا خط پڑھا، اللہ ان کے شوہر کو صحت کاملہ عطا کرے اور اُن کو اُن کے سر پر سلامت رکھے۔ (آمین) طلعت اخلاق احمد اور بینا عالیہ کو اللہ صبر جمیل عطا فرمائے۔ لیکن ماں باپ ایسی نعمت ہوتے ہیں کہ صبر بہت مشکل سے آتا ہے۔ اُن کی یادیں سونے نہیں دیتیں۔ اب آتے ہیں رسالے کی طرف...... ن سے سوال اچھا سلسلہ ہے۔ م ش خ...... آپ کا تبصرہ کچھ کچھ جھکاؤ رکھتا ہے۔ رفعت سراج صاحبہ کا ناول شروع ہوا ہے۔ رفعت کی تعریف تو سورج کو چراغ دکھانے کے برابر ہے۔ اللہ رفعت صاحبہ کو مزید کامیابیاں عطا فرمائے۔ (آمین) دُردانہ نوشین کا افسانہ فلسفیانہ انداز میں بھی بھلا لگا۔ فرحت صدیقی صاحبہ نے ہمیشہ کی طرح اچھا لکھا اور بینا عالیہ بھی بہت خوبصورت لکھ رہی ہیں۔ سنبل نے محبت اسم اعظم لکھا، بہت خوب لکھا۔ سنبل کی تحریریں مجھے سنبل کی طرح بہت پسند ہیں۔ معصومہ منصور کی تحریر اچھی رہی، واقعی امید کی چھڑی ہاتھ میں پکڑ ا رکھنا چاہیے۔ نگہت غفار صاحبہ بہت پُرشفیق اور بھلی خاتون ہیں اور یہ بات اُن کی تحریروں میں بھی جھلکتی ہے۔ میں اِس ماہ بہت مصروف اور تھوڑی اَپ سیٹ بھی رہی لہٰذا پورا رسالہ نہیں پڑھ سکی۔ جو پڑھا اُس پر تبصرہ حاضر ہے۔ اگلے ماہ اگر رسالہ مجھے 25 سے پہلے مل گیا تو انشاء اللہ ضرور بھرپور اور مکمل تبصرہ بھیجوں گی۔ آپ سب کو اطلاع دینی ہے کہ الحمدللہ میں **Lions Broad**

ہم آپ کے منتظر ہیں

بہت عزیز قارئین!

ہمارا آپ کا ساتھ برسہا برس سے ہے

وقت بدلا، حکومتیں بدلیں، موسم بھی وہ نہ رہے

لیکن

جو چیز پاس رہ گئی

وہ ہے آپ کا اور ہمارا ساتھ

ہماری دُعا ہے کہ

محبتوں اور رابطوں کے یہ بندھن ہمیشہ قائم رہیں

ساتھیو!

ہمارے اور آپ کے رابطے کی منزل تبدیل ہوگئی ہے

ہمارا نیا پتا نوٹ فرمالیں:

پتا: C-88 II۔ فرسٹ فلور۔ خیابانِ جامی کمرشل۔ ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی۔ فیز-7، کراچی

فون نمبر: 021-35893121-35893122

اُمید ہے آئندہ آپ کی نگارشات اور محبت سے بھیجے گئے خطوط ہمیں اِسی پتے پر موصول ہوں گے

Casterd کلب کی چارٹرڈ پریذیڈنٹ تو ہوں ہی اس کے علاوہ کالم کونسلٹ آف پاکستان اور شریف اکیڈی جرمنی کی ممبرشپ کے اعزاز سے بھی نوازی گئی ہوں۔ کالم کونسلٹ آف پاکستان نے مجھے ایک اعزازی سند بھی دی ہے۔ جو میرے لیے اعزاز ہے۔ (ماشاء اللہ عقیلہ بہت بہت مبارک ہو۔ پراوڈ آف یو دوست) میں کہہ سکتی ہوں آج تبصرہ نہیں ہے لیکن خط ہے۔ اللہ حافظ۔

ھ: پیاری عقیلہ۔ آپ نے 'ضرورت مند نوجوان' لکھ کر بے ساختہ ہمیں مسکرانے پر مجبور کر دیا حالانکہ واقعہ بہت سنگین ہے۔ ہم سوچتے ہیں کہ اگر لندن یا امریکہ کی پولیس یہاں کے بے بس عوام کی حفاظت کو آجائے تو شاید کچھ امن وامان کا مسئلہ حل ہو ورنہ یہاں تو کوئی دادرسی کرنے والا نہیں۔

☒: ڈسکہ، سیالکوٹ سے یہ آمد ہے عائشہ نزاکت کی، لکھتی ہیں۔ فروری کا سال گرہ نمبر بہت لیٹ ملا لیکن چلیے ملا تو سہی۔ اِس ماہ کی سب سے اہم خوشخبری جو حقیقت کے روپ میں سامنے آگئی وہ رفعت سراج کا ناول دامِ دل۔ رفعت سراج میری فیورٹ رائٹر ہیں، دامِ دل بھی اُن کے دیگر ناولز کی طرح یادگار ثابت ہوگا۔ سنبل کا مکمل ناول بہت آیا۔ اُمِ مریم بھی رحمٰن، رحیم، سدا سائیں میں کمال کر رہی ہیں۔ واہ مریم کیا زادِ راہ تحریر لکھی ہے بہت کچھ سیکھنے کو مل رہا ہے۔ کاوش صدیقی کا ناولٹ دوسرے کنارے پر ایک شاہکار پینٹنگ کی طرح ثابت ہوا۔ جسے پڑھ کر تازگی کا احساس ہوتا ہے۔ نعمان اسحٰق پرندۂ دل میں بور کر رہے ہیں۔ افسانوں میں دُردانہ نوشین خان کا ناتمام، فرحت صدیقی کا ایک الٹا، ایک سیدھا، شمیم فضل خالق کا اندھیرے کے مسافر، پروین حیدر کا مکلی سے بہشت تک، بشریٰ سعید احمد کا اتالیق اعظم بہت کمال کے افسانے ثابت ہوئے۔ کاشی بھائی کا اداریہ حرف آخر کمال تھا۔ محفلِ دوشیزہ میں رضوانہ پرنس صاحبہ کو تہہ دل سے خوش آمدید۔ س سے سوال میں نین منیار سے باتیں پسند آئیں۔ حیرت بھی ہوئی کہ شوبز کے لوگ اتنے سادگی پسند بھی ہوتے ہیں۔ دلشاد نسیم کی دل کی باتیں رلا رلا گئیں۔ منی اسکرین میں آپ نے صرف اے آر وائی ڈیجیٹل ہی کے پروگرام پھر سے کیوں شروع کردیے ہیں۔ حالانکہ تمام چینلز پر چلنے والے مقبول ترین ڈراموں پر تبصرہ یا تنقید اُسی طرح ہونی چاہیے جس طرح ہوتی رہی ہے۔ انتخاب خاص میں ماضی، حال اور مستقبل خوب رہا۔ ویلڈن۔ دوشیزہ میگزین میں لولی وڈ، بولی وڈ، دوشیزہ گلستاں، نئے لہجے نئی آوازیں، حکیم جی، بیوٹی گائیڈ اور یہ ہوئی نا بات میرے فیورٹ سلسلے ہیں۔ میرا خط ضرور کیجیے گا۔

ھ: پیاری عائشہ! اتنا خوبصورت خط لکھنے پر آپ کو نظر انداز کس طرح کیا جاسکتا ہے۔ خوش رہو۔

☒: ندیا مسعود نے کراچی سے ہمیں یاد کیا ہے، لکھتی ہیں۔ رضوانہ پرنس کا نام دوشیزہ میں دوبارہ دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔ سوچا اِس محفل میں شریک ہو کر اپنی خوشی کا اظہار کردوں۔ انشاء اللہ آئندہ مفصل تبصرے کے ساتھ آتی رہوں گی۔

ھ: پیاری ندیا۔ ہمیں تو بھئی تمہارا نام ہی بہت پیارا لگا ہے۔ بے اختیار ایک دوگانے لبوں پر آگئے۔ بس اِسی محبت سے آتی رہنا۔

☒: محفل اپنے اختتام کو پہنچنے ہی والی ہی تھی کہ ہمیں بہت محبت کرنے والی لاہور سے رضوانہ کوثر کا سندیسہ ٹی سی ایس سے موصول ہوا۔ دل تو چاہا کہ اس خط کو اگلے ماہ سب سے اول نمبر پر لگائیں گے لیکن کیا کریں یہ محبتیں بھی نا۔ رضوانہ لکھتی ہیں، فروری کا دوشیزہ خوبصورت ترین ٹائٹل کے ساتھ موصول ہوا جب اشتہارات کو

پھلانگتے ہوئے کریڈٹ پیج پر پہنچے تو پہلے تو حیرت ہوئی اور اُس کے بعد خوشی اتنی ہوئی کہ بیان سے باہر ہے۔ اب آپ لوگ یہ کہہ رہے ہوں گے کہ مانا رضوانہ کی طبیعت خراب ہے مگر یہ کیسی باتیں کررہی ہیں۔ ارے بھئی یہ خوشی اپنی ہم نام رضوانہ پرنس کی آمد کی تھی۔ رضوانہ کا نام پڑھتے ہی ہمیں آئیڈیل جیسے سدا بہار پرچے کی یاد آ گئی۔ اب رضوانہ یقیناً دوشیزہ کو مزید بہتری کی جانب لے جائیں گی۔ ویسے تو کاشی بھی دوشیزہ کو چار چاند لگا ہی رہا تھا مگر وہ کہتے ہیں نا کہ سینئر کی رہنمائی میں ترقی مزید چومتی ہے۔ باقی سال گرہ نمبر 2 میں دلشاد نسیم کی والدہ کے بارے میں پڑھ اور جان کر دل غم کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوب گیا۔ خدا سے صرف صبر کی دعا ہے۔ باقی بندہ کیا کرسکتا ہے۔ حرفِ آخر میں کاشی کے پوچھے گئے سوال کا جواب واقعی ہر کوئی ڈھونڈ رہا ہے۔ رفعت سراج کا تو نام ہی کافی ہے۔ دامِ دل کی پہلی ہی قسط میں اپنا اسیر کرلیا۔ بینا عالیہ کا تیرے عشق نچایا بھی تیزی سے اپنا منازل طے کررہا ہے۔ اُم مریم رحمٰن رحیم سدا سائیں کی گیارہویں کڑی میں بھی بے مثال رہیں۔ نعمان اسحٰق کا پرندۂ دل جانے کس شجر پر بیٹھے گا۔ اس شمارے کی سوغات ہمارے سینئر لکھاری کاوش صدیقی کا ناولٹ دوسرے کنارے پر رہا۔ واہ عرصہ دراز بعد کاوش بھائی کی انٹری ہوئی اور کیا کمال انٹری ہوئی۔ سنبل کا محبت اسم بھی خوبصورت تھا۔ افسانوں میں اس بار پروین حیدر، بشریٰ سعید احمد اور شمیم فضل خالق نے یادگار تحریریں دیں۔ جبکہ دردانہ نوشین خان، فرحت صدیقی اور معصومہ منصور بھی بہترین رہیں۔ انتخابِ خاص میں انتظار حسین کی تحریر واقعی خاص لگی۔ رنگِ کائنات میں صبیح محسن کا خالی مکان بہت پسند آیا۔ اور مالک مکان کی پریشانی اور کرائے داروں کی کج ادائیاں محظوظ کرگئیں۔ اور دیگر مستقل سلسلوں میں دوشیزہ گلستان کی کیا بات ہے۔ میری حمد لگانے کا بہت شکریہ، خدا آپ سب کو سلامت رکھے۔ سلمیٰ سیّد کا مراسلہ جیسی کرنی ویسی بھرنی، احسن عمرانی کی محبت اور غوثیہ نسیم کا جیب کترا اچھا لگا۔ نئے لہجے نئی آوازوں میں سباس گل، ججیل میتلو، ثمینہ عرفان، یاسمین اقبال، فصیحہ آصف خان، فریدہ جاوید فری اور شعبان کھوسہ کی شاعری اچھی تھی۔ یہ ہوئی نا بات میں زین العابدین بڑے منجھے ہوئے جواب دیتے ہیں۔ خوش رہو بیٹا، خدا تمہاری عمر دراز کرے۔ لولی وڈ، بولی وڈ میں ڈی خان بہت محنت سے خبریں سلیکٹ کرتے ہیں۔ نفسیاتی الجھنیں اور اُن کا حل، مختار بانو طاہرہ اپنے فہم سے بہترین مشوروں سے نوازتی ہیں۔ کچن کارنر میں اسپائسی مٹن پلاؤ، ہاٹ چاکلیٹ کریم کوفی، سندھی مسالا گوشت اور چکن پکوڑے بہت لذیذ تھے۔ حکیم جی محمد رضوان رضوان حکیم کا ایک بہت خاص سلسلہ ہے۔ بیوٹی گائیڈ میں ڈاکٹر خرم مشیر ہر ماہ بیوٹی سے متعلقہ مسائل کا بخوبی حل پیش کرتے ہیں۔ خط کا اختتام رضوانہ پرنس کو ایک بار پھر خوش آمدید کہتے ہوئے کروں گی۔ رضوانہ تمہاری مسکراتی ہوئی تصویر ہر دم میری آنکھوں میں رہتی ہے۔ میری طرف سے منزہ اور زین العابدین کو بھی بہت بہت سلام کہہ دیجیے گا۔

ج: پیاری رضوانہ۔ آپ نے جس اپنایت سے اپنی خوشی کا اظہار کیا ہے تو وہ ہمیں بہت اچھا لگا۔ ویسے بھی ہم ہمیشہ آپ کی محبت اور خلوص کے معترف رہے ہیں۔ ویسے آپس کی بات ہے آپ کے خط کے بنا یہ محفل بہت ادھوری ادھوری سی لگ رہی تھی۔ آئندہ جلدی آیئے گا۔

تو پیارے دوستو! آپ لوگوں سے ہماری یہ پہلی ملاقات بہت خوشگوار رہی۔ اگلے ماہ اِس محفل میں ہم آپ کی آمد کا انتظار کریں گے۔

دعاؤں کی طالب

رضوانہ پرنس

سن کے سوال

باکمال اداکارہ اور ماڈل

صنم سعید

ذیشان فراز

☆وہ نام جو شناخت کا باعث ہے؟
♥:صنم سعید۔
☆گھر والے کیا کہہ کر پکارتے ہیں؟
♥:صنم ہی کہتے ہیں۔
☆وہ مقام جہاں سے آشنا ہو کر آنکھ کھولی؟
♥:لندن۔
☆زندگی کس برج (star) کے زیر اثر ہے؟
♥:Aquarius برج دلو۔
☆علم کی کتنی دولت کمائی؟
♥:اے لیول برٹش اسکول سے اور گریجویشن کیا ہے۔
☆کتنے بھائی بہن ہیں۔آپ کا نمبر؟
♥:ہم تین بہن بھائی ہیں۔میرا نمبر پہلا ہے۔
☆اداکاری کے لیے اپنی طبیعت اور مزاج کے برعکس موڈ بنانا ضروری ہوتا ہے؟
♥:بالکل یہ ایک لازمی چیز ہے۔اور اداکار وہی ہوتا ہے جو کسی بھی وقت کسی بھی حالت میں اپنا کام ایمانداری سے انجام دے۔
☆:اس زندگی میں کون سا کام سب سے مشکل ہے؟
♥:زندگی تو ایک امتحان ہے۔امتحان کبھی آسان ہوا ہے۔
☆:کوئی ایسی خواہش جو اب تک پوری نہ ہوئی ہو؟
♥:اللہ کا شکر ہے ہر خواہش منہ سے نکلنے سے پہلے پوری ہو جاتی ہے۔
☆:اپنی کون سی عادت بہت پسند ہے؟
♥:نماز پڑھنا۔
☆:اپنی کون سی عادت سخت ناپسند ہے؟
♥:میں کبھی بھی فون کالز پر دھیان نہیں دیتی۔یہ میری سب سے بری عادت ہے۔لوگ کالز کرتے ہیں، رابطے کرنے کی کوشش کرتے ہیں بس فون اِدھر اُدھر رکھ کر بے فکر ہو جاتی ہوں۔
☆:کبھی مصروفیات میں سے وقت نکال کر روڈ پر سے بھی کچھ کھایا ہے؟
♥:دہی بھلے، گول گپے کھانے کا مزہ ہی الگ ہے اور یہ سب کچھ اُس وقت ہوتا ہے جب شوٹ پر ہوتے ہیں۔

☆: اردو والے ''سفر'' کا ذریعہ کیا ہے؟
♥: اپنی گاڑی۔
☆ صبح کا آغاز کس طرح کرتی ہیں؟
♥: نماز پڑھ کر۔
☆ دن کا کون سا پہر اچھا لگتا ہے؟
♥: صبح صادق کا وقت۔
☆: کون سے ایسے معاشرتی رویے ہیں جو آپ کے لیے دکھ اور پریشانی کا باعث بنتے ہیں؟
♥: بدتمیزی اور جھوٹ مجھے سخت ناپسند ہیں اور یہی دل آزاری کا باعث بنتا ہے۔
☆: دولت، عزت، شہرت، محبت اور صحت اپنی ترجیح کے اعتبار سے ترتیب دیجیے۔
♥: عزت، صحت، محبت، دولت، شہرت۔
☆: سمندر کو دیکھ کر کیا خیال آتا ہے؟
♥: خدا کی قدرت پر قربان ہونے کو دل چاہتا ہے۔
☆: خودستائشی کی کس حد تک قائل ہیں؟
♥: ایک حد تک۔
☆: کبھی غصے میں کھانا پینا چھوڑا؟
♥: پریشانی میں تو چھوڑا ہوگا، مگر غصے میں کبھی نہیں۔

☆: آپ کی نظر میں خدا کی حسین تخلیق کیا ہے؟
♥: سورج کی روشنی۔
☆: موت خوف کا باعث ہے؟ اور اس کے علاوہ ڈرنے کی کوئی وجہ؟
♥: موت سے کبھی ڈر نہیں لگا۔
☆: فراز کے اس خیال پر کس حد تک یقین رکھتی ہیں کہ دوست ہوتا نہیں ہر ہاتھ ملانے والا؟
♥: 100 فیصد۔
☆: کھانا گھر کا پسند ہے یا باہر کا فاسٹ فوڈ؟
♥: میں بہت اچھی کک ہوں۔ لیکن ابو کے ہاتھ کا کھانا مجھے پسند ہے۔ وہ بہت اچھا پکا لیتے ہیں۔
☆ زندگی کے معاملات میں آپ تقدیر کی قائل ہیں یا تدبیر کی؟
♥: دونوں کی۔
☆: ویک اینڈ کیسے گزارتی ہیں؟

♥: سمندر پر۔
☆ آپ کا پسندیدہ لباس؟
♥: مجھے ویسٹرن لباس بہت پسند ہیں۔ لیکن میں اپنی امی کی ساڑیاں بھی بہت شوق سے باندھتی ہوں۔
☆ شاپنگ کرنا کیسا لگتا ہے؟
♥: شاپنگ سے نفرت ہے مجھے۔ شاپنگ کا بالکل شوق نہیں۔
☆ جوائنٹ اکاؤنٹ ہونا چاہیے یا نہیں؟
♥: دونوں ہونا چاہئیں۔
☆ آپ کی نظر میں بہترین تحفہ کیا ہے؟
♥: کتا یا بلی یا کسی بھی جانور کا بچہ۔
☆ محبت کا اظہار کس طرح کرتی ہیں؟
♥: خط لکھ کر۔
☆ آپ کی صبح کب ہوتی ہے؟
♥: میری صبح کام کے حساب سے ہوتی ہے۔ کام ہو تو جلدی اٹھ جاتی ہوں ورنہ تھوڑی دیر سے۔
☆ بوریت دور کرنے کے لیے کیا کرتی ہیں؟
♥: میوزک سنتی ہوں۔
☆ شہرت، رحمت ہے یا زحمت؟
♥: شہرت حاصل کرنا آسان چیز نہیں ہے۔ مگر یہ کبھی کبھی مسئلہ بھی بن جاتی ہے۔
☆: کیا آپ اچھی رازداں ہیں؟
♥: بالکل۔
☆: اگر آپ اداکارہ نہ ہوتیں تو کیا ہوتیں؟
♥: میں پھر بھی اداکارہ ہی ہوتی۔
☆: آئینہ دیکھ کر کیا خیال آتا ہے؟
♥: آئینہ دیکھ کر کچھ خیال نہیں آتا۔
☆: ''ہے زندگی کا مقصد اوروں کے کام آنا'' کس حد تک عمل کرتی ہیں؟
♥: جس حد تک کوشش ہوتی ہے، کرتی ہوں۔ سچ پوچھیے تو مجھے یہ بھیک لوگ والے لوگ 100 فیصد فراڈ لگتے ہیں۔ یہ تو ہماری کام والی ماسی سے بھی زیادہ کماتے ہیں ایک دن میں۔
☆: کس ملک کی شہریت لینا چاہتی ہیں؟
♥: پیدا ہوتے ہی میرے پاس برطانیہ کی شہریت آ گئی تھی۔
☆: زندگی کب بری محسوس ہوتی ہے؟
♥: جب پلان کے مطابق کوئی کام نہیں ہو رہا ہوتا ہے تو زندگی بہت بری لگنے لگتی ہے۔
☆: مطالعہ عادت ہے یا وقت گزاری؟
♥: عادت۔
☆: انٹرنیٹ اور فیس بک سے دلچسپی کس حد تک ہے؟
♥: انٹرنیٹ کے بغیر تو گزارا ہی نہیں ہے جبکہ فیس بک کے بغیر گزارا ہو جاتا ہے۔
☆: کون سا چینل شوق سے دیکھتی ہیں؟
♥: **HUM ،H.BO** ٹی وی اور جس پر ریموٹ رک جائے۔
☆: کس تاریخی شخصیت سے ملنے کی خواہش مند ہیں۔
♥: پرانے زمانے کے ہولی وڈ کے اسٹارز سے ملنے کی خواہش ہے۔
☆: کن چیزوں کے بغیر سفر ممکن نہیں؟
♥: فون، بٹوا، سینی ٹائزر اور بیگ۔
☆: اپنی شخصیت میں کیا چیز بدلنا چاہتی ہیں؟
♥: میں مزید ایماندار ہو کر اپنی شخصیت کو بہتر کرنا چاہتی ہوں۔
☆: حرف آخر کیا چاہنا چاہیں گی؟
♥: انسان کو اگر عزت چاہیے تو اُسے فوری طور پر اپنی غلطیوں کا اعتراف کر لینا چاہیے۔ اپنی غلطیوں کا اعتراف کرنے والا عظیم ہوتا ہے۔ ☆☆

”دلوں میں محمد علی کا چراغ جلتا رہے گا“

پاکستان فلم انڈسٹری کے لیجنڈ محمد علی کی برسی کے موقع پر ایک خصوصی تحریر

م ش خ

علی بھیا پیارے بھیا، بھورے میاں، اچھے میاں سب کو اداس کر کے 19، مارچ 2006ء کو صبح گیارہ بجے 74 سال 11 ماہ کی عمر میں بروز اتوار کو اپنے رب کی طرف لوٹ گئے۔ ”دو ہنسو کا جوڑا بچھڑ گیا۔“ ایک سنہری باب ختم ہوگیا۔ 9 سال قبل جب اُن کا انتقال ہوا تھا تو اے آر وائی چینل نے اپنی معمول کی نشریات روک کر اُن کی فلم آگ دکھائی تھی۔

سمجھ میں نہیں آتا اداکار محمد علی مرحوم کا تذکرہ کس طرح اپنے ناتواں قلم سے کروں وہ تو شائقین اور ناظرین کے دل کے نہاں خانوں میں بسے ہوئے ہیں ان کے لیے تحریر کیا ہوا ہر لفظ قطار در قطار ان کی فنی خدمات کے سامنے باادب کھڑا نظر آتا ہے۔ محمد علی مرحوم کی سحر انگیز شخصیت تو سراپا محبت تھی علی بین الاقوامی شہرت کے حامل تھے جب ہی تو فن کے ایوانوں کے بادشاہ کہلائے انہیں جو اللہ نے عزت و تکریم دی وہ بہت کم خوش نصیبوں کو ملتی ہے ان کا تعلق متوسط گھرانے سے تھا ان کی غریبوں سے محبت اور فنی خدمات نے تاریخ کے اوراق پر اپنا نام امر کروالیا اللہ نے انہیں پرکشش شخصیت، مردانہ وجاہت اور خوبصورت آواز سے نوازا

تھا۔ سابق صدر پاکستان ضیاء الحق مرحوم نے 1980ء میں انہیں پرائیڈ آف پرفارمنس بھی دیا تھا۔ علی 35 سال تک بڑی اسکرین کے شہزادے کہلائے فلم ”جانے انجانے“ کی شوٹنگ کے لیے بنگلہ دیش گئے تو عوام نے ان پر پھول نچھاور کیے اور صدر بنگلہ دیش نے ایوان صدر میں ظہرانہ دیا اور انہیں صدارتی اعزاز دیا گیا۔ فلم ”جانے انجانے“ بنگلہ دیش میں 185 ہفتے چلی مگر افسوس کے پاکستان میں ریلیز نہ ہوسکی اداکار محمد علی بھارت کے شہر رام پور سے ہجرت کر کے حیدر آباد آئے تھے انہوں نے ایک ملاقات میں بتایا تھا کہ ان کا قیام حیدر آباد کے علاقے ٹھنڈی سڑک سندھ یونیورسٹی کے موجودہ اولڈ کیمپس کے برابر والی دوسری گلی کے مکان میں تھا، ہجرت کے وقت علی مرحوم کے والد سید مرشد علی مرحوم اُن کی نانی اماں اور بھائی اور دو بہنیں عصمت آپا اور رضیہ آپا کے ساتھ محمد علی پاکستان آگئے تھے۔ علی نے بتایا کہ جب وہ تین سال کے تھے تو ماں کا سایہ سر سے اُٹھ گیا تھا اور پرورش عصمت آپا نے کی۔ 1949ء میں یہ اپنے والد کے ہمراہ ملتان چلے گئے اور اس سال انہوں نے ساتویں جماعت میں داخلہ لیا۔ 1954ء

میں انہوں نے گورنمنٹ کالج ایمرسن ملتان میں الف
اے کیا پھر حیدرآباد آ گئے۔ اور حیدر آباد کے میکلم
آفس میں بحیثیت کلرک 87 روپے ماہانہ پہ ملازمت کر
لی اور پھر بعد میں بحیثیت آرٹسٹ کے حیدرآباد ریڈیو
جوائن کر لیا انہوں نے مزید بتایا کہ حیدرآباد ریڈیو سے
میرے ڈرامے ''آخری چٹان، اور اندھیرے اجالا'' بہت
مقبول ہوئے اور پھر، مجھے ریڈیو پاکستان کراچی سے
پروڈیوسر ایس ایم سلیم نے جوائن کرنے کے لیے کہا تو
میں کراچی آ گیا۔ یہاں اخبار جنگ کے سامنے والی گلی
میں ''سید شرافت علی'' مرحوم رہا کرتے تھے میں نے ان
کے ہاں رہائش اختیار کر لی میں چچا کے
گھر سے ریڈیو پاکستان پیدل آیا کرتا
تھا۔ 1060ء میں بحیثیت کمپیئر کے
ثریا شہاب کے ساتھ پروگرام کرنے لگا
میرے ریڈیو کراچی سے ڈرامے
''آوازیں'' اور ''دھڑکن'' بہت مقبول
ہوئے میری بھابی (بھائی ارشاد کی بیوی
ممتاز) کے کزن کے گھر کے سامنے قائد
اعظم محمد علی جناح کے ڈرائیور اداکار آزاد
ناظم آباد 4 نمبر میں رہا کرتے تھے میں
ان کی چچا کی طرح عزت کرتا تھا۔ ان کی
دوستی مصنف سلیم احمد سے بہت تھی۔ وہ
اس زمانے میں قمر زیدی کی فلم ''آگ
اور خون'' لکھ رہے تھے جن کے موسیقار خلیل احمد مرحوم
فلم کے ہیرو کمال اور ریحانہ تھیں۔ میں ایک ''مہمان
اداکار'' تھا یہ میری پہلی فلم تھی جو ریلیز نہ ہو سکی زیڈ اے
بخاری میرے استادوں کی طرح تھے وہ ریڈیو پاکستان
سے وابستہ تھے انہوں نے میری فلم ساز فضل احمد کریم
فضلی سے ملاقات کروائی انہوں نے مجھے اپنی فلم ''چراغ
جلتا رہا'' میں متعارف کرایا۔ جس میں، میں پہلی مرتبہ
ولین کے رول میں آیا اس فلم کا افتتاح نشاط سینما میں
محترمہ فاطمہ جناح نے کیا۔ یہ فلم 9 مارچ 1962ء کو
ریلیز ہو کر سپرہٹ ہوئی یہ زیبا کی بھی پہلی فلم تھی جب
کہ بحیثیت ہیرو میری پہلی فلم ہدایت کار رفیق رضوی
مرحوم کی ''شرارت'' تھی میرے ساتھ مرکزی کردار لیلیٰ
اور بہار نے ادا کیے۔

ان کی شریک سفر زیبا جو اپنے وقت کی بیوٹی کوئن
تھیں انہوں نے بغیر کسی فحاشی کے سہارا لیے فلمی دنیا میں
بہت بڑا مقام حاصل کیا۔ وہ فلمی صنعت کی عزت اور
وہاں کام کرنے والوں کی جگت بھابی تھیں۔ محمد علی نے
زیبا کے ساتھ 40 سال محبت بھرا پُر خلوص دور گزارا۔

اداکار آزاد جو ناظم آباد میں رہتے تھے ان کے
پڑوسی سہیل احمد مرحوم بتاتے تھے کہ فلم ''تم ملے پیار
ملا'' کی شوٹنگ کے حوالے سے محمد علی اور زیبا کراچی
آئے تو 1966ء کی بات ہے دوپہر کے 4 بجے ناظم
آباد کراچی میں اداکار آزاد مرحوم کے گھر علی زیبا کا نکاح
قاضی مجید احتشام مرحوم کے ہاتھوں ہوا اور مہر کی رقم
37500 روپے مقرر ہوئی علی اور زیبا کے وکیل اداکار
آزاد مرحوم کے بڑے بھائی محمد یامین ان کے بیٹے انیس

آزاد اور علی کے بڑے بھائی ارشاد علی مرحوم تھے اسی شام علی زیبا نے انٹر کانٹی نینٹل ہوٹل میں دعوت کا اہتمام کیا اس میں علی ذیب کے کسی عزیز نے شرکت نہیں کی صرف ارشاد علی مرحوم موجود تھے۔

محمد علی تو فنکاروں میں لائبریری کا درجہ رکھتے تھے ایک واقعہ سناتے ہوئے علی بھائی نے بتایا تھا جب ندیم کی مزاحیہ فلم ''اناڑی'' سپر ہٹ ہوئی تو ہر فلم ساز ان کو مزاحیہ فلم میں سائن کرنا چاہتا تھا میں شباب صاحب کی عزت اپنے بڑے بھائیوں کی طرح کرتا تھا انہوں نے ایک فلم کا اسکرپٹ دیتے ہوئے کہا اسے پڑھو وہ مزاحیہ کردار تھا میں نے معذرت کر لی اور مزاحیہ کردار آپ کسی اور سے کروائیں اس زمانے میں اچھی فلم بارہ لاکھ میں بنتی تھی شباب کرایونوی جو اپنے وقت کے بڑے مصنف اور ہدایت کار تھے ناراض ہو گئے کہ اگر فلم فلاپ ہوتی ہے تو نقصان میرا ہو گا انہوں نے غصے سے کہا کہ اس فلم میں تم ہی کام کرو گے اور یوں مجھے اس فلم میں کام کرنا پڑا ''آئینہ اور صورت'' ریلیز ہوئی اور پاکستان میں سپر ہٹ ہوئی اور پھر اس کے بعد مزاحیہ فلموں میں نوکر، بھروسہ، کو عوام نے بہت پسند کیا۔ پاکستان کے قابل ہدایت کار (ایم اے رشید مرحوم) نے ایک واقعہ علی بھائی کے حوالے سے بتایا کہ جب میں نے فلم ''تم سلامت رہو'' کا آغاز کیا تو اداکارہ رانی کو کاسٹ کیا مگر رانی مرحوم بہت اس زمانے میں مصروف تھیں آسیہ نے علی صاحب سے درخواست کی کہ رانی مصروف ہیں آپ میری سفارش رشید صاحب سے کر دیں علی نفیس انسان تھے ان کے کہنے پر میں نے آسیہ کو کاسٹ کر لیا آسیہ اور ممتاز علی کی بہت عزت کرتی تھیں اور فنکاروں کی ذہنی ہم آہنگی کی وجہ سے فلم ''تم سلامت رہو میں چار چاند لگ گئے۔

اداکار محمد علی کی لاہور میں پہلی فلم ہدایت کار ایس سلیمان کی باجی تھی اِس میں یہ مہمان اداکار تھے۔ فلم ساز ہدایت کار ریاض امجد نے انہیں فلم ''خاندان'' میں پہلی مرتبہ ڈبل رول دیا۔ یہ کامیاب فلم تھی آرٹ فلموں میں نیلا پربت، ندیا کے پار، روٹی کپڑا اور انسان اور کنارہ شامل ہیں۔ کاسٹیوم میں ہزار داستان، باغی سردار، عادل، مجاہد اور حیدر علی کی کامیاب فلمیں تھیں۔ پنجابی فلموں میں شیرو دی بچی، یاد دوست، وڈا احسان اور شاہ بہرام قابل ذکر ہیں۔ 1995 میں ان کی آخری فلم'' دم مست قلندر'' تھی۔ 1977ء میں بھٹو کا ساتھ دیا اور جیل جانا پڑا۔ ضیاالحق مرحوم کے زمانے میں بھارتی فلم کلرک میں کام کیا۔ نواز شریف کے دور میں وفاقی مشیر رہے جذبہ خدمت کے عوض علی، زیب بلڈ فاونڈیشن کی بنیاد رکھی اِس ادارے میں خون کے کینسر کا علاج مفت کیا جاتا ہے۔ گلوکار اخلاق احمد مرحوم کے علاج کے سلسلے میں محمد علی نے ان کی کافی مدد کی۔

محمد علی نے بے شمار فلموں میں اپنی اداکاری کے جوہر دکھائے اُن کا نام فلم کی ہی کامیابی کی ضمانت بن جاتا تھا۔ فلم آسرا اُن کی ایک ایسی فلم ہے جس میں اُن پہ کوئی گانا فلم بند نہیں ہوا۔

محمد علی اور زیبا کی آخری فلم ''محبت ہو تو ایسی'' تھی۔

خاموش اُن کی پہلی سپر ہٹ فلم، ہیڈ کانسٹیبل علی زیب کی پہلی فلم، شیرو دی بچی بطور ہیرو پہلی پنجابی فلم، غدار پہلی فلم نیگ ٹو اولڈ کردار، کنیز پہلی، گولڈن جوبلی فلم جان پہچان پہلی رنگین فلم تھی انہوں نے بحیثیت فلم ساز کے سپر ہٹ فلم آگ بنائی محمد علی مرحوم فن کے شہید تھے اور ان کا چراغ شائقین فلم کے دلوں میں جلتا رہے گا محمد علی کتنے خوش نصیب ہیں کہ ان کی آخری آرام گاہ اولیا اللہ کے آستانے میں ہے جہاں ہر وقت زائرین ان کی مغفرت کی دعا کرتے ہیں 19 مارچ 2015ء میں اُن کی نویں برسی بنائی جائے گی اللہ ان کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام دے آمین۔

خلوص دل سے ہو سجدہ تو اس سجدے کا کیا کہنا
سرک آیا وہیں کعبہ جبیں ہم نے جہاں رکھ دی

آنگن میں بارات

رضیہ زمان

شکر اُس پیارے اللہ تعالیٰ کا (تاقیامت سجدے میں سر رکھوں تب بھی اُس پیارے رب کا شکر ادا نہیں کرسکتی) کہ آج میری پوتی مہک شکیل کے فرض سے بھی میرے اللہ نے مجھے سبکدوش کردیا۔ میرا خیال ہے کہ 'دوشیزہ' ڈائجسٹ کے قاری اور سب لکھاریوں کو بھی یاد ہو کہ آج سے 6 سال قبل

ہے کہ اُس کے لیے فوراً ہی رشتوں کی لائن لگ گئی۔ اور جو پہلا رشتہ آیا وہ ہمیں بے حد پسند آیا۔ یوں سمجھیے کہ چٹ منگنی پٹ بیاہ والی مثال ہوگئی۔ لڑکا ارسلان ربانی بھی MBA کرچکا اور برٹش نیشنل کمپنی میں بڑے عہدے پر فائز ہے اور ماشاء اللہ پورا خاندان تعلیم یافتہ اور اتنا بااخلاق اور محبت والا ہے کہ تعریف

رضیہ زمان اپنے اہل خانہ کے ساتھ، اپنی پوتی (دلہن) مہک شکیل اور ارسلان ربانی (دولہا) کے ہمراہ

میرے لاڈلے اور بہت ہی پیارے، ہر دل عزیز بیٹے کا ایک حادثے میں انتقال ہوا تھا اور اُس کی سوانح حیات 'سچی کہانیاں' ڈائجسٹ میں چھپی تھی۔ اُس وقت مہک شکیل (شکیل الزمان) کی بیٹی آغا خان کالج کے فرسٹ ایئر کی طالبہ تھی۔ اب ماشاء اللہ اُس نے BBA مکمل کرلیا ہے اور اللہ تعالیٰ کا کرم

کے لیے میرے پاس لفظ نہیں ہیں۔ مہک کی ساس اور سسر تو لاجواب ہیں۔ ایک اور بات کہ شادی ہونے پر پتا چلا کہ یہ سب یعنی مہک کے سسر ساس تو میرے شوہر کے بہترین دوستوں میں سے ہیں۔
لیجیے جناب شادی کی رسومات کا آغاز ہوگیا، مہندی کی تقریب میانوالی ہاؤس میں ادا کی گئی۔ ہر

ارسلان ربانی (دولہا) اپنے اہلِ خانہ کے ساتھ

طرف رنگ و نور اور قہقہوں کی برسات تھی۔ مہک سادگی میں بھی بہت حسین لگ رہی تھی۔ میری نظریں بار بار اپنی معصوم پوتی کی بلائیں لیتے ہوئے نظر اتارتے نہ تھکتی تھیں۔ بار بار مہک کو دیکھ کر مجھے اپنا بیٹا آنکھوں کے دھندلے عکس میں ڈوبتا ابھرتا دکھائی دے رہا تھا۔ اولادیں تو سب ہی پیاری ہوتی ہیں لیکن کوئی ایک بچہ بہت خاص ہوتا ہے۔ جس کی جدائی جان نکال لیتی ہے۔ باقی با...... کبھی کبھی انسان کو اپنے جذبات سنبھالنا کتنا مشکل ہوتا ہے یہ تو بس میرا دل ہی جانتا ہے۔ مہندی کی رسم یادگار ٹھہری۔

بابل کی چڑیا اپنا چنبہ چھوڑنے کے لیے تیار بیٹھی تھی۔ بارات کا اہتمام Lawyers Club میں کیا گیا تھا۔ ایک بار پھر رونقیں عروج پر تھیں۔ میری مہک پر ٹوٹ کر روپ آیا تھا۔ تو دولہے میاں بھی کم نہیں لگ رہے تھے۔ لوگ باگ کہہ رہے تھے کہ چاند سورج کی جوڑی ہے، خدا نظرِ بد سے بچائے۔ نکاح ہوا، طعام ہوا اور میری مہک پیا دیس سدھار گئی۔ میری آنکھوں میں سندر سندر یادوں کے پل بار بار آ کر ٹھہر رہے تھے۔ مہک کو میرے بیٹے،

بہوؤں اور بیٹیوں دامادوں نے رخصت کیا۔ سارے ددھیال کی لاڈلی آج کیسے ہم سب سے رخصت ہو رہی تھی۔ سچ کہتے ہیں بیٹی پرایا دھن ہوتی ہے لیکن اس پرائے دھن سے جڑی یادیں تو اپنی ہوتی ہیں۔

مہک کے بچپن سے لے کر آج تک کے سارے لمحات بار بار میرے کانوں میں سرگوشیاں کر رہے تھے اور یادوں کی پٹاری بار بار کھل جاتی تھی۔ کتنا مشکل ہوتا ہے اپنے پیاروں کو اس دل مندر سے دور کرنا۔ لیکن کیا کریں دنیا ہے، دنیا کا دستور ہے اور دنیاداری بھی۔ مہک ہم سب سے پل کے پل میں اپنے پیا کا گھر آباد کرنے چل دی۔

ہم سب اِن انمول یادوں کو لے کر واپس اپنے گھر آگئے۔ گھر آ کر یوں محسوس ہوا جیسے ہم سب کچھ Lawyers Club ہی میں چھوڑ آئے ہوں۔ گھر میں دل ہی نہیں لگ رہا تھا۔ عجب سی بے قراری اور یاسیت در و دیوار سے لپٹی ہوئی تھی۔

لیکن مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ میرا شکیل یہیں کہیں آس پاس موجود ہے اور اُس کے چہرے پر آسودگی بھری مسکان ٹھہری ہوئی ہے۔ جیسے اُس نے خود اپنے ہاتھوں سے مہک کو بابل کی چھاؤں تلے سے رخصت کیا ہو۔

اِس خیال نے میرے اندر توانائی بھر دی تھی۔ مجھے لگا جیسے میں ڈوبتی ڈوبتی پھر سے کنارے آ لگی ہوں۔ اور اِس بار جیت ہار کا یہ سفر مانوس مانوس تھا۔ ایک بار پھر سجدۂ شکر ادا کیا کہ مالک نے مجھے اپنے بیٹے کی ذمہ داری سے بہت اچھی طرح ہمکنار کیا۔ اور اِس مشکل ترین مرحلے کو میرے اپنوں نے میرے لیے آسان کر دیا۔

☆☆☆

میری مہک کا سسرال Seaview Apartments میں ہے۔ جب ولیمے والے دن میرا دل نہ مانا تو میں مہک کو دیکھنے کے لیے اُس کے گھر پہنچ گئی۔ مہک اپنے سسرال میں بہت خوش تھی اور اُس کے سسرال کے سبھی لوگ مہک کو ہاتھ کا چھالا بنائے ہوئے تھے۔ میری آنکھیں نم ہو گئیں اور دل نے خدا سے یہ دعا کی کہ مالک میرے شکیل کو تو تُو نے اپنے پاس بلا لیا ہے لیکن اُس کی یاد جو کہ مہک کی شکل میں میرے پاس موجود ہے، اُسے اِسی طرح ہنستے مسکراتے ہوئے رکھنا۔ واقعی میری مہک بہت قسمت والی ہے۔ میرے دل کو تسلی ہو گئی تھی اب میں خوش خوش اپنے گھر واپس آ گئی۔

☆☆☆

ولیمے کی تقریب کا انعقاد ارسلان کے گھر والوں نے Akacia میں کیا تھا۔ ولیمے کی تقریب بھی شاندار تھی، آج مہک اور ارسلان اتنے پیارے لگ رہے تھے کہ لفظوں میں بیان کرنا مشکل ہے۔

ارسلان کے گھر والے نہایت شائستہ اور خاندانی لوگ ہیں۔ بھلا آج کے زمانے میں اچھے لوگ کہاں ملتے ہیں۔ لیکن خدا نے جوڑے تو آسمان پر بنائے ہوتے ہیں بس ہم تو زمین پر اُن کا ملن دیکھتے ہیں۔

ایک طرف فوٹوگرافر ان حسین لمحات کو اپنے کیمروں میں محفوظ کر رہے تھے تو دوسری جانب تمام لوگ دولہا دلہن کی آئندہ خوشگوار زندگی کے لیے دعائیں دے رہے تھے۔

پیارے ساتھیو! میری آپ سے بھی گزارش ہے کہ میری پیاری پوتی مہک شکیل اور ارسلان ربانی کی زندگی اور صحت کے لیے دعا کیجیے۔ خدا تعالیٰ اِن دونوں کو اپنے اپنے رشتوں کو اُن کے حسن کے ساتھ برتنے کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین)

......☆☆☆......

ناول
رفعت سراج

دامِ دل

معاشرے کے بطن سے نکلی وہ حقیقتیں، جو دھڑکنیں بے ترتیب کردیں گی
رفعت سراج کے جادوگر قلم سے، نئے سلسلے وار ناول کی دوسری کڑی

ثمر آفس سے آ کر لاؤنج میں بیٹھا تھا۔ یہ اُس کی عادت تھی۔ ماں سے اُس کی لاؤنج میں ہی ملاقات اور سلام دعا ہوتی تھی۔ تھوڑی دیر ماں کے پاس بیٹھتا تھا اُس کے بعد بیڈروم میں چلا جاتا تھا۔

بانو آپا نے پھر بہانے سے علاج معالجے کی بات چھیڑی تو ثمر نے ایک دم چڑ کر کہہ ہی دیا۔

''امی جان بس کریں...... آپ ہر وقت یہ باتیں نہ کیا کریں۔ اب اتنی بھی دیر نہیں ہوئی کہ قیامت ہی آ گئی ہو۔ ہو جائے گا جب اللہ کا حکم ہوگا۔ آپ کی انہی باتوں کی وجہ سے اب وہ کسی کا بچہ لے کر پالنے کا سوچ رہی ہے۔'' بانو آپا نے ہکا بکا ہو کر ثمر کی شکل دیکھی۔

''کس کا بچہ؟ ائے ہئے ہم کیوں پالیں کسی کا بچہ۔ اور اُس کی ہمت کیسے ہوئی؟ اور اُس نے تم سے یہ فرمائش بھی کر دی۔'' ثمر نے ماں کی طرف دیکھا۔ پھر آہستہ آواز میں بولا۔

''امی جان کسی کا بچہ نہیں ہے۔ وہ اب اپنی بہن کی اولاد کو گود لینے کی بات کر رہی تھی اور میرا خیال ہے اُس کی وجہ صرف یہی ہے کہ آپ ہر وقت اُس کے سامنے یہی باتیں کرتی رہتی ہیں۔ پلیز آپ چھوڑ دیں۔ اللہ مالک ہے۔'' بانو آپا ہکا بکا بیٹے کی شکل دیکھ رہی تھیں۔

''ارے تو تم نے کیا کہا؟ ہم کیوں پالنے لگے کسی کا بچہ بھئی؟'' ثمر ایک دم جھنجلا سا گیا۔

''امی جان میں وہی تو کہہ رہا ہوں ناں کہ جب اللہ پاک کو منظور ہوگا، ہمیں ہمارا اپنا بچہ مل جائے گا۔ چمن شاید اس وجہ سے یہ سوچ رہی ہوگی کہ گھر میں بچہ کھیلے گا تو شاید آپ بہل جائیں۔'' بانو آپا ایک دم بھڑک کر بولیں۔

''ارے ہم کیوں پرائے بچوں سے بہلنے لگے۔ بھئی ہمیں تو اپنا بچہ چاہیے۔'' ثمر نے گہری سانس لی اور بولا۔

''جی امی! میں نے اُس کو یہی بات کہہ دی ہے۔ اب خدا کے لیے آپ یہ بات اُس کے سامنے مت کر بیٹھیے گا۔ میں نے اُسے منع کر دیا ہے کہ ہم کسی کا بچہ گود نہیں لیں گے۔''

''یہ تو خیر تم نے بہت اچھا کیا۔'' بانو آپا کو جیسے سکون آ گیا۔'' اور یہ کیا تم مجھے بات بات پر تاکید کرتے رہتے

ہو۔ یہ بات اُس کے سامنے نہیں کرنا، وہ بات اُس کے سامنے نہیں کرنا...... ارے بھئی جو بُرا مانے وہ دو روٹی زیادہ کھالے۔ بھئی جو کرنے والی بات ہوتی ہے وہی کرتے ہیں۔ لگتا ہے بہو بہت سکھا پڑھا کر میرے پاس بھیجتی ہے۔'' ثمر نے اپنے سر پر ہاتھ رکھ لیا۔

''امی جان ابھی تو سیدھا آفس سے آکر آپ کے پاس بیٹھا ہوں۔ ابھی تو میں نے اُس کی شکل بھی نہیں دیکھی ہے۔''

''ارے بس ہٹاؤ...... وہ جو ہر وقت ایک ہے ناں جھنجھنا کان سے لگا رہتا ہے۔ جسے دیکھو وہ کان سے لگائے گھوم رہا ہے۔ ماسی ہے جھاڑو لگا رہی ہے، دوسرے ہاتھ سے وہ جھنجھنا پکڑا ہوا ہے۔ سڑک پر جا رہے ہیں تو جھنجھنا ہاتھ میں ہے۔ کار چلا رہے ہیں تو وہ جھنجھنا ہاتھ میں ہے۔ ارے اتنی باتیں ہو رہی ہیں، اتنی باتیں ہو رہی ہیں، مارا! جیسے دنیا ختم ہونے والی ہے۔ جلدی سے جلدی ساری باتیں کرلو بس۔ ہمیں تاکیدیں نصیحتیں کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ بس! اور تم ہماری اولاد ہو۔ ہم اچھی طرح جانتے ہیں کہ کون سی بات تم اپنی کر رہے ہو۔ اور کون سی بات تمہیں بہو نے بولی ہے اور تم قاعدہ پڑھ کر سُنا رہے ہو۔ ماں ہوں میں تمہاری!'' بانو آپا کو غصہ آ گیا۔ اُٹھ کر چل پڑیں۔

ثمر نے بڑی بے بسی سے صوفے کی بیک سے ٹیک لگائی تھی اور اپنا سر دبانے لگا۔

☆......☆......☆

ایمن ایک تو پہلے ہی کمزور ہو رہی تھی۔ دوسرے پریگنینسی کی وجہ سے اُس کی طبیعت اور گری گری رہنے لگی تھی۔ تیسرے قیامت یہ کہ ساس، سُسر اور میاں تینوں کے تینوں صبح، دوپہر، شام اُس پر ہر وقت چڑھ بیٹھتے تھے اور ڈاکٹر نے اُسے وارننگ دی تھی کہ آپ کو بالکل ریلیکس رہنا ہے۔ اسی لیے اُس نے الٹراساؤنڈ کرانے سے بھی انکار کر دیا تھا کہ اگر اللہ کی طرف سے بیٹی ہی کا فیصلہ ہوا ہے تو پھر تم ڈپریشن میں چلی جاؤ گی۔ تمہارا کچھ بگڑے نہ بگڑے مگر اُس بچے کا بہت کچھ بگڑ جائے گا۔ وہ ذہنی طور پر معذور بھی پیدا ہو سکتا ہے۔ اُس نے ایمن کو اتنا ڈرایا تھا کہ ایمن تو اُن دیکھے بچے کے لیے جس نے کئی مہینوں کے بعد دنیا میں آنا تھا اتنی محتاط ہو گئی تھی کہ ساس، سُسر، شوہر تینوں سے دور دور رہتی تھی۔ وہ کم ہمت ایمن جو بات کرتے ہوئے کئی مرتبہ سوچتی تھی اب جیسے...... اولاد نے اُس کو اتنی ہمت دے دی تھی کہ ساس، سُسر میاں تو چھوڑ وہ ساری دنیا سے ٹکرانے کو تیار ہو گئی تھی۔

اُس کا اِنکار سُن کر فردوس اور حامد حسین غصے سے ناچتے پھر رہے تھے۔ کیونکہ دونوں صبح ہی صبح تیار ہو گئے تھے اور دونوں کو پکی اُمید تھی کہ آج وہ ایمن کو اپنے ساتھ اسپتال لے جا کر الٹراساؤنڈ کرا ہی لیں گے۔ لیکن ایمن کے صاف انکار نے پہلے تو اُن کو حیران کیا لیکن مایوس نہیں کیا۔ کیونکہ اُن کو اپنے ظلم اور زیادتی پر بہت ناز اور اعتماد تھا۔ وہ جانتے تھے کہ وہ آخری حدوں کو چھو سکتے ہیں۔ تشدد تک جا سکتے ہیں۔ سب کچھ کر سکتے ہیں اس لیے فی الحال وہ بھڑک بھڑک کر اُسے ڈرانے اور سہانے کی کوشش کر رہے تھے۔

ایمن نے دوٹوک انداز میں اُن سے بات کی تھی۔ جس پر حامد حسین نے چلا کر کہا تھا کہ تمہاری اتنی ہمت کہ تم ہمیں انکار کر رہی ہو؟''

''میں نے کوئی گناہ یا جرم کیا ہے تو مجھے اُس کی سزا دے دیں لیکن الٹراساؤنڈ کرانے میں نہیں جاؤں گی۔ نہ میری تمنا ہے اور خاص طور پر ڈاکٹر نے بھی مجھے منع کر دیا ہے۔ ویسے بھی اگر دیکھا جائے تو ڈاکٹر کہتے ہیں کہ

الٹراساؤنڈ اور ایکسرے وغیرہ اُن کی شعاعیں بڑی خطرناک ہوتی ہیں۔''

''واہ بھئی واہ! لو بھئی یہ تو آج ہمیں اسکول پڑھانے لگی۔'' فردوس نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر آنکھیں چلائیں اور مذاق اُڑانے والے انداز میں ایمن کی طرف دیکھا۔

''چلو اُٹھو!'' فردوس نے اپنی چادر سنبھالتے ہوئے ایمن کو اُٹھنے کا اشارہ کیا۔

''آپ کو ایک مرتبہ یہ بات سمجھ کیوں نہیں آ رہی؟ میں نے کہا میں نہیں جاؤں گی تو بس نہیں جاؤں گی۔''

فردوس نے دونوں ہاتھ کمر پر رکھے اور ایمن کے قریب آ کر اُس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے گھور کر بولی۔

''تمہارے تو اچھے بھی جائیں گے۔'' ایمن نے اب بہت اعتماد مگر بڑی بدتمیزی سے جواب دیا۔

''تو پھر امی جان میرے اچھوں کو ہی لے جائیں۔'' فردوس نے حامد حسین کی طرف دیکھ کر جیسے فریاد کی۔

''دیکھ رہے ہیں کتنی لمبی زبان ہے۔ وہ تو اللہ نے اپنے برتن میں رکھا ہے۔ ایک بیٹا بھی پیدا کر لیتیں تو ...... ہمارا بوریا بستر باہر ہوتا۔'' ایمن تھکے تھکے انداز میں کھڑی ہوگئی۔ وہ تو سارے کاموں سے فارغ ہو کر لاؤنج میں ذرا سانس لینے کے لیے بیٹھی تھی۔ بچیاں اسکول جا چکی تھیں۔ یاور آفس جا چکا تھا اور اُس کے بعد اُس نے گھر کی صفائی ستھرائی، برتن وغیرہ دھو کر ذرا اطمینان کا سانس لیا تھا کہ اب تھوڑی دیر آرام کر لے گی۔ لیکن اُس کے بیٹھتے ہی دونوں ساس، سُسر جیسے اَن دیکھے حملہ آور کی طرح نازل ہو گئے۔

ایمن اپنے کمرے کی طرف جا رہی تھی۔ فردوس اور حامد حسین اُس کی خوداعتمادی اور ہمت پر ششدر کھڑے تھے۔

☆......☆......☆

بانو آپا آخر ایک بڑے پہنچے ہوئے نامور عامل کامل کے آستانے پر پہنچ ہی گئی تھیں۔ انہوں نے کسی کو نہیں بتایا تھا فی الحال تو وہ کچھ کارروائیوں کے لیے آئی تھیں۔ جن میں نمبر ایک تو یہ تھا کہ اُن کا بہو اور بیٹا بالکل کاٹھ کے اُلو بن جائیں۔ روز جو اُن کے منہ سے نکلے اُسے پورا کریں۔ بڑی آس اور اُمید کے ساتھ، وہ بابا جی سے خوشامدانہ انداز میں کہہ رہی تھیں۔

''بابا جی کوئی ایسا تعویذ دے دیں جو میں اپنی بہو کو پانی میں گھول کر پلا دوں یا میٹھے پر دم کر کے دے دوں۔ وہ تو آنے پر تیار ہی نہیں ہوتی اور نا اعوذ باللہ آپ کی شان میں گستاخی کرتی ہے۔ پتا نہیں کیا کیا کہتی ہے۔ کبھی کہتی ہے ڈبہ پیر ہیں۔ کبھی کہتی ہے جعلی پیر ہیں۔'' بابا جی تو اتنا سنتے ہی جلال میں آ گئے تھے۔

''ارے اُس کا تو ہم منہ بند کر دیں گے۔ اُس کی اتنی ہمت کہ اللہ کے فقیروں کی شان میں گستاخی کرے۔ اُسے ذرا بھی خوف خدا نہیں ہے۔''

بانو آپا اُن کا جلال دیکھ کر سہم سی گئیں۔ منمناتے ہوئے بولیں۔

''میں نے اُس کو بہت ڈرایا تھا بابا جی! میں نے کہا تھا اللہ والوں کی شان میں گستاخی نہیں کرتے۔ اللہ کی طرف سے بڑی سخت سزا ملتی ہے۔''

''ارے اِس لڑکی کے چھن ایسے تھے تو تم اُسے بہو بنا کر کیوں لائیں؟ شہر بھر میں لڑکیاں مر گئی تھیں کیا؟'' بابا جی گرجے۔ بانو آپا نے دونوں ہاتھ بڑی بے بسی سے مَلتے ہوئے بابا جی کو جواب دیا۔

''بابا جی میرے کرم پھوٹے تھے۔ میں جنم جلی وہاں پہنچ گئی۔ اُس کے دروازے پر......بس کیا کہتے ہیں ہونی ہو کر رہتی ہے۔ مت ماری گئی تھی میری، ورنہ لڑکیوں کی کوئی کمی نہیں تھی میرے بیٹے کو۔ یہ بانجھ بنجر لکھی تھی میرے نصیب میں۔''

بابا جی نے اب شاطرانہ انداز میں اپنی کلائنٹ کی طرف دیکھا اور سمجھ گئے کہ کیس بہت اسٹرونگ ہے۔ یہاں تو کئی مسائل ہیں۔ ہر مسئلہ کے لیے الگ چکر اور ہر چکر کے لیے ایک الگ کیس......اور ہر کیس کی الگ فیس......اب بڑے شفقت آمیز لہجے میں گویا ہوئے۔

''میری بہن بالکل پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، سمجھو تم ہمارے پاس آئیں اور ہم نے تمہارے مسئلے کا حل ڈھونڈ لیا۔ ایک تعویذ تمہیں دیے دیتے ہیں۔ وہ اس کے بستر کے نیچے دبا دینا۔ یاد رکھو کہاں دباؤ گی؟'' بانو ایک دم پُرجوش انداز میں بولیں۔

''اُس کے بستر کے نیچے۔'' پھر بڑی معصومیت سے بولیں۔

''لیکن تعویذ تو کاغذ کا ہوتا ہے بابا جی۔ کمرے میں تو پنکھا بھی چلتا ہے۔ اُڑ کر اِدھر اُدھر چلا جائے گا۔''

بابا جی نے ذرا خفا خفا نظروں سے بانو آپا کی طرف دیکھا جیسے اُن کی کم عقلی کا ماتم کر رہے ہوں......'کتنی اناڑی عورت ہے۔'

''ارے بھئی بستر کے نیچے پھینکنے کے لیے نہیں کہا ہے گدے کے نیچے دبا دینا۔ ارے وہ کیا ہوتے ہیں ڈبل

بیڈ جس پر تمہاری بہو سوتی ہوگی۔ اُس بستر کی بات کر رہا ہوں۔ اُس پر موٹا سا گدا پڑا ہوگا۔ بس ایک دفعہ اُس کے نیچے دبا دو پھر جب تک ہم نا کہیں اُسے وہاں سے نکالنا مت۔'' بابا جی نے پُر زور تاکید کا بگھار بھی لگا دیا۔

بانو آپا نے یوں جلدی جلدی گردن ہلائی جیسے بابا جی کو یقین دلا رہی ہوں کہ اُن کو سب سمجھ آ گئی ہے۔ پھر انہوں نے پرس کھولا اور سو، پچاس کے کچھ نوٹ نکال کر اُن کے چندہ بکس میں ڈالنے لگیں۔ بابا جی نے بڑی حقارت سے رقم کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''ارے بھئی یہ کیا تم ہم پر احسان کر رہی ہو۔ ہر مہینے دو ہزار لوگوں کو لنگر کھلاتے ہیں ہم۔ کیا سمجھیں تم، دو ہزار بندوں کے لنگر کا مطلب کیا ہوا۔ 100 دیگیں تو پکواتے ہیں اور یہ آپ ہی لوگوں کی نذر و نیاز ہوتی ہے جس سے غریب اپنا دوزخ ٹھنڈا کرتے ہیں۔ یہ سب کچھ ہم اپنے لیے نہیں مانگتے، لنگر کا خرچہ، آستانے کا خرچہ، مؤکلوں کا خرچہ کوئی ایک خرچہ ہے۔''

بانو آپا نے پھر اپنا پرس نئے سرے سے ٹٹولنا شروع کیا۔ پھر اُن کو کچھ نوٹ پانچ سو اور سو کے مزید نظر آ گئے۔ انہوں نے وہ بھی نکالے اور بغیر گنے بابا جی کے چندہ بکس میں ڈال دیے۔

بابا جی کا موڈ خراب ہو گیا تھا۔ انہیں یوں لگا جیسے یہ عورت بہت کنجوس ہے۔ ہر دفعہ اتنی لمبی تقریر کرنا پڑے گی، تب جا کر اُس کے پرس سے نوٹ نکلیں گے۔ پھر بھی کچھ نہ ہونے سے کچھ ہونا بہتر ہے۔ یہ سوچ کر وہ خاموش ہو گئے تھے۔

☆......☆......☆

ہر انسان اپنی صلاحیت اور اپنے خیالات کے مطابق عمل کرتا ہے اور علم کے مطابق عمل کرتا ہے اور علم کے مطابق ہی انسان کا ظرف ہوتا ہے۔ حامد حسین کی سوچ کی اُڑان بھی یہیں تک تھی کہ وہ چند بڑے نوٹ لفافے میں ڈالیں اور لیڈی ڈاکٹر کے سامنے رکھ دیں اور جو وہ چاہتے ہیں وہ حاصل کر لیں۔ لیڈی ڈاکٹر نے بڑی اُلجھن بھری نظروں سے پہلے لفافے کی طرف دیکھا اور پھر فردوس اور حامد حسین کی طرف دیکھا تھا۔ حامد حسین بڑے تفاخر سے مسکرائے اور گردن اکڑا کر بولے۔

''ڈاکٹرنی صاحبہ گن لیں۔ انشاء اللہ خوش ہوں گی ناراض نہیں ہوں گی۔'' لیڈی ڈاکٹر حیران اور پریشان فردوس کی طرف دیکھ کر پوچھنے لگیں۔

''مگر یہ کس سلسلے میں؟'' فردوس جلدی سے بولیں۔

''ارے بھئی آپ نے کیا وہم ڈال دیا ہے ہماری بہو کے دل میں کہ وہ الٹرا ساؤنڈ کرانے پر راضی نہیں ہے۔ اب آپ اُسے یہ بتا دیں کہ وہ الٹرا ساؤنڈ سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔''

لیڈی ڈاکٹر ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ عورت تھی۔ تجربہ کار عورت تھی۔ زمانے کے سرد و گرم دیکھتے ہوئے بالوں میں چاندی اُتر رہی تھی۔ اشارے میں ہی جیسے سب کچھ سمجھ گئی۔ اُس نے اپنی اُنگلی سے لفافے کو حامد حسین کی طرف دھکیلتے ہوئے بڑے سپاٹ مگر دو ٹوک انداز میں کہا۔

''معاف کیجیے گا، میں یہ کام نہیں کرتی۔ مجھے صرف اپنی فیس سے مطلب ہے۔ مجھے تو حیرت ہے۔ آپ نے مجھے کیا سمجھا ہے۔ کیا سمجھ کر یہ لفافہ میرے آگے پھینکا ہے۔'' حامد حسین بڑی ڈھٹائی سے مسکرائے۔

''پھینکا نہیں ہے ڈاکٹرنی صاحبہ! پیش کیا ہے۔ ڈسپرین بھی بغیر پیسے کے نہیں ملتی۔ پیسے کی بڑی اہمیت ہے۔''

یہ سُن کر تو ڈاکٹر نیلوفر کے آگ لگ گئی۔ وہ بڑی نامور گائناکالوجسٹ تھی۔ آس پاس دور دراز سے عورتیں اِس کے پاس آتی تھیں۔ اس کا چلتا ہوا ذاتی اسپتال تھا۔ اُسے تو یہ لفافہ یوں محسوس ہو رہا تھا، جیسے اُسے کسی نے کھڑے کھڑے بے لباس کر دیا ہو۔ وہ اپنی جگہ سے کھڑی ہو گئیں۔

''تشریف لے جائیں۔ میں نے جو مشورہ آپ کی بہو کو دیا ہے، میں اُسی پر قائم ہوں۔ اس لیے کہ انسانیت کے ناتے مجھے آپ کی بہو کا احساس کرنا ہے، آپ کا نہیں۔ بچہ بھی وہ پیدا کرے گی آپ نہیں...... اُسے کوئی بھی مسئلہ ہو، کوئی بھی ایشو ہو۔ وہ الٹراساؤنڈ کرانا چاہتی ہے یا نہیں کرانا چاہتی، میرے پاس اُسے آنا چاہیے تھا آپ کو نہیں۔ آپ ہوتے کون ہیں؟'' فردوس ڈاکٹر کی جھاڑ سن کر بڑی سبکی اور بے عزتی محسوس کر رہی تھیں ایک دم ہتھے سے اُکھڑ گئیں اور کھڑی ہو کر ڈاکٹر کی آنکھوں میں براہِ راست گھورتے ہوئے بولیں۔

''بہو ہے ہماری۔ ہم سے پوچھ رہی ہو۔ ہم کون ہوتے ہیں۔'' ڈاکٹر نیلوفر نے دونوں میاں بیوی کی طرف دیکھا اور بڑے سپاٹ لہجے میں گویا ہوئیں۔

''جی ہاں! وہ آپ کی بہو ہے۔ اسی لیے آپ لوگوں نے یہ ظلم کا بازار گرم کیا ہوا ہے۔ اگر آپ کی بیٹی ہوتی تو آپ اس جگہ پر نہیں ہوتے۔ آپ کی بیٹی کے ساس سُسر یہاں بیٹھے ہوتے۔'' حامد حسین نے بڑے غرور سے کہا۔

''ہماری کوئی بیٹی نہیں ہے۔'' ڈاکٹر نیلوفر نے بڑے دُکھ سے حامد حسین کو سر سے پاؤں تک دیکھا۔

''وہ تو سمجھ میں آ رہا ہے۔ اتنی بے حسی کی انتہا کو تو وہی چھو سکتا ہے جس کی اپنی کوئی بیٹی نہ ہو۔'' یہ کہہ کر ڈاکٹر نیلوفر رُکی نہیں بڑی تیزی سے اپنے روم سے نکل گئیں۔

دونوں میاں بیوی غصے میں کھولتے ہوئے دروازے کی طرف گھور رہے تھے۔

☆......☆......☆

افشاں اپنے دو بیٹوں کے ساتھ ماں سے ملنے آئی ہوئی تھی۔ افشاں کے یہ دو جڑواں بیٹے تھے۔ دونوں کے نام آذان اور اذلان تھے۔ بے انتہا شرارتی بچے، جب بھی آتے تھے، ایک سیکنڈ کے لیے نچلا نہیں بیٹھتے تھے۔

افشاں تو مہینوں کی باتیں سمیٹ کر ماں کے سامنے پٹارا کھول کر بیٹھ جاتی تھی اور دونوں شرارتی بچے چمن کا ناک میں دم کر دیتے تھے۔ وہی اُن کو سنبھالتی تھی۔ اُن کے آگے پیچھے پھرتی تھی۔ گھر کی نازک اور قیمتی چیزیں اُن سے بچاتی تھی۔ ساتھ ہی اُن کو کھلانا پلانا اور اُن کی فرمائشیں پوری کرنا بھی اسی کی ڈیوٹی ہوتی تھی۔ اس وقت بھی یہی منظر تھا۔ افشاں تو ایک گھنٹے سے اپنی ماں سے کھسر پھسر میں مصروف تھی۔ سسرال کے اگر پچاس گھر تھے تو تقریباً تیس گھروں کی برائیاں تو وہ ایک پوٹلی میں باندھ لاتی ہی تھی اور تین گھنٹے سے پہلے ماں بیٹی ایک دوسرے سے دور نہیں ہوتی تھیں۔

چمن نے تو کبھی کھوج لگانے کی کوشش ہی نہیں کی کہ وہ اتنی دیر تک کیا باتیں کرتی ہیں اور کس قسم کی باتیں کرتی ہیں؟ اور اُسے کھوج لگانے کا ہوش ہی کہاں رہتا تھا۔ وہ دونوں بچے زمین اور آسمان ایک کیے ہوئے تھے، اُسے تو ایک لمحے کے لیے بھی انہی سے فرصت نہیں ہوتی تھی۔

اِس وقت بھی وہ ڈائننگ روم میں کھانا لگانے میں مصروف تھی۔ بچے اوپر نیچے بھاگ دوڑ کرتے پھر رہے تھے۔ اُسی وقت گھر میں ایک زوردار چھناکے کی آواز اُبھری...... چمن پلیٹیں لگاتے لگاتے بری طرح اُچھل گئی۔ اُس نے پلٹ کر دیکھا تو اُس کا پسندیدہ گلدان جو وہ ایک ہفتہ پہلے ہی بہت پیار سے خرید کر لائی تھی اور بڑے

اہتمام سے سجایا تھا۔ فرش پر کرچیوں کی صورت میں بکھرا ہوا تھا۔ جتنی کرچیاں گل دان کی تھیں، اِس سے زیادہ اُس کے دل کی...... اُسے غصہ تو بہت آیا کیونکہ افشاں اور بانو آپا بچوں سے کچھ زیادہ دور نہیں بیٹھی تھیں۔ وہ بچوں کو ٹوک سکتی تھیں محتاط کر سکتی تھیں۔ مگر وہ کیوں کرتیں؟ یہ تو چمن کی ڈیوٹی تھی کیونکہ افشاں نے دو جڑواں بیٹے پیدا کر کے پاکستانی قوم پر احسان جو کیا تھا۔ وہ اندر ہی اندر سُلگتے ہوئے سوچ رہی تھی۔ بانو آپا نے اِدھر اُدھر دیکھا پھر اُن کی نظر بہو پر پڑی۔

''ارے چمن، یہ بیچارے بچے سے گل دان ٹوٹ گیا ہے۔ ارے چیزوں کا کیا ہے وہ تو آتی جاتی رہتی ہیں۔ دیکھنا کہیں کانچ اِس کے پاؤں میں نا چبھ جائے۔ چلو ہٹو اذلان، آذان اِدھر آ کر بیٹھو۔ ماسی یہاں سے صفائی کریں گی۔ اس کے بعد کھیلنا۔'' افشاں نے بھی بیٹوں کو گھورا۔

''ہٹ جاؤ اُدھر سے۔ نانی جان کہہ رہی ہیں سمجھ نہیں آ رہی۔ ایک کانچ چبھ گیا نا...... بہت خون نکلے گا۔ اِدھر سے ہٹو۔'' افشاں نے بھی ماں ہونے کے ناتے رسمی کارروائی پوری کی اور دوبارہ اپنی بات وہیں سے شروع کر دی جہاں سے سلسلہ منقطع کر کے بچوں کو جھاڑ پلائی تھی۔

دونوں ماں بیٹی پھر مصروف ہو گئیں۔ ملازمہ صفائیاں ستھرائیاں کر کے دو بجے تک چلی جاتی تھی۔ اس وقت وہ چھت پر کپڑے دھو رہی تھی۔ چمن کے لیے یہ بھی ایک کام تھا کہ وہ چھت پر جائے اور اُسے بلا کر لائے اور کہے کہ یہاں پر بکھرے ہوئے کانچ کے ٹکڑے سمیٹو۔ اُس نے خود ہی یہ مزدوری کرنے کا آخر کار فیصلہ کر لیا۔

پہلے تو اُس نے بچوں کو کھینچ کر زبردستی اِن کی ماں کے پاس بٹھایا۔ ایسے کہاں بیٹھنے والے تھے وہ۔ چمن نے سختی سے دونوں کو بازوؤں سے پکڑ کر اِن کی ماں کے برابر میں زور دے کر ایک طرح سے صوفے میں پھنسایا تھا۔ بانو آپا نے گھور کر چمن کو دیکھا۔

''ارے تم بچوں کو یہ کس طرح سے پٹخ رہی ہو؟''

''اماں جان میں بچوں کو پٹخ نہیں رہی ہوں، اِن کو اِن کی ماں کے پاس بٹھا رہی ہوں۔ یہ یہاں بیٹھیں گے۔ تو اُدھر سے کانچ کے ٹکڑے سمیٹے جائیں گے۔'' افشاں نے گھور کر بھاوج کی طرف دیکھا۔

''تو آرام سے بٹھا دیں۔ آپ نے اتنی زور سے اُن کے بازو پکڑے تھے کہ توبہ! چھوٹے سے بچے ہیں۔'' بانو آپا بھڑک کر بولیں۔

''ارے بھئی جب اپنی اولاد نہیں ہوتی نا تو دل برداشت ہوتا ہے۔ پرائے بچوں پر پیار نہیں آتا۔''

''امی جان یہ پرائے بچے کہاں ہیں۔ بھائی جان کے بھی تو کچھ لگتے ہیں۔'' افشاں برامان کر بول رہی تھی۔ پھر اُس نے چمن کی طرف کن انکھیوں سے دیکھتے ہوئے طنزیہ کہا تھا۔

''ہاں بھائی جان کے تو لگتے ہیں...... بھائی جان کی بیوی کے تو کچھ نہیں لگتے۔ بتاؤ کس بری طرح سے لا کر بچوں کو پٹخا ہے۔''

چمن نے بڑی بے بسی کی کیفیت میں ساس اور نند کو دیکھا اور اپنے کھولتے ہوئے لہو کو کنٹرول کرنے کی کوشش کی۔ لیکن کہے بغیر نہ رہ سکی۔

''امی جان میں نے کوئی غلط بات نہیں کی، بچوں کو اُن کی ماں کے پاس بٹھایا ہے۔ سب بچے شرارتیں کرتے ہیں۔ بچوں کی شرارتوں کو کنٹرول کرنا اُن کی ماں کا کام ہوتا ہے۔'' افشاں نے آگ برساتی ہوئی نظروں

سے چمن کی طرف دیکھا۔

''ظاہری بات ہے آپ تو جلیں گی میرے بچوں سے، خود تو بے اولاد ہیں۔'' بانو آپا نے فوراً لقمہ لگایا۔

''اور نہیں تو کیا، وہ تو بس نہیں چلتا، میری بیٹی کا آنا جانا بند کرا دے۔ میرا بیٹا اُلٹی سیدھی باتیں سنتا نہیں ہے، اپنے کام سے کام رکھتا ہے۔ ورنہ یہ تو کان بھرنے میں کسر ہی نہ چھوڑے۔''

''امی جان میں نے افشاں کے یہاں آنے پر کبھی کوئی ایسی بات نہیں کی جس سے آپ کہہ سکیں کہ اس کا آنا مجھے اچھا نہیں لگتا۔ میرے کہنے کا مطلب یہ ہے اپنے بچوں کو خود سنبھالنا چاہیے کیونکہ ایک ماں ہی اپنے بچوں کو سمجھتی ہے اور سنبھال سکتی ہے۔ دوسروں نے ٹھیکہ نہیں لیا ہوا ہوتا۔'' افشاں نے ماں کی طرف دیکھا اور فوراً رونے والی آواز میں بولی۔

''دیکھ لیجیے امی! اب تو ٹھیکے کی باتیں ہونے لگی ہیں۔ ہمارا تو اِس گھر پر کوئی حق ہی نہیں رہا۔ میں جا رہی ہوں آئندہ نہیں آؤں گی۔ کبھی ایک ذرا سا چار آنے کا گلدان کیا توڑ دیا، ایک ہزار باتیں سُنا دی ہیں۔'' بانو آپا نے بیٹی کو کھینچ کر ایک دم گلے سے لگا لیا۔

''ارے بیٹا یہ تمہاری ماں کا گھر ہے، یہ اِس کے باپ کا گھر نہیں ہے۔ یہ ہوتی کون ہے اعتراض کرنے والی۔ جم جم آؤ۔ صبح، دوپہر، شام آؤ۔ اگر کسی نے تمہارے آنے جانے پر بُرا منایا یا ٹوکا تو اُسے میں دیکھ لوں گی۔ ارے میری بچی کا گھر ہے۔ یہ میرے شوہر کا گھر ہے۔ اس میں میرے دونوں بچوں کا برابر کا حصہ ہے۔ یہ کیا سمجھ رہی ہے ہر چیز پر قبضہ کر لے گی۔ ارے اس کا کاغذ کا رشتہ ہے اور کاغذ سے کچا رشتہ کیا ہوا؟ تین بول میں عورت اندر اور تین بول میں عورت باہر۔ کیا پتا کل تمہارا بھائی کوئی دوسری کر لے...... تو بھی یہ تمہارا گھر ہے۔ تم ماں کے ہوتے ہوئے اس گھر کو کبھی پرایا نہیں سمجھنا۔ سمجھ گئیں؟''

افشاں ماں کے کندھے سے سر لگا کر اپنے مگرمچھ کے آنسو پونچھنے لگی اور بانو آپا سر پر یوں ہاتھ پھیرنے لگیں جیسے خدانخواستہ مرنے والے کے لواحقین کو دلاسہ دے رہی ہوں۔

چمن نے اب مزید کچھ کہنا وقت کا زیاں ہی سمجھا۔ اتنا تو ہوا تھا کہ آج دل کی بھڑاس نکال لی تھی۔ وہ یہ بھی جانتی تھی کہ وہ یہ سب کچھ ثمر کے سامنے پیش کیا جائے گا۔ لیکن وہ ذہنی طور پر نئے کھلنے والے محاذ کے لیے تیار ہو چکی تھی کہ ہر بات کی آخر ایک حد ہوتی ہے۔

☆......☆......☆

حامد حسین اپنے بیڈروم میں تھے۔ یا وہ اُن کے سامنے یوں بیٹھا تھا جیسے کوئی مجرم تاریخ پر کورٹ میں پیش ہوا ہو۔ فردوس اپنے مخصوص فساد مچانے والے انداز میں رانوں پر زور زور سے ہاتھ مار کر رو رہی تھیں۔

''ارے کون سی منحوس گھڑی تھی کہ ہم اسے اِس گھر میں بیاہ کر لائے تھے۔ میں تم کو بتا نہیں سکتی بیٹا! آج جو اِس نے ہمارے ساتھ کیا۔ کتنی بے عزتی کی۔'' حامد حسین نے یوں ہاں میں گردن ہلائی کہ اپنی لاڈلی بیگم کے ایک ایک لفظ سے اتفاق کر رہے ہوں۔ پھر بولے۔

''ارے چار مہینے اِسے ماں باپ کے گھر بٹھا دو پھر ہوش ٹھکانے آ جائیں گے۔ بچیاں بھی ساتھ بھیج دو، اِس کے ماں باپ خرچہ اٹھائیں گے نا تو آٹے دال کا بھاؤ پتا چل جائے گا۔'' فردوس ایک دم چونک پڑیں اور اپنے جھوٹ موٹ کے یا مگرمچھ کے آنسو پونچھتے ہوئے حامد حسین کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولیں۔

''ارے میں تو کبھی کا بھیج دیتی اگر الٹراساؤنڈ ہو جاتا۔ میں تو یہ سوچ کر اُسے روکے ہوئے ہوں کہ کیا پتا اس دفعہ بیٹا ہو جائے؟ اگر گھر سے نکال دیا تو سمجھو ہمارا بچہ بھی گیا۔''

یاور کبھی ماں کی طرف دیکھنے لگتا تھا تو کبھی باپ کی طرف۔ اس کے اپنے ذہن نے تو جیسے اُس کا ساتھ چھوڑ دیا تھا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اُس کے ماں باپ کیا چاہ رہے ہیں۔ اسے کس لیے بلایا تھا۔ کیا آج دن بھر کی شکایتیں کرنا اِن کا مقصد ہے۔ یا وہ کوئی Solution لے کر بیٹھے ہیں جو اس کو بتانا چاہتے ہیں۔ دونوں کی بے کار اور بے نتیجہ بحث سے تنگ آ کر آخر کار وہ بول ہی پڑا۔

''اماں آپ پریشان نہ ہوں۔ میں کوشش کرتا ہوں کہ کسی طرح سے اُسے الٹراساؤنڈ کے لیے تیار کرلوں۔ اب روز روز کی زبردستی بھی اچھی نہیں ہوتی۔''

''تمہاری اسی غیر ضروری نرمی نے اسے ہمارے سر پر بٹھا دیا ہے۔ لحاظ نہیں کرتی وہ ہمارا۔'' حامد حسین نے جیسے عورتوں کو بھی مات کر دیا اور جلتی پر بہت سارا تیل ڈالنے کی حتی الامکان کوشش کی۔

''ارے تم دیکھو تو سہی، ایسے چلاتی ہے جیسے کہیں کی گورنر لگی ہو۔''

یاور ساری شکایتیں سُن کر بندہ بشر ہونے کے ناتے ماں باپ کے زیر اثر آ ہی گیا۔ اُس کی آنکھوں سے جیسے غصے کی لپٹیں نکل رہی تھیں۔ اسے یہ سُن کر واقعی بہت غصہ آیا تھا کہ اس کی غیر موجودگی میں ایمن اس کے ماں باپ کے ساتھ زبان چلاتی ہے۔ بدتمیزی کرتی ہے۔ پھر بھی اُس نے خود کو سنبھال کر جیسے کہ اس کی عادت تھی کہ وہ کم بولتا تھا سنتا زیادہ تھا اور اس کی اس خوبی کا اس کے ماں باپ ناجائز فائدہ اٹھاتے چلے آ رہے تھے۔ وہ بولا۔

''اماں میں اِس سے بات کرتا ہوں اور میں اُس کو وارننگ دے دیتا ہوں کہ اگر اُس نے آئندہ میرے ماں باپ کے ساتھ بدتمیزی کی تو اچھا نہیں ہوگا۔''

''ارے بیٹا! اچھا نہیں ہوگا کا مطلب بھی بتا دینا۔'' فردوس برجستہ بولیں اور اپنے شوہر کی طرف دیکھا جیسے انہیں اِشاروں اِشاروں میں کہہ رہی ہوں کہ وہ بھی تو کچھ بولیں کہ اچھا نہیں ہوگا، کی تفسیر کیا ہو سکتی ہے؟

''ہاں ہاں بتا دینا اُس کو، ہمیشہ کے لیے بٹھا دیں گے اُس کے باپ کے گھر میں، لڑکیوں کی کمی نہیں ہے ہمیں۔ اللہ کا شکر ہے۔ اپنا مکان ہے۔ ایک ہی بچہ ہے ہمارا۔'' فردوس نے اپنے شوہر کی نظروں ہی نظروں میں بلائیں لیں اور اُن کی بہادری کی داد دی کہ جو بیٹے کے سامنے ذرا تکلف کر جاتی تھیں۔ مگر حامد حسین ہمیشہ مردہ بولے کفن پھاڑ کے بولے کے مصداق بات کرتے تھے۔ اُن کو اپنے شوہر کی بڑی مورل سپورٹ رہتی تھی۔ اُن کے بغیر تو وہ کہیں جاتی ہی نہیں تھیں۔ جو کمی کسر اُن سے رہ جاتی تھی۔ وہ حامد حسین ہی پوری کیا کرتے تھے۔ یاور بے زار سے انداز میں اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔

''اماں میں چلتا ہوں۔ کھانا وانا کھا کر میں اس سے بات کرتا ہوں۔ بہت بھوک لگ رہی ہے۔''

''ہاں ہاں بیٹا، پہلے کھانا کھاؤ بعد میں اِس سے ذرا اچھی طرح نمٹ لینا۔ لیکن بیٹا نمٹنا ضرور۔ ورنہ کل صبح پھر ہماری شامت آ جائے گی۔ تمہارے سامنے گھنی بنی رہتی ہے اور تمہاری پیٹھ پیچھے وہ کس طرح بات کرتی ہے۔ تم سوچ نہیں سکتے۔''

فردوس نے جاتے جاتے یاور کو پکا کرنے کی کوشش کی۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ اُس کی شکل دیکھتے ہی وہ ماں باپ کا پڑھایا ہوا سارا سبق ہی بھول جائے۔ اس لیے نکلتے نکلتے مزید تاکید کی ضرورت محسوس ہوئی تھی۔

یاور کچھ نہیں بولا، خاموشی سے دروازہ کھول کر نکلنے لگا۔ فردوس اُسے سنانے کے لیے بڑبڑانے لگی۔ بظاہر وہ حامد حسین سے کہہ رہی تھی۔

''ارے میرا ہیرے جیسا بیٹا...... آج بھی میرے بیٹے کو ایسی لڑکی مل سکتی ہے کہ دنیا دیکھے۔''

حامد حسین اپنی بیوی کی ہمیشہ کی طرح تائید کر رہے تھے۔ رعشہ کے مریض کی طرح گردن مسلسل ہل رہی تھی۔

☆......☆......☆

ایمن اپنی دونوں بچیوں مہوش اور ماہ پارہ کو بیڈ پر لیے بیٹھی تھی۔ دونوں کے سامنے بکس اور نوٹ بکس بکھری ہوئی تھیں۔ دونوں بچیاں بہت محویت اور توجہ سے ہوم ورک کرنے میں مگن تھیں۔

ایمن گاؤ تکیے کے سہارے بیٹھی تھی کیونکہ ساتواں مہینہ ختم ہونے کو تھا۔ وہ زیادہ دیر بیٹھ نہیں پاتی تھی۔ اس کے ہاتھ میں بڑی بیٹی مہوش کی کوئی بک تھی۔ وہ اس بک میں محو تھی کہ یاور دھڑ سے دروازہ کھول کر اندر آیا۔

دروازہ کھلنے کا انداز و آواز اتنی غیر معمولی تھی کہ ایمن کا دل دھک کر کے رہ گیا۔ اس کے ذہن میں پہلا خیال تو یہی آیا کہ جیسے اُس کے ساس سُسر نازل ہوئے ہیں۔ کیونکہ یاور نے آج تک اس انداز میں دروازہ نہیں کھولا تھا۔ اُس نے سر اٹھایا تو سامنے یاور تھا۔

اُس کی آنکھوں سے جیسے شعلے لپک رہے تھے۔ اُس کی مٹھیاں بھچی ہوئی تھیں جیسے خود کو بڑی مشکل سے کنٹرول کر رہا ہو۔ ایمن اُس کی یہ کیفیت دیکھ کر حواس باختہ ہو گئی اور خود کو سنبھالتے ہوئے بیڈ سے نیچے اُترنے لگی۔

وہ پوچھنا چاہتی تھی کہ کیا ہوا ہے؟ کیوں سر سے پاؤں تک آگ بنا ہوا ہے؟ ابھی یہ سب کچھ اس کے ذہن میں ہی تھا اور وہ بستر سے اُتر بھی نہ پائی تھی کہ یاور نے پوری قوت سے اُس کے رخسار پر زوردار تھپڑ رسید کیا۔ ایمن گرتے گرتے بمشکل سنبھلی تھی۔ اب وہ کھسک کر بیڈ کے اوپر چڑھ گئی اور اپنے رخسار پر ہاتھ رکھ کر حیران پریشان بلکہ ہکا بکا یاور کی شکل دیکھنے لگی۔

''تمہیں پتا ہے کہ ماں باپ کیا ہوتے ہیں؟ تمہارے ماں باپ نے تمہیں یہ تمیز سکھائی ہے؟ آج تم نے امی ابو سے اتنی بدتمیزی سے بات کی کہ وہ وہاں بیٹھی رو رہی ہیں۔''

ایمن آنکھیں پھاڑے سکتے کی کیفیت میں یاور کی شکل دیکھ رہی تھی۔ دونوں بچیاں اپنی کاپیاں، کتابیں، ہوم ورک سب کچھ بھول بھال بستر سے اُتر کر دور دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑی ہو گئی تھیں اور خوف سے تھر تھر کانپ رہی تھیں۔ کیونکہ انہوں نے بھی پیدا ہونے کے بعد یہ منظر پہلی دفعہ دیکھا تھا کہ اُن کے باپ نے اُن کی ماں پر ہاتھ اٹھایا تھا اور اتنی زور سے چلایا تھا۔

بچیوں کے لیے یہ کیونکہ بالکل نیا واقعہ تھا۔ اس لیے بھی وہ کچھ زیادہ ہی بدحواس اور خوف زدہ تھیں۔

''میں نے اُن سے کوئی بدتمیزی نہیں کی۔'' ایمن نے بمشکل اپنی سانس کنٹرول کرتے ہوئے اٹک اٹک کر یاور کو جواب دینے کی کوشش کی۔ چند لمحے اُس نے رُک کر اپنی سانس کو کنٹرول کیا۔ بڑی مشکل سے خود کو سنبھالا۔ یاور ابھی تک اس کو خار کھانے والی نظروں سے گھور رہا تھا۔

''یاور میں نے صرف الٹرا ساؤنڈ کروانے سے منع کیا ہے۔ میں نے اُن کے ساتھ کوئی بدتمیزی نہیں کی اور الٹرا ساؤنڈ کروانا میرا مسئلہ ہے اُن کا نہیں۔''

''یہ اُن کا بھی مسئلہ ہے۔ اُن کے بھی خواب ہیں۔ میں اُن کا بیٹا ہوں۔''

''تو پھر آپ اپنے ٹیسٹ کرالیں جا کر...... کیا پتا کہ آپ کے ہی ٹیسٹ سے پتا چل جائے کہ بیٹا کیوں نہیں ہوتا۔''

یاور نے آگے بڑھ کر دوسرا تھپڑ ایمن کے رخسار پر لگانے کے لیے ہاتھ بلند ہی کیا تھا کہ ایمن نے دونوں ہاتھوں سے اس کا ہاتھ پکڑلیا اور اُس کی آنکھوں میں گھورتی ہوئی بولی۔

''کچھ اپنی عقل سے بھی کام لیں۔ دودھ پیتے بچے نہیں ہیں۔ جانتے ہیں کہ اکثر ساسوں کو بہو کانٹے کی طرح دماغ میں چبھتی رہتی ہے۔ جتنے پیار محبت سے بہولے کر آتی ہیں اتنی ہی شدت سے وہ بہو سے نفرت بھی کرسکتی ہیں۔ کم از کم اتنا تو پوچھ لیں انہوں نے کیا بات کی، میں نے کیا بات کی، بچیوں کو یہ سبق سکھا رہے ہیں اور مجھے کہہ رہے ہیں کہ میرے ماں باپ نے تمیز نہیں سکھائی۔'' ایمن جیسے پھٹ پڑی تھی۔ ضبط کی حد ہوگئی تھی۔

یاور بھی ایک لمحے کے لیے چکرا کر رہ گیا۔ کیونکہ اُس کے سامنے تو وہ ایمن تھی۔ جو جی، ہاں، نہیں سے زیادہ بات نہیں کرتی تھی۔ اُس نے ایک جھٹکے سے اپنا ہاتھ ایمن کے ہاتھوں سے چھڑایا۔

''کیا کہنا چاہتی ہو؟ میں جانور ہوں؟ بے حس ہوں؟ میرے ماں باپ غلط ہیں؟ ظالم ہیں؟ جھوٹ بولتے ہیں؟ تم کچھ بھی کہو...... لیکن تم میرے ماں باپ سے بڑھ کر نہیں ہوسکتیں۔ میں تم جیسی ہزار عورتیں اپنے ماں باپ پر قربان کرسکتا ہوں۔ پھر بھی کہہ رہا ہوں کہ آج کے بعد تم نے اماں سے یا ابا جان سے بدتمیزی کی تو میں تمہارا گلا دبا دوں گا۔''

ماں باپ نے تو غصے کی آگ اس کے اندر دہکا ہی دی تھی لیکن ایمن نے آج اُس کے سامنے زبان کھولی تو گویا وہ اپنے ہوش وحواس ہی کھو بیٹھا تھا۔ ایمن بچیوں کو کتابیں سمیٹتے ہوئے بڑی آہستگی سے بولی۔

''گلا نہ دبائیں تیل چھڑک کر آگ لگادیں۔ مشہور کردیں، چولہا پھٹ گیا تھا، جل کے مرگئی۔ ایسا ہی کرتے ہیں نا؟ ایسا ہی ہوتا ہے۔ آج مجھے بھی سمجھ آگیا ہے کہ چولہے کیوں پھٹتے ہیں؟ اور ہمیشہ بہو ہی جل کر مرتی ہے۔ میرے ماں باپ نے تو مجھے بہت کچھ سکھایا تھا۔ لیکن آج آپ اِن بچیوں کو جو سکھا رہے ہیں۔ اُس کی ذمہ داری آنے والے وقت میں آپ پر ڈالی جائے گی۔ صرف مجھ پر نہیں۔''

بچیاں اب چیخ چیخ کر رونے لگی تھیں۔ چونکہ وہ دیکھ رہی تھیں کہ کسی بھی لمحے اُن کا باپ اُن کی ماں پر حملہ کرسکتا ہے۔ اُن کے چلا چلا کر رونے سے اتنا تو ہوا کے یاور دو قدم آگے بڑھنے کی بجائے دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔ پھر بڑبڑاتے ہوئے کمرے سے نکل گیا۔

''اماں ٹھیک کہتی ہیں۔ بہت منحوس عورت ہے۔''

ہر طرف آگ لگی ہوئی تھی۔ ایمن نے بڑے کرب سے اپنی آنکھیں موندلیں۔ چند قطرے اُس کے رخسار پر پھسل آئے۔ آج اُس نے ہمت تو کرلی تھی لیکن اُسے پتا تھا کہ ایک نئی جنگ کا آغاز ہو چکا ہے۔

☆......☆......☆

چمن واش روم میں تھی۔ بانو آپا نے کمرے کا دروازہ بہت آہستگی سے کھول کر سر اندر کر کے پورے کمرے کا جائزہ لیا۔ جب انہیں اطمینان ہوگیا کہ چمن واقعی کمرے میں نہیں ہے، تو وہ چوروں کی طرح اندر چلی آئیں۔ بہت ہی آہستگی سے دروازہ بند کردیا۔

اُس کے بعد آہستہ آہستہ چلتی ہوئی واش روم کے دروازے تک پہنچیں اور دروازے سے کان لگا کر اندازہ

لگانے کی کوشش کی کہ چمن کے آنے میں کتنی دیر ہے۔ پھر جیسے شاور سے پانی گرنے کی آواز نے اُن کو مطمئن کر دیا کہ چمن کا بہت جلدی باہر آنے کا کوئی امکان نہیں۔ پھر انہوں نے سکون کا گہرا سانس لیا۔ ہونٹوں پر معنی خیز دبی دبی سی مسکراہٹ تھی۔ جیسے وہ جس مشن پر ہوں اور اس مشن میں کامیابی کا انہیں پورا یقین ہو۔ انہوں نے اپنی بند مٹھی کھولی اور ہتھیلی پر تعویذ نہ ہوا لہ دین کے چراغ والا جن ہو۔ جو پلک جھپکتے میں ہی وہ کچھ کر دکھائے گا جسے خواب میں دیکھا جا سکتا ہے۔ یا خیال میں سوچا جا سکتا ہے۔

پھر انہوں نے ایک دم چونک کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ انہیں ایک دم خیال آ گیا کہ وہ وقت ضائع کر رہی ہیں۔ جلدی سے انہوں نے ایمن کے بیڈ کا گدا اونچا کرنے کی کوشش کی، پوری قوت سے زور لگا کر وہ گدا اوپر اٹھانے کی کوشش کر رہی تھیں کیونکہ تعویذ انہیں گدے کے نیچے دبانا تھا۔ بابا جی کی یہی تاکید تھی۔

ایک تو بڑھاپے کی منزلیں، اس پر سے اتنی زور آزمائی کا کام...... انہوں نے کئی مرتبہ گدا اوپر کرنے کی کوشش کی اور وہ دھڑام کر کے گر پڑا۔ گدے کے گرنے سے کمرے میں ہلکی سی آواز تو پیدا ہوئی جس سے وہ گھبرا بھی گئیں۔ لیکن مشن اتنا اہم تھا کہ اس وقت جیسے انہوں نے سر پر کفن باندھ لیا تھا۔ ہر خطرہ مول لینے کے لیے تیار تھیں۔ یہاں تک سوچ لیا تھا کہ اگر چمن نے دیکھ بھی لیا تو وہ دو دو ہاتھ کر لیں گی۔

لیکن آج یہ کام مکمل کر کے ہی رہیں گی۔ کیونکہ اب دن کاٹے نہیں کٹتے تھے۔ انہوں نے دونوں ہاتھوں سے گدے کو اونچا کیا اور کندھے سے بھی اُس کو سہارا دینے کی کوشش کی اور ہاتھ گدے کے نیچے کر کے تعویذ ایسی جگہ پر رکھنے کی کوشش کی جہاں سے وہ اِدھر اُدھر نہ ہو سکے۔

ابھی انہوں نے تعویذ والا ہاتھ اندر ہی کیا تھا کہ گدا پھر اُن کے ہاتھ سے چھوٹ گیا...... اُن کے منہ سے ایک انتہائی بلند چیخ نکلی تھی۔

چیخ اتنی باقوت اور زوردار تھی بلکہ دل ہلا دینے والی تھی کہ چمن جو باتھ گاؤن لپیٹ چکی تھی۔ حواس باختہ سی دروازہ کھول کر گرتی پڑتی باہر آئی۔ اُس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ بانو آپا کا ہاتھ گدے کے نیچے دبا ہوا تھا اور وہ گدا اونچا کرنے کی اور ہاتھ باہر نکالنے کی بری طرح جدوجہد کر رہی تھیں۔

چمن کی سمجھ میں کچھ نہ آیا، وہ تیزی سے دوڑتی ہوئی اُن کے قریب پہنچی اور پوری قوت سے گدے کو اوپر اٹھایا۔ گدے کا ذرا سا ہی اوپر اٹھنا بہت تھا۔ بانو آپا نے ایک جھٹکے سے اپنا ہاتھ کھینچ لیا اور چمن کی طرف سے اپنا رُخ پھیر کر اپنا بازو سہلانے لگیں۔ جس میں اب درد کی ٹیسیں اُٹھنے لگی تھیں، پھر دھپ سے بیڈ پر بیٹھ گئیں۔

''امی جان کیا کر رہی تھیں آپ؟ گدے کے نیچے ہاتھ کیسے دب گیا؟'' چمن کو کچھ سمجھ ہی نہیں آ رہی تھی کہ مسئلہ کیا ہے؟ اول تو بانو آپا اس کے کمرے میں آتی ہی نہیں تھیں اور آج آئیں تو گدے کے نیچے ہاتھ دے بیٹھیں۔

بانو آپا برا سا منہ بنا کر اُٹھ کھڑی ہوئیں درد اپنی جگہ پر...... مگر دل میں تو خوشی تھی کہ آخر کار وہ تعویذ دبانے میں کامیاب ہو گئیں۔ اب بھلے سے چمن ہزار سوال جواب کرتی رہے۔ وہ اپنا بازو سہلاتے ہوئے بولیں۔

''ارے میں تم سے...... کیا کہنے آئی تھی...... بھول ہی گئی۔ اندر آئی تو چادر لٹک رہی تھی۔ میں گدے کے نیچے دبانے لگی۔ ارے بھئی مجھے لٹکتی ہوئی چادریں بڑی بری لگتی ہیں، پھر یہ بھی سوچا اتنے میں تم بھی باہر آ جاؤ گی۔''

چمن کی سمجھ میں کچھ نہ آیا وہ عجیب سی نظروں سے بانو آپا کو دیکھ رہی تھی۔ اُس کی موجودگی میں ہل کر پانی کا گلاس تو اُٹھاتی نہیں ہیں، آج اتنی محبتیں آ رہی تھیں۔ اس کے کمرے کی چادر ٹھیک کرنے لگیں۔ اس کی عقل سے

بعید تھا سب کچھ۔ لیکن اُسے معلوم تھا کہ خاموش رہنا ہی مناسب ہے۔ تعویذ کی طرف تو اُس کا ذہن بھی نہیں جاسکتا تھا۔ کیونکہ اُس نے اس طرح کے کام نہ کبھی کیے تھے نہ کسی کو کرتے دیکھا تھا۔

''جی امی جان کچھ یاد آیا، آپ مجھے کیا کہنے آئی تھیں؟'' چمن کا دماغ اُس جگہ اٹک گیا تھا کہ آخر کیا ایسی ضروری بات تھی کہ بانو آپا باقاعدہ چل کر اس کے کمرے میں آئی تھیں۔

''ارے ہٹاؤ! جب یاد آجائے گا تب بتادوں گی۔ اِس وقت تو میرا بازو درد کر رہا ہے۔'' وہ ہائے ہائے کرتی ہوئی کمرے سے باہر جانے لگیں۔ چمن ابھی بھی حیران پریشان، اُلجھی اُلجھی اُن کی طرف دیکھ رہی تھی۔ وہ کتنا بھی غور کرتی سمجھ تو کچھ نہیں آنا تھا۔ اُس نے چند لمحے بعد بڑی گہری سانس کھینچی اور بے معنی سی مسکرائی تھی۔

☆......☆......☆

ایمن، چمن کی ماں عطیہ بیگم اپنے شوہر مشکور احمد سے بڑے دل گرفتہ انداز میں بات کر رہی تھیں۔

''سمجھ میں نہیں آتا مشکور صاحب، کیا کروں۔ ایمن کی طرف سے بہت فکرمند ہوں۔ ایک تو میری بچی سیدھی سادی ہے۔ اور اس کی ساس...... توبہ توبہ مجھے تو یوں لگتا ہے کہ میرے دماغ نے کام کرنا بند کر دیا ہے۔ کچھ سجھائی نہیں دے رہا۔''

مشکور احمد جو باہر سے سودا سلف لے کر آئے تھے۔ تھکے تھکے انداز میں بیٹھے تھے۔ اُسی انداز میں گویا ہوئے۔

''جب دماغ کام کرنا بند کر دے اور دور دور تک سامنے کوئی راستہ نظر نہ آئے، چاروں طرف اندھیرا محسوس ہو تو ایسے وقت میں صرف اور صرف اللہ کو یاد کرتے ہیں، اِس کو پکارتے ہیں، اُس سے مدد مانگتے ہیں۔'' انہوں نے ایک سچے مسلمان کی حیثیت سے بیگم کو بھرپور اُمید دلانے کی کوشش کی۔

''آپ کی بات ٹھیک ہے مشکور صاحب مگر ایمن بتا رہی تھی اِس کی ساس اب تو کھلم کھلا بیٹے کی دوسری شادی کی بات کرتی ہیں۔''

''ارے بھئی باتیں کرتی ہیں ناں؟ اور تم بات سُن کر ہی پریشان ہو۔ جو ہونا ہوتا ہے اللہ کے حکم کے بغیر نہیں ہوتا۔ انسان بہت کچھ سوچتا ہے لیکن ہوتا تو وہی ہے جو مشیتِ ایزدی ہوتی ہے۔'' مشکور احمد اسی طرح بڑے وقار، حوصلے اور ایمان کی مضبوطی کا مظاہرہ کر رہے تھے۔

''میری بیٹی بہت پریشان ہے۔ میں ماں ہوں۔ یہی تو فرق ہوتا ہے ماں اور باپ میں۔ باپ کا دل مضبوط ہوتا ہے۔ مگر ماں...... ماں کا دل بہت کمزور ہوتا ہے۔''

''اللہ کی طرف سے آزمائشیں آتی ہیں اور انسانوں پر آتی ہیں۔ مویشیوں ڈنگروں پر نہیں آتیں۔ حوصلے سے کام لینا چاہیے۔ اندازوں اور واہموں میں کھیلنا کوئی عقلمندی ہے۔ پتا نہیں اس دنیا میں روزانہ کیا کچھ ہوتا ہے۔ ہم تک ساری خبریں تو نہیں آتیں اور نہ ہی ہم اکیلے اس دنیا میں دُکھیارے اور پریشان ہیں۔ میں نے تو کبھی بیٹی کی آمد پر کوئی اُداسی یا دُکھ محسوس نہیں کیا۔ کیونکہ میں نے یہ حدیث پڑھی ہوئی ہے کہ جس شخص نے بیٹیوں کو اللہ کی رحمت جان کر خوش آمدید کہا۔ اُن کی اچھی طرح دیکھ بھال کی اور اُن کو اُن کے حقیقی ٹھکانوں تک پہنچایا تو قیامت کے روز وہ اللہ کے رسول ﷺ کے قریب کھڑا ہوگا۔ اتنا قریب کے جیسے آپؐ نے اپنی انگلیوں کو جوڑ کر اشارہ کیا تھا اتنا قریب......

میں دعا کرتا ہوں اللہ ایمان کے راستے پر استحکام اور استقامت عطا فرمائے (آمین)۔''

عطیہ بیگم نے اپنے مضبوط حوصلہ اور مضبوط کردار شوہر کی طرف بڑے رشک سے دیکھا تھا اور دل ہی دل میں رب سے دعا مانگی تھی کہ یا اللہ مجھے بھی اتنا حوصلہ مند باہمت اور صاحب ایمان بنادے (آمین)۔

گہری اور ٹھنڈی سانس لے کر بڑی اُداس مسکراہٹ کے ساتھ مشکور احمد کی طرف دیکھتے ہوئے کہنے لگیں۔

''آپ جیسے مرد تو بہت کم ہوتے ہیں مشکور صاحب، حالانکہ ایسا ہی ہونا چاہیے۔ اللہ کی دی ہوئی قوت ہے جو انسان اچھا سوچتا ہے یا برائی سے بچتا ہے۔ نظامِ قدرت میں دخل اندازی کرنا اپنے آپ پر ظلم کرنا ہے۔ کاش لوگ اتنی سی بات سمجھ جائیں، آمین۔'' عطیہ بیگم نے بڑی دل سوزی سے کہا تھا۔ پھر اسی طرح اُداس کیفیت میں بولیں۔

''ظالم تو جب اپنا کیا بھگتیں گے تب بھگتیں گے مجھے تو ہر وقت ایمن کا خیال آتا ہے کہ ایسے ماحول میں وقت کیسے کٹتا ہوگا۔ کہہ رہی تھی ساس ہر وقت کچھ نہ کچھ سُناتی رہتی ہیں۔'' مشکور احمد بے معنی سا مسکرائے۔

''ہاں کمال کی بات یہ ہے کہ ایسی ساسوں سے کوئی یہ سوال نہیں کرتا کہ بھئی آپ کیوں لڑکی پیدا ہوئی تھیں۔ اگر آپ کے اختیار میں تھا تو آپ کو لڑکا بن کر اِس دنیا میں تشریف لانا چاہیے تھا۔''

وہ یہ بات کہہ کر خود ہی ہنس دیے۔ عطیہ بیگم بھی شوہر کا دل رکھنے کے لیے مسکرانے لگیں۔

☆......☆......☆

افشاں کا معمول تھا۔ وہ سودا سلف لینے کے بہانے کسی بھی وقت ناشتے کے بعد گاڑی لے کر بانو آپا کے پاس آجاتی تھی۔ گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ اُن کے پاس بیٹھتی تھی۔ دونوں ماں بیٹی دل کے پھپھولے پھوڑتی تھیں۔ وہ اپنے سسرال کے رونے سناتی، بانو آپا اپنی بہو کی ستم ظریفیاں اِس انداز میں بیان کرتیں کہ افشاں کا خون کھولنے لگتا۔ اُس طرف منہ کر کے جلی کٹی کچھ سنا ہی دیتی تھی جس طرف چمن کی موجودگی کا یقین ہوتا تھا۔

چمن کو اپنے کمرے میں ہی پتا چل جاتا تھا کہ افشاں نازل ہو چکی ہے۔ اور وہ جب صبح ہی صبح اِس طرح آتی تھی تو بچے اُس کے ساتھ نہیں ہوتے تھے۔ کیونکہ بچے اسکول جاتے تھے۔ وہ جان بوجھ کر ماں بیٹی کے سامنے آنے سے گریز کرتی تھی۔ کوئی کام لے کر بیٹھ جاتی تھی۔ کوئی کتاب پڑھنے لگتی تھی۔ البتہ اگر کبھی بانو آپا بلند آواز سے اُسے کہتی تھیں کہ افشاں اور اُن کے لیے چائے تیار کرلے اور ساتھ میں کچھ کھانے کے لیے بھی لے آئے، تو وہ طوعاً کرہاً کمرے سے باہر آکر چائے بنا کر نند کا منافقانہ سلام قبول کر کے واپس اپنے کمرے میں جالیٹتی تھی۔

اس وقت بھی وہ اپنے کمرے میں تھی۔ اور وہ دونوں ماں بیٹی لاؤنج میں کھسر پھسر کر رہی تھیں۔

''بیٹی بس کرو! وہ تو جورو کا غلام بنا بیٹھا ہے۔ جب بھی اُس سے کوئی بات کرو اُسی کی حمایت شروع کر دیتا ہے۔'' بانو آپا اپنے بیٹے ثمر کا بیٹی کے آگے رونا رو رہی تھیں۔

''تو اماں جان آپ بابا جی سے بات کر کے کوئی تعویذ لے آئیں نا کہ بھائی کے دل سے ہی نکل جائے یہ عورت۔'' افشاں نے بہت تلخ لہجے میں بری طرح جل بھن کر ماں کو کان میں مشورہ دیا تھا۔

''بابا جی نے پانی پر دم کرنے والا ایک عمل دیا ہے۔ میں تو بہانے بہانے سے پھونک کر پانی پلاتی رہتی ہوں۔ ایک دن یہ عمل رنگ لائے گا۔ تھوڑے ہی دنوں کی بات ہے۔ اب اتنا تو صبر کرنا پڑے گا۔ آخر تین سال سے جھیل رہے ہیں، پانچ منٹ میں تو کام ہونے سے رہا۔''

بانو آپا نے بیٹی کو دلاسہ دیا۔ کیونکہ بیٹی اُن کا دُکھ سن کر دُکھی ہو جاتی تھی۔ تو اُن کو بھی ٹینشن ہوتی تھی کہ میری

وجہ سے بچی پریشان ہوگئی۔

افشاں نے اپنا منہ بانو آپا کے بالکل قریب کرلیا تھا۔ کیونکہ وہ بڑے راز کی بات کرنے جارہی تھی اور احتیاط کررہی تھی کہ چمن کو کہیں کوئی سن گن نہ مل جائے۔ اور وہ زندگی کے کسی موڑ پر اسے بلیک میل کرنا نہ شروع کردے۔

''امی میری بڑی نند جو گلبرگ میں رہتی ہے ناں۔'' بانو آپا نے ایک دم سینے پرزور سے ہاتھ مارا۔

''آئے ہائے کیا ہوگیا اُن کو۔'' افشاں نے گہرا سانس لے کر ذرا وقفہ کیا پھر مسکرائی۔

''توبہ ہے امی! پوری بات تو سُن لیا کریں، پہلے سے پریشان ہوجاتی ہیں۔ اُنہیں کچھ نہیں ہوا پچھلے دنوں اُن کے بیٹے کی سال گرہ تھی۔ ہم سب وہاں گئے تھے۔ اُن کے پڑوس میں ایک بہت اچھی فیملی آئی ہے۔ ایک لڑکی ہے اُن کی، بے چاری جوانی میں ہی بیوہ ہوگئی۔ اتنی پیاری ہے امی، آپ اُسے دیکھیں گی تو دیکھتی رہ جائیں گی۔ جیسے کوئی تصویر ہاتھ سے بنی ہوئی۔'' بانو آپا نے اتنی تعریفیں سُن کر بے ساختہ پھڑک کر کہا۔

''آئے ہائے سچ کہو!'' افشاں نے ماں کو اشارہ کیا کہ آہستہ بولیں۔

''امی میں آپ کو دکھاؤں گی۔'' وہ سرگوشی میں بولی۔

''ہاں، ہاں ضرور دکھانا۔ بیوی ہی ہے، بچہ وچہ تو نہیں ہے۔ بھئی اب دیکھو نا پرایا بچہ پالنا کوئی آسان تو نہیں ہوتا نا۔ ٹھیک ہے کم عمر ہے، خوبصورت ہے، سب کچھ ہے مگر بچے والی نہیں۔ نا بابا نا......'' بانو آپا نے قطعی اور فیصلہ کن انداز میں کہا تھا۔

''امی جان آپ پوری بات تو سُن لیں۔ بچہ وچہ نہیں ہے اُس کا، اکیلی ہے۔ بے چاری بہت جلد بیوہ ہوگئی تھی۔ پتا نہیں سال بھی ہوا تھا یا نہیں۔'' افشاں نے وضاحت سے بتایا۔

''کل کسی طرح سے آپ میرے گھر آجائیں، میں آپ کو لے کر چلتی ہوں۔ لڑکی دیکھ لیں۔ اس کے بعد کوئی لڑکی آپ کو اچھی نہیں لگے گی۔'' بانو آپا نے بڑی بے تابی سے مگر منہ بنا کر اس طرف دیکھا جس طرف چمن کا کمرہ تھا اور بولیں۔

''ہاں ابھی سے لڑکی دیکھ لوں۔ وہ کیا کہتے ہیں مدعی ست گواہ چست، پہلے تمہارے بھائی کو تو قابو میں کروں۔ وہ تو اپنی ملکہ عالیہ کی شان میں بات سننا پسند نہیں کرتا۔ ابھی ذرا تعویذوں کا اثر ہونے دو تو لڑکی بھی دیکھ لیں گے۔ ایک تو اتنی دور ہے تمہاری نند، آسان ہے اُدھر جانا، شہر کا دوسرا سرا ہے۔ ویسے اُس کی عمر کیا ہوگی بیٹا؟'' بانو آپا نے سرگوشی میں پوچھا۔

''مشکل سے بائیس برس کی۔''

بانو آپا کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

''ہیں! صرف بائیس سال کی، شادی بھی ہوگئی...... اور بیوہ بھی ہوگئی...... اتنی سی عمر میں سب کچھ ہوگیا۔ آہ...... ہا...... ہائے ری قسمت۔'' افشاں نے بڑی مغموم اور افسردہ سی شکل بنا کر کہا۔

''جی امی جان! اللہ کی مرضی واقعی قسمت کی بات ہے۔ آج کل تو لڑکیاں پچیس پچیس سال کی عمر میں پڑھ کر فارغ ہوتی ہیں۔ یونیورسٹی سے نکلتی ہیں اور وہ بے چاری......'' بانو آپا کے منہ میں تو جیسے پانی آگیا۔

''اتنی خوبصورت بائیس سال کی لڑکی آئے ہائے، مزہ تو جب آئے وہ چمن کے ہوتے ہوئے اِس گھر میں

آ جائے۔ مگر پہلی بیوی کے ہوتے ہوئے کون بیٹی دیتا ہے، وہ اپنے ہی سوالات میں اُلجھ گئیں۔
افشاں نے گھڑی دیکھی پھر سامنے دیکھتے ہوئے بڑے طنزیہ لہجے میں بولی۔
''آپ کی بہورانی کو پتا تو چل گیا ہوگا کہ میں آئی ہوئی ہوں۔ توبہ! ایسی بھی بھابیاں ہوتی ہیں، بغیر کہے ایک کپ چائے کا بھی نصیب نہیں ہوتا۔''
''ارے تُو بیٹھ تو سہی، میں آواز دے کر بلاتی ہوں۔ چائے پی کر جانا۔''
''چھوڑیں امی جان! آوازیں دے دے کر چائے بنوائیں گی۔ لوگوں کو خود بھی تو پتا ہونا چاہیے۔ کوئی گھر آئے تو اُسے چائے پانی کا پوچھ لیں۔'' یہ جملہ اُس نے با آواز بلند کہا تھا تاکہ چمن کے گوش گزار ہو جائے۔ کسی طرح تو آخر دل کی بھڑاس نکالنا ہی تھی۔
مزہ ہی کیا جب نند بھاوج کو دو چار سنائے بغیر گھر چلی جائے۔ یہ تو ایسا ہی ہے جیسے لُوٹ بازار میں آ کر بھی خالی ہاتھ رہنا۔ دونوں ماں بیٹی آگے پیچھے چلتی ہوئی گیٹ کی طرف بڑھ رہی تھیں۔
بانو آپا کے چہرے پر انتہائی دکھ تھا۔ کیسی ظالم بہو ہے، اُن کی بیٹی کو چائے پانی تک کا نہیں پوچھتی۔ یا اللہ! اپنی جناب سے کوئی اور خدمت گزار، تابعدار بہو عطا فرما۔ جو پیارا سا پوتا بھی دے۔ آمین۔'' اُن کا رواں رواں دُعا کر رہا تھا۔

☆......☆......☆

فردوس اور حامد حسین دونوں لاؤنج میں بیٹھے ہوئے تھے۔ دونوں کے چہروں سے لگتا تھا کہ دونوں کا خون کھول رہا ہے۔ اور بس آتش فشاں پھٹنے ہی والا ہے۔ نظریں اُس طرف تھیں جدھر سے ایمن کو چائے لے کر آنا تھا۔
''انتہائی ست لڑکی ہے۔ پتا ہے کہ ہم دونوں کو اس وقت چائے چاہیے مگر یہ صرف جان جلانے کی وجہ سے دیر کرتی ہے۔ ہمیں احساس دلاتی ہے کہ ہم اُس کے محتاج ہیں۔'' فردوس بڑبڑائی تھی۔ دونوں میاں بیوی کا روٹین تھا کہ ناشتا تو وہ صبح یاور کے ساتھ ہی کر لیا کرتے تھے، پھر نو بجے وہ صرف چائے پیا کرتے تھے۔ ایمن بڑی پابندی سے نو بجے انہیں چائے بنا کر دے دیا کرتی تھی۔
اُس کی طبیعت بھی گری گری تھی اور کچھ یاور کا بدلہ ہوا رویہ بھی اُسے نڈھال کیے ہوئے تھا۔ بچوں کے اسکول جانے کے بعد اونگھ آ گئی تھی کیونکہ رات بھر تو سو نہیں سکی تھی۔ آنکھ کھلی تو ساڑھے نو بج رہے تھے۔ وہ گرتی پڑتی کچن میں آئی۔ جلدی جلدی چائے بنائی۔ چائے بنا کر لا رہی تھی کہ اُس نے ساس کی بڑبڑاہٹ سُن لی۔ دل بیٹھ گیا۔ اُسے پتا تھا کہ اب اُسے سامنے جا کر کیا کچھ نہیں سننا۔
بڑی ہمت کر کے وہ ٹرے اٹھائے لاؤنج میں داخل ہوئی۔ فردوس نے آگ برساتی نظروں سے اُسے دیکھا۔
''ارے بی بی! ایسی کیا محنت مشقت کراتے ہیں کہ ایک چائے کی پیالی بھی وقت سے نہیں دے سکتیں۔'' فردوس جیسے پھٹ پڑی۔
''سوری امی جان! وہ بس میں لیٹی تھی۔ طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ میری آنکھ لگ گئی۔ مجھے پتا ہی نہیں چلا۔'' ایمن سُسر کی گھورتی ہوئی نظروں کی تاب نہ لا کر بری طرح ہکلانے لگی۔

''واہ بھئی واہ تمہیں کام ہی کیا ہے؟ کپڑے دھونے کے لیے نوکرانی آتی ہے۔ جھاڑو، صفائی ستھرائی نوکرانی کرتی ہے۔ تم سے ایک ذرا کچن کا کام نہیں سنبھلتا۔ لے جاؤ اپنی چائے ہم خود بنا کر پی لیں گے۔ تم تو سمجھ رہی ہو تم چائے بنا کر نہیں دو گی تو ہمیں چائے نہیں ملے گی۔'' فردوس نے بری طرح لتاڑ دیا۔ حامد حسین نے بھی ایمن کی طرف گھورا۔ اُس کے چہرے پر پھیلی بے بسی نے بھی ضمیر پر کوئی تازیانہ لگایا نا ہی ان کے دل کو کچھ ہوا۔ بلکہ وہ بیگم سے بھی زیادہ گھن گرج کے ساتھ اُس پر چڑھ دوڑے۔

''ہمارے لیے آئندہ چائے لانے کی ضرورت نہیں، بس اپنی بیٹیوں کا خیال رکھا کرو۔'' ایمن کے ہاتھ میں چائے کی ٹرے کانپنے لگی تھی اُس نے جلدی سے اُس کو کارنر ٹیبل پر رکھ دیا تھا اور خود کو سنبھالتے ہوئے بولی۔

''صرف آج ہی تو لیٹ ہوئی ہے۔ کسی بھی انسان کی طبیعت خراب ہوسکتی ہے۔ میرا رات سے بی پی Low تھا۔'' وہ جیسے صفائی پیش کرنے لگی۔

''ارے بھئی ہمیں یہ قصے کہانیاں سنانے کی ضرورت نہیں۔'' حامد حسین نے فوراً غصے میں اُس کی بات کاٹ دی۔

''بس ہم نے کہہ دیا ہمیں تمہاری خدمتوں کی ضرورت نہیں۔ جاؤ جا کر اپنے کمرے میں آرام کرو۔'' فردوس نے بھی جیسے اپنے شوہر کی تائید کرتے ہوئے گردن ہلائی۔

''ایسی بدتمیز اور بدزبان لڑکی کے ہاتھوں سے چائے پینے یا کھانا کھانے سے تو بہتر ہے، زہر کھا کر مر جائیں۔''

ایمن کو یہ ہی مناسب سوجھا جتنی جلدی ہوسکے لاؤنج سے چلی جائے ورنہ اِن دونوں کی تقریر شاید ظہر تک ختم نہیں ہوگی۔ اُس نے جانے کے لیے قدم بڑھائے تو حامد حسین کی آواز نے اُسے روک لیا۔

''اور بہو بیگم ہمارے لیے رات کا کھانا بھی تیار کرنے کی ضرورت نہیں۔ ہم دونوں میاں بیوی معذور نہیں ہیں، اپنا کام کر سکتے ہیں، اپنا بوجھ خود اُٹھا سکتے ہیں۔'' ایمن کے لیے پلٹ کر دیکھنا محال تھا۔ وہ آہستہ آہستہ قدم بڑھاتی ہوئی اپنے راستے پر چلتی رہی۔ فوراً ہی فردوس کی آواز نے اُسے آلیا۔

''گھنی ہے گھنی شکل پر دیکھو کیسی مظلومیت ہے، جیسے پوری دنیا میں اس سے زیادہ دکھی اور مظلوم کوئی نہیں۔ اللہ جانے وہ گھڑی کون سی تھی کہ اللہ کا عذاب ہم پر اُترا تھا۔'' ایمن یہ سب کچھ سنتے سنتے اپنے کمرے میں پہنچ چکی تھی۔ حامد حسین نے اپنی بیوی کی طرف دیکھا۔

''ارے بیگم اب تم ہی اپنے مبارک ہاتھوں سے چائے کی ایک پیالی پلا دو۔ اس لڑکی کی شکل تو دیکھ کر ویسے ہی سر میں درد ہونے لگتا ہے اور آج تو یہ چائے بھی نہیں ملی۔'' وہ بیگم سے ڈلار و شکوہ دونوں کر رہے تھے۔ فردوس دونوں ہاتھوں سے اپنے گھٹنے پکڑ کر اُٹھ کھڑی ہوئیں۔

''ارے لا رہی ہوں! دو منٹ میں چائے بنتی ہے۔ یہ بھی کوئی بھاری کام ہے۔ آج کل تو لڑکیوں کا بس نہیں چلتا کہ ہم سے اپنی خدمت کرائیں۔ نوالے توڑ توڑ کر اُن کے منہ میں ڈالیں۔'' وہ زور زور سے بڑبڑاتی ہوئی کچن کی طرف جا رہی تھیں۔ ساتھ ساتھ یاور کے ہاتھوں ایمن کی دُرگت بنوانے کا طریقہ کار بھی سوچ رہی تھیں۔

(اس خوبصورت ناول کی اگلی قسط آئندہ ماہ ملاحظہ کیجیے)

افسانہ

دلشاد نسیم

مٹی کی قسمت

"مجھے تم سے محبت ہوگئی ہے چندا۔ میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔" وہ پڑھا لکھا سمجھدار آدمی دل سے کی گئی محبت کے سامنے کمزور پڑ گیا ہکلا کر بولا۔ "مطلب شادی کر کے ساتھ رکھنا چاہتا ہوں۔" چندا جواب تک آنکھوں سے روشنی کر رہی تھی، مسکرا دی......

دلشاد نسیم کے ترکش سے نکلا، ایک یادگار افسانہ

نام تو اس کا سلطانہ رکھا گیا تھا مگر ہاڑ کے مہینے میں آدھی رات کو جب دائی جنتے نے الٰہی بخش کے ہاتھوں میں سلطانہ کو دیا تو لگا سارے گھر میں روشنی ہوگئی۔ اس نے بیٹی کو پہلا نام چندا دیا، رانی وہ اپنے آپ ہی بن گئی۔ یوں وہ چندا رانی ہوگئی۔ ماں بال بنا کے آنکھوں میں سرمہ لگاتی تو سرمے کا ایک ٹیکہ کن پٹی پہ لگانا کبھی نہ بھولتی۔ باپ اسے دیکھ کر واری جاتا۔ آس پڑوس کی عورتوں کو اس نے بارہا یہ کہتے سنا کہ جوان ہوتے ہی بیاہ دینا، خوبصورت بیٹی کسی آزمائش سے کم نہیں ہوتی۔"

رہی سہی کسر اس نامراد شیشے نے پوری کر دی۔ سفید بے داغ چہرہ، اس پر فاختہ کی رنگت ایسی چمکیلی آنکھیں، تیکھی ناک پر غصہ اور ناک کی کیل ایک ساتھ رکھے رہتے۔ وہ جب ناک کو نخرے سے چڑھاتی، ناک پر رکھا خون کے قطرے جیسا سرخ رنگ کا لونگ خوب دمکتا۔

کھیتوں میں چوکڑی بھرتی چندا کو سرسوں کے پھول، گندم کی بالیاں بھی سر اٹھا کے دیکھتیں، جھومتیں تو چھوٹے سرکار کی جیپ کو بریک کیوں نہ لگتے۔

ابھی کل کی بات ہے محب رسول لندن سے ایم بی اے کی ڈگری لے کے لوٹا تھا۔ دس سال پہلے جب وہ گیا تھا، یہ سب کچھ ایسا نہیں تھا۔ چندا بھی بہت چھوٹی تھی۔ اس نے مارے حیرت کے اپنے پرانے ملازم سے کہا۔

"سبحان سب کتنا بدل گیا ہے۔" سبحان نے کمال لاپروائی سے کہا۔

"کہاں چھوٹے سرکار! کچھ بھی تو نہیں بدلا۔"

محب رسول اپنی بات پر قائم تھا۔

"تمہیں یاد ہے جب دس سال پہلے میں گیا تھا تو اسٹیشن تک ہم تانگے پہ گئے تھے، اب جب تم لینے آئے تو جیپ پر۔ پہلے زمین کے سینے پر ہل چلانے کے لیے بیل جوتا کرتے تھے اب ٹریکٹر۔ تمہیں یاد ہے ہمارے گاؤں میں تب صرف ایک اسکول تھا، وہ بھی بنا دیوار اور چھت کے۔"

سبحان نے اپنے کندھے سے صافے کو اتارا پھر واپس کندھے پہ رکھا اور بڑے فلسفیانہ انداز سے

بولا۔ ''چھوٹے سرکار جب مٹی کا رنگ نہیں بدلا، مٹی کی قسمت وہی ہے، تو کیسے کچھ بدل سکتا ہے؟''

محب رسول ایم بی اے کر کے آیا تھا، وہ بھی انگریزوں کے ملک سے، اُسے یہ باتیں کیسے سمجھ آتیں۔ اسے تو یہ پتا تھا کہ پن چکی کے سُر آج بھی اتنے ہی میٹھے ہیں جتنے وہ چھوڑ کے گیا تھا۔ نہر کا پانی ٹھنڈا اور سرسوں کے پھول زرد ہیں۔ وہ مٹی کے رنگ اور قسمت کے فلسفے کو کیسے سمجھتا۔

جب محب کی جیپ کی بریک لگی، ٹائر چرچرائے۔ وہ رکا تو اُس نے دیکھا چندا رانی نے رک کر مسکرا کے سلام کیا۔ دھوپ سے اس کا رنگ تانبے جیسا سنہری ہو رہا تھا۔ آنکھوں میں سورج کی کرنیں روشنی کی لکیریں بنا رہی تھیں، ایسے جیسے آنکھ نہ ہو شیشہ دھرا ہو۔ محب نے سجان کو دیکھا۔ وہ پرانا نمک خوار تھا۔ مالک کے تیوروں کی زبان خوب سمجھتا تھا کہنے لگا۔

''مزارعے بخشو کی بیٹی ہے چندا۔'' محب رسول مسکرا دیا۔ اُس نے بدلیس میں کتنا حسن دیکھا تھا مگر وہ ایسا نہیں تھا۔ معصوم، بے ضرر کھیتوں میں چوکڑیاں بھرتا......

''بہت خوبصورت ہے۔''

.........☆☆.........

محب رسول کو آئے ہفتے سے زیادہ ہو گیا تھا۔ صبح سویرے نہرے کنارے کیکر کی مسواک کرتے اور تب بھی جب ماں اپنے ہاتھ سے مکھن بلو کر اُس کی سوکھی روٹی پہ رکھ دیتی اور اور تب بھی جب گاؤں سرِ شام ہی رات کا چولا پہن لیتا، وہ لمحے کے کسی حصے میں بھی شیشے کی آنکھ والی چندا کو بھول نہیں پا رہا تھا، تب اُس نے بہت سوچ سمجھ کے ایک فیصلہ کیا کہ اُسے ماں سے بات کرنی چاہیے۔ اُس کی تعلیم بڑے چھوٹے، امیر غریب کے روایتی فرق سے آزاد تھی اسی لیے صبح جب ماں نے اپنے حنائی ہاتھوں سے سفید مکھن کا پیڑا محب رسول کی روٹی پہ رکھا تو اُس نے ماں کی سہاگ رنگ کی سرخ چوڑیوں والی کلائی تھام لی۔

''امی مجھے آپ سے ایک بہت کہنی ہے۔'' ماں کی پور پور ممتا بھری مسکراہٹ سے جگمگا اٹھی۔

''بولو میری جان۔''

''مجھے چندا اچھی لگی ہے، بخشو مزارعے کی بیٹی۔ بہت خوبصورت ہے وہ۔''

جانے کیا ہوا، ماں کا چہرہ بجھ گیا۔ اُن کی آنکھوں کے کنارے پر پڑی جھریوں کی لکیروں میں ایک لمحے میں کئی گنا اضافہ ہو گیا۔ وہ کچھ نہ بولیں تو محب رسول اُن کی خاموشی پر حیران رہ گیا۔

مگر جب اُس نے اِس بات کا تذکرہ سجان سے کیا، وہ بالکل حیران نہ ہوا۔ اِدھر ماں کے نیم انکار جیسی خاموشی نے محب کی دھیمی آنچ پہ رکھی محبت پر مٹی کے تیل کی چھینٹوں جیسا کام کیا۔ آگ یکدم بھڑک اٹھی۔

اُس نے سجان سے کہا کہ اُسے چندا سے ملنا ہے۔ اُسے بتانا ہے کہ مجھے اُس سے محبت ہو گئی ہے۔ اگر محبت ہو گئی ہے تو وہ اکیلا کیوں جلے۔ محب رسول کا نظریہ محبت چندا کی آنکھوں جیسا شفاف تھا۔ ماں کے کمرے کے دروازے کے پاس رکھے سنگھار میز کے آئینے کی طرح جس میں سے وہ بڑے سرکار کی چاپ تک سن لیا کرتی تھیں۔ سجان نوکر تھا۔ مالک کے بے زبان کتوں کی زبان سمجھنے والا...... مالک کی زبان کیسے نہ سمجھتا۔

''چھوٹے سرکار کب ملنا چاہیں گے؟''

''رات حویلی کے مہمان خانے میں لے آؤ۔'' اُس نے بظاہر عام سے لہجے میں کہا مگر جی سے وہ کتنا خوش تھا یہ کچھ وہی جان سکتا تھا۔ ایسا نہیں تھا کہ عورت اُس کے لیے کوئی پہیلی ہو۔ ایسا بھی نہیں تھا کہ اُس کا پہلو بے آباد رہا ہو مگر اس بار انوکھا سا تجربہ تھا۔ عورت ذات کے انتظار کا یہ ذائقہ اُس نے پہلی بار چکھا تھا۔ اُس کا دل بہت شور سے دھڑک رہا تھا۔

''رات کب ہو گی؟'' محب کو اپنے سوال پہ آپ ہی شرمندگی ہونے لگی وہ خجل سا ہو کے ہنس دیا۔

''یہاں تو جی بڑے سرکار کی مرضی سے رات ہوتی ہے۔''

محب محبت کے نئے سے نشے میں تھا۔ وہ سجان کی بات کی تلخی سمجھ نہ پایا۔ اُس نے تو ہمیشہ انسان کو انسان ہی سمجھا تھا۔ قانونِ قدرت کا زبردست حامی تھا، وہ خود کو کششِ ثقل اور دنیا کا سورج کے گرد گھومنے

پر یقین رکھنے والا معمولی انسان سمجھتا تھا۔ وہ کیا جانتا کہ سجان کے ہاں رات بڑے سرکار کی مرضی سے کیوں ہوتی تھی۔ سجان نے محب کے نشے پر ٹھنڈا ٹھار پانی ڈالا۔

''کتنے بجے؟''

محب نے گہری سوچ کے بعد کہا کہ رات گیارہ بجے اور یہ بھی کہ اُس کی عزت اور احترام میں ہرگز کمی نہ آئے، کوئی اُسے یہاں آتے دیکھ نہ لے۔'' اُس نے کہا ''میری تو خیر ہے مگر مجھے چندا کے ماتھے پہ رسوائی کا داغ گوارا نہیں؟''

..........☆☆..........

وقت بہت سست روی سے گزر رہا تھا۔ دن ڈھلا تو شام نے بیڑیاں پہن لیں۔ محب سورج کی ایک ایک کرن کو رات کا روپ بھرتے دیکھ رہا تھا۔ اس کا روں رواں 'کان' بنا ہوا تھا۔ جب ہی تو ماں کی تیسری پکار پر بھی اُس نے نہ سنا تو ماں نے اُسے کندھے سے پکڑ کر ہلایا، اُس کی خاموشی کو ماں نے اُس کی ناراضگی جانا اور بہت مُردہ آواز میں بولیں۔

''میں جانتی ہوں وہ بہت حسین ہے، رنگین بھی۔ پر میری جان ہمارا اُن سے مقابلہ نہیں ہے۔ سن میرے لعل! خاندانی وقار بھی کوئی چیز ہے عالی مرتبت چوہدری وقار احمد ولد رسول احمد ایک بے ضرر مٹی میں بیج بونے والے مزارعے کی بیٹی کو اپنے 'دستر خوان' کی زینت تو بنا سکتا ہے اپنی حویلی کی نہیں؟''

محب انسانیت کے اس فلسفے سے قطعی واقف نہیں تھا۔ سچ تو یہ تھا کہ اُسے ماں کی بات سمجھ ہی نہ آئی۔

..........☆☆..........

رات چڑھی، سوئی کی ٹک ٹک اور حویلی کے مہمان خانے کی خاموشی......

محب نے کتنے خیال باندھے۔ اس نے سوچا اُس کے بلاوے کو چندا نے کیا خیال کیا ہوگا؟ محب

کاہوجودڑو

میر پور خاص شہر کی ایک شمالی کالونی کے پاس قدیم تہذیبی آثار ملتے ہیں۔ جن کو ''کاہوجودڑو'' کہا جاتا ہے۔ 1889ء میں شادی پلی تک ریلوے لائن بچھانے تک خیال تھا کہ یہ بیکار مٹی کا ڈھیر ہے اور ٹھیکیدار یہاں سے مٹی اور اینٹیں نکال کر استعمال کرتے تھے۔ اسی دوران منقش اینٹیں اور دو مجسمے برآمد ہوئے جو بقول سر جیمس کیمبل دوسرے بدھ سکھی دور کی نمائندگی کرتے ہیں جس کا تعلق چھٹی صدی عیسوی کے پہلے نصف دور سے ہے۔ یہ علاقہ 25 سے 30 ایکڑ اراضی پر پھیلا ہوا ہے اور اس جگہ سے 15 تا 16 فٹ ایک قدیم اسٹیو پار پیتل کے سکے اور دیگر تاریخی اشیاء برآمد ہوئی ہیں جن میں سے اکثر میر پور خاص کے عجائب گھر میں محفوظ ہیں۔ لیکن عدم توجہی کے باعث یہ تاریخی مقام تباہ ہو چکا ہے اور لوگوں نے قبضہ کر کے یہاں مکانات بنا لیے ہیں۔

نے ارادہ کیا کہ وہ چندا کے آتے ہی کہہ دے گا اُس کا مقصد کچھ اور نہیں بس اپنی محبت کی خبر دینا ہے۔

''میں تمہیں یہ بتانا چاہتا ہوں تم مجھے اچھی لگتی ہو اور......لیکن۔''

محب ہڑبڑا گیا۔

''یہ سب کہنے کی ضرورت نہیں تھی۔ ہمت ہے تو مزارعے بخشو کی بیٹی کو بیاہ کے لا۔''

''مگر اب کچھ نہیں ہو سکتا۔ وہ آنے والی ہوگی۔''

وہ خود سے لڑتے لڑتے جھنجلا گیا۔

''محبت میں بلایا ہے۔ اِس میں حرج ہی کیا ہے۔'' اُس نے خود کو دلاسا دیا، تب ہی سجان نے

کمرے کے دروازے پر دستک دی۔

سبز اور سرخ بڑے بڑے پھولوں والی چنری اوڑھے چاند نے کمرے کو روشن کر دیا۔ چندا کی شیشے جیسی رنگین آنکھوں میں کمرے کے سارے بلب روشن ہو گئے۔ محب بے ساختہ مسکرا دیا۔ سبحان نے چھوٹے سرکار کو دیکھے بغیر کہا۔

''میں باہر ہوں۔'' سبحان چلا گیا اور گہری چپ چھوڑ گیا۔ محب نے دو بار کھنکار کے گلا صاف کیا اور کئی بار پہلو بدلا، بالآخر محب نے جان لیا کہ اُس سے بہت زیادہ نہیں بولا جائے گا، تب ہی اُس نے تمہید باندھے بغیر کہا۔

''مجھے تم سے محبت ہو گئی ہے چندا۔ میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔'' وہ پڑھا لکھا سمجھدار آدمی دل سے کی گئی محبت کے سامنے کمزور پڑ گیا ہکلا کر بولا۔

''مطلب شادی کر کے ساتھ رکھنا چاہتا ہوں۔''

چندا جواب تک آنکھوں سے روشنی کر رہی تھی، مسکرا دی۔ اُس کے اوپری ہونٹ کا کٹاؤ اور واضح ہوا اور دو پنکھڑیاں ایک دوسرے سے الگ ہوئیں۔

''کب تک؟'' محب بات کو سمجھا نہیں۔ چندا قریب آ گئی، اتنے قریب کہ وہ چندا کی دھڑکنیں گن سکتا تھا۔ اُس کے ہاتھ بے ارادہ چندا کے گرد حمائل ہو گئے۔ چندا ٹوٹی شاخ کی طرح محب کے سینے سے آ لگی۔ اُس نے محب کو اپنی قربت کے نشے سے ملوانا چاہا مگر اچانک ہی محب کی نظر دیوار پہ آویزاں اپنے والد، بڑے سرکار چوہدری وقار احمد کی تصویر پہ پڑی۔ اس کے بالکل ساتھ اس کے دادا جن کا نام اس کے نام سے جڑا تھا، رسول احمد! پوری وجاہت اور خاندانی وقار کے ساتھ کھڑے تھے۔ چوہدری وقار احمد کے خاندان کی بڑی عزت تھی۔ سب جانتے ہیں اس خاندان کے مردوں نے کبھی کسی غیر عورت کو سر اٹھا کے نہیں دیکھا۔ جب ہی تو زمانے سے کمیوں

کی عورتیں ہی اُن کی حویلی میں کام کے لیے آیا کرتی تھیں اور خوب نوازی بھی جاتی تھیں۔

محب کے ہاتھ چندا سے دور ہو گئے...... وہ دو قدم پیچھے ہو گیا۔ اُسے احساسِ ندامت نے آ گھیرا۔

'اگر جو کسی نے رات کے اِس پہر چندا کو باہر نکلتے دیکھ لیا تو؟ کسی نے عالی مرتبت بڑے سرکار سے شکایت لگا دی تو؟'

'سبحان ملازم ہے، جانے میری اس کمزوری کو کیسے لے گا؟'

'اُف مجھے کیا ہو گیا تھا' اسے اپنی عجلت پر غصہ آنے لگا۔ اُس نے بہت سنجیدگی کے ساتھ چندا سے کہا۔

''سنو جو کچھ میں نے کہا اس میں اتنی ہی سچائی ہے، جتنی تمہارے یہاں ہونے میں۔ پر میں نہیں چاہتا یہ بات سب کو پتا چلے، اس لیے فی الحال خاموش رہنا۔ اور میرا انتظار کرنا، اب تم جاؤ۔'' محب نے سبحان کو موبائل پر بیل دے کے بلا لیا۔

''سبحان!'' محب نے اس سے نظر ملائے بغیر کہا۔ ''اسے احترام سے لے جاؤ اور دیکھنا کسی کو خبر نہ ہو کہ چندا رات یہاں آئی تھی۔ یہ ہمارے بزرگوں کی عزت کا سوال ہے۔''

''جاؤں؟'' چندا نے حیرت سے کہا۔

''ایسے ہی؟''

''مطلب؟'' محب پریشان ہو گیا۔

''بڑے سرکار تو کبھی خالی ہاتھ نہیں لوٹاتے...... کیوں سبحان؟'' اس نے کمالِ معصومیت سے کہا۔ سبحان نے لمحے بھر کو محب کی طرف دیکھا اور سر جھکا لیا۔

محب کے لیے سارا منظر اجنبی ہو گیا۔ اسے ماں کی خاموشی سمجھ آ گئی۔ اسے لگا سبحان کہہ رہا ہے۔

''دیکھا چھوٹے سرکار مٹی کا رنگ نہیں بدلا، مٹی کی قسمت بھی وہی ہے......''

☆☆☆

افسانہ

نزہت جبیں ضیاء

بے نام مسافتیں

''السلام وعلیکم آنٹی یہ واشنگ پاؤڈر لیں گی۔؟ فلاں کمپنی کا ہے اور اس کے ساتھ ایک بیوٹی سوپ فری ہے۔'' اس نے دونوں طرف دیکھتے ہوئے شائستہ لہجے میں کہا۔ ''اے لڑکی! خدا کو مانو۔ بھلا کوئی اس طرح کسی کے گھر......

ہمیشہ دوسروں کے آنگن میں جھانکنے والوں کے لیے، آئینہ تحریر

دن بھر کی سخت گرمی کے اس وقت موسم خوشگوار ہو گیا تھا۔ ذکیہ بیگم صحن میں بچھے تخت پر عصر کی نماز پڑھ رہی تھیں عاکف بھی ابھی ابھی دفتر سے لوٹا تھا وہ بھی وہیں تخت پر بیٹھ کر جوتے اتارنے لگا۔ تخت سے کچھ دور کرسی پر بیٹھی افشاں کچھ پڑھ رہی تھی۔ جب کہ دیبا باورچی خانے میں تھی اور چائے بنا رہی تھی۔

''بیٹی دیبا چائے تیار ہو گئی ہے تو لے آؤ۔ بھائی بھی آ گیا ہے۔'' نماز سے فارغ ہو کر ذکیہ بیگم جائے نماز تہہ کر کے قدرے بلند آواز میں کہا۔

''جی امی جی! لے آئی!'' دیبا چائے کی ٹرے تھامے چلی آئی۔ تب تک عاکف بھی منہ دھو کر آ چکا تھا۔ سب لوگ بیٹھے چائے پی رہے تھے کہ ثریا خالہ بھی چلیں آئیں۔

السلام وعلیکم! افشاں نے گرم جوشی سے سلام کیا جب کہ دیبا کا منہ بن گیا کہ اب دوبارہ چائے بنانی پڑے گی ان کے لیے

لیکن ایک بات تھی ثریا خالہ جب بھی گھر آتیں سارے محلے کہ بلکہ آس پاس کی گلیوں سے گرما گرم اور چٹ پٹی نیوز اکھٹی کر کے لاتیں کس گھر میں کیا ہوا ہے......؟ کہاں کچھ ہونا ہے......؟ کس کے یہاں پیدائش......؟ کس کے ہاں متوقع پیدائش......؟ غرض یہ ہے کہ مختلف خبریں ہوتیں جو خوب مرچ مسالے لگا کر سناتیں......ان کی آمد پر افشان کو بڑے مزے آتے...... عاکف نے تخت سے اٹھ کر ثریا خالہ کے لیے جگہ بنائی...... جیتا رہ بچے......! انہوں نے پیار سے عاکف کے سر پر ہاتھ پھیرا کر دعا دی اور چادر سمیٹ کر ذکیہ بیگم کے قریب آ بیٹھیں۔

''کیا ہوا آپا! خیریت کافی دنوں بعد آئی ہو......ذکیہ بیگم نے گلا صاف کیا......ہاں ذرا پیٹ میں گڑ بڑ تھی...... سرکاری اسپتال سے دوا منگوائی......کچھ تو بہتر ہو گئی ہوں......انہوں نے نہ آنے کی وضاحت کی......کوئی خبر سنانے سے رہ گئی ہوگی وہی درد بن کر مروڑ پیدا کر رہی ہوگی......افشاں نے دیبا کے کان میں کہا تو دونوں

کھی کھی کرنے لگیں...... ذکیہ بیگم نے دونوں کو گھور کر دیکھا تو دونوں خجل سی ہو کر سر کھجانے لگیں۔

عاکف مسکراتا ہوا گھر سے باہر نکل گیا۔

''اے ذکیہ! کچھ سنا ہے تم نے؟ کچھ دیر حسب عادت ثریا خالہ پُرتجسس لہجے میں ذکیہ بیگم سے مخاطب ہوئیں۔

خالہ آپ سناؤ گی تو سنیں گے ناں...... افشاں کی زبان میں پھر گدگدی ہوئی۔ ذکیہ بیگم نے پھر آنکھیں دکھائیں...... افشاں جلدی سے کتاب پر جھک گئی۔ دیبا مسکرانے لگی۔

''وہ پچھلی گلی میں جو فیروز رہتا ہے ناں......؟''

ثریا خالہ افشاں کو نظر انداز کرتی ہوئی ذکیہ بیگم سے مخاطب ہوئیں۔

''کون......؟'' ذکیہ بیگم نے لاعلمی کا اظہار کیا۔

''ارے وہی جس کی بیٹی نگینہ ہے۔ اسکول میں پڑھاتی ہے...... مٹک مٹک کر چلتی ہے...... سر پہ چادر لیتی ہے نہ حجاب...... توبہ...... توبہ! انہوں نے جذبات میں آ کر اس شدت سے اپنے رخسار پیٹے کہ منہ سے پان کی پیک کی باریک سی لکیر باچھوں سے بہنے لگی، جسے انہوں نے نہایت بے دردی سے انگلی اور انگوٹھے کی مدد سے صاف کیا اور ہاتھ تخت پر بچھی سفید براق چادر سے صاف کر لیا...... اُف! دیبا سلگ اٹھی آج ہی اس نے کتنی محنت سے دھو کر یہ چادر تخت پر بچھائی تھی اور پان کا دھبہ تو آسانی سے صاف بھی نہیں ہوتا ہے۔ کیوں کہ اس سے پہلے بھی کئی مظلوم چادریں ثریا خالہ نے چھینٹوں اور انگلیوں کی صفائی کا نشانہ بن چکی تھیں۔

آپا......! افشاں کے آنکھ کے اشارے نے گویا

جلتی پر تیل کا کام کیا۔ دیبا غصے سے اٹھی اور کمرے کی جانب گئی...... جب واپس لوٹی تو اس کے ہاتھ میں ٹشو پیپر تھا۔

''خالہ یہ رکھ لیں، منہ صاف کرنے کے لیے۔'' لہجے میں ہلکا سا غصہ بھی تھا۔

چلو ہٹو، ہمیں نہیں چاہیے ہیں موئے تمہارے کاغذ کے رومال!'' لہجے میں انکار کے ساتھ ساتھ بے زاری بھی نمایاں تھی۔۔ دیبا مزید تپ گئی...... افشاں کھلکھلا کے ہنس دی۔

''ارے بھئی آپا آگے بھی تو کہو......'' ذکیہ بیگم پُرتجس لہجے میں بولیں ساتھ ہی خشمگیں نگاہوں سے دیبا کو گھورا۔ جس کی آمد سے ثریا بیگم کا قصہ آگے نہ بڑھ سکا تھا۔ دیبا پیر پٹختی ہوئی واپس پلٹی۔

''ارے ہاں بھائی! وہی تو بتا رہی تھی کہ تمہاری بیٹی آن ٹپکی۔'' ثریا خالہ نے پان کی پیک کو نگلتے ہوئے دوبارہ سلسلہ وہیں سے جوڑا جہاں سے منقطع ہوا تھا۔'' ہاں تو میں کہہ رہی تھی کہ وہ نگینہ ہے ناں اس کی شادی ہو رہی ہے۔ اور پتا ہے کس سے......؟ آنکھوں کو قدرے ترچھا کر لہجے کو راز دار بنانے کی ناکام کوشش کی۔

''کس سے......'' ذکیہ بیگم نے پُرتجس بھرے لہجے میں سوال کیا۔

''ارے ہوگا کون۔'' اسی اسکول کا مالک، جس میں نگینہ پڑھاتی تھی۔ ارے میں تو کہوں...... یہ نین مٹکا ہی ہے۔ گارنٹی لے لو۔''

''تو یہ تو کوئی ایسی بات نہیں۔'' ذکیہ بیگم کا تجسس پل میں ختم ہوگیا۔

''لو بھئی! یہ تو خوب کہی تم نے ذکیہ بیگم! ثریا بیگم نے ناک پر انگلی رکھ کر برہمی کا اظہار کیا۔ کوئی بات کیسے نہیں ہے......؟ ارے اسی وجہ سے تو میں لڑکیوں کو زیادہ تعلیم دلوانے کے حق میں نہیں ہوں...... یہ لڑکیاں کچھ زیادہ ہی آزاد خیال ہوجاتی ہیں...... بے لگام اور بد تمیز بھی...... اپنے آگے کسی کو نہیں سمجھتیں...... لو یہ کوئی بات ہی نہیں ہے تمہاری نظر میں کہ اپنا خصم خود پسند کر ڈالا۔ ارے واہ بھئی! ایک ہمارا بھی زمانہ تھا۔'' انہوں نے ٹھنڈی آہ بھری......

''جہاں اماں باوا نے ہانکا سر جھکائے چپ چاپ چل دیے...... اب چاہے نصیب کالا ہو یا لنگڑا لولا۔ ساری زندگی اسی کی خدمت میں گزار دی۔۔ زبان سے اُف تک نہ کی۔ جوتے بھی کھائے مگر سر تک نہ اٹھایا۔ اور ایک یہ آج کل کی لڑکیاں ہیں...... توبہ...... توبہ!'' حسب عادت انہوں نے دوبارہ ناتواں کلوں پر ستم ڈھایا ساتھ ہی دیبا کے دل پر بھی گھونسا لگا کیوں کہ اس بار انہوں نے منہ سے پان کی بچی کچی باقیات نکال کر صاف ستھرے دھلے فرش پر پھینکی تو دیبا نے اپنا سر پیٹ لیا۔

تب ہی افشاں، ثریا خالہ کے لیے چائے بنا کر لائی تو ان کی توجہ کچھ دیر کے لیے لڑکیوں کی تعلیم سے ہٹ کر چائے کی طرف مرکوز ہوگئی...... سڑوپ سڑوپ! چائے کی چسکیاں لیتے ہوئے وہ کچھ دیر بعد دوبارہ ذکیہ بیگم سے مخاطب ہوئیں اس بار موضوع چینج تھا۔

''ارے وہ اکرم قصائی کے ہاں جڑواں بیٹے پیدا ہوئے ہیں...... اللہ نے کرم کردیا اس پر کہ موئی چھ چھ مونگ دلتی بیٹیوں کے بعد بیٹے تو ہوئے۔''

کچھ دیر ادھر ادھر کی مزید باتیں کرتی رہیں، پھر مغرب کی اذان کے ساتھ ہی چادر سنبھالے دوسرے گھر کی جانب چل دیں۔ اور دیبا بڑبڑاتی ہوئی صحن صاف کرنے کے لیے پانی ڈالنے لگی۔ افشاں زیر لب مسکراتے ہوئے وضو کرتے چل دی۔

ثریا خالہ نے کچھ عرصے پہلے ہی اسی محلے میں مکان خریدا تھا بیوہ خاتون تھیں۔ ان کے دو بچے تھے بیٹا اظہار اور بیٹی نیلوفر۔ یہ اوسط درجے کی آبادی تھی۔ ذکیہ بیگم کے شوہر کا بھی انتقال ہو چکا تھا۔ ان کے تین بچے تھے۔ بڑا بیٹا عاکف، اور دو بیٹیاں دیبا اور افشاں۔ دیبا نے انٹر کر لیا تھا اور گھر میں رہتی تھی جب کہ افشاں فرسٹ ایئر میں پڑھ رہی تھی۔ اور باقی فیملیز بھی اچھی تھیں اکبر صاحب اور ان کی فیملی، رشید صاحب کی فیملی، سجاد صاحب کی فیملی سب لوگ اچھے اور سیدھے سادھے پر امن تھے۔ ان میں سے کچھ کے بچے بڑے تھے جو جاب میں آ چکے تھے اور کچھ بچے ابھی زیر تعلیم تھے۔

ثریا خالہ کے بیٹے نے بمشکل میٹرک پاس کیا تھا اور ایک فیکٹری میں جاب کر رہا تھا اور انہوں نے بیٹی کو صرف پانچ جماعتیں پڑھائی تھیں کیوں کہ ان کا فلسفہ ہی الگ تھا۔ ان کے خیال میں لڑکیاں پڑھ لکھ کر دیدہ ہوائی ہو جاتی ہیں، خود مختار، بدتمیز اور بے لگام ہو جاتی ہیں...... صرف اپنی مرضی کرتی ہیں۔ ہر بات میں بحث کرتی ہیں...... دلائل دے کر اپنے حقوق منوا لیتی ہیں۔ اسی سوچ کے پیش نظر انہوں نے نیلوفر کو آگے پڑھنے نہیں دیا تھا۔

محلے کی ساری لڑکیوں سے ثریا خالہ کو خدائی بیر تھا۔ کیوں کہ سب پڑھ رہی تھیں یا پڑھا رہی تھیں اور لڑکیوں کو بے پردہ دیکھ کر تو ثریا خالہ کو پتنگے لگ جاتے۔

''ارے میرا بس چلے تو میں ان لڑکیوں کو لائن میں لگا کر گولی سے اڑا دوں۔ کم بختوں کے دیدوں کا پانی مر گیا ہے...... ایسے مٹک مٹک کر چلتی ہیں کہ آگے پیچھے سے نگاہوں سے ہی ناپ لو...... توبہ...... توبہ! قیامت کے آثار ہیں۔ میں تو کہتی ہوں شاباش ہے ان ماں باپ کو جو لڑکیوں کو یوں کھلی آزادی دے دیتے ہیں۔ کل کو کوئی گل کھلا دیں گی ناں تو خود ہی روئیں گے سر پکڑ کر۔''

ایک میری نیلوفر ہے۔ مجال ہے جو کسی نے آج تک اس کا ناخن دیکھا ہو۔ مجال ہے جو گھر سے قدم باہر نکالے۔ میلاد اور قرآن خوانی کی محفلوں میں جاتی ہے یا جب بستر پر پڑ جاؤں تو میری دوا لینے نکڑ پر بنے سرکاری اسپتال جاتی ہے بس! وہ بھی ایسے کہ لگتا ہے بس الٹے پاؤں ہی لوٹ آئی ہو اور اس کے علاوہ اگر وہ گھر سے باہر قدم نکالے تو ٹانگیں توڑ دوں گی کمبخت کی۔''

ان کے لہجے میں نیلوفر کے لیے فخر اور ارمان ہوتا۔ اس بات سے تو سب کو ہی اتفاق تھا۔ کہ نیلوفر واقعی کہیں آتی جاتی نہیں تھی۔ میلاد کی محفلوں میں جا کر اپنی خوبصورت آواز میں نعتیں پڑھتی اور جیسے ہی میلاد محفل ختم ہوتی ثریا خالہ اسے گھر چھوڑ آتیں۔ وہ تو کسی لڑکی سے بات تک کرنے نہیں دیتی تھیں کہ مبادا ان کی سیدھی سادھی اور معصوم بیٹی پر بھی ان کا اثر نہ ہو جائے وہ بھی ان لڑکیوں کی طرح بے لگام نہ ہو جائے۔

نیلوفر تھی بھی بہت خوبصورت اور نازک سی...... افشاں کا دل چاہا وہ نیلوفر سے بات کرے اسی کی ہم عمر تھی۔

''خالہ بھی نیلوفر کو ہمارے گھر لے کر آئیں ناں'' ایک بار افشاں نے کہا تو ثریا خالہ ہتھے سے اکھڑ گئیں۔

''ارے بی بی! معاف کرنا، میں ان ماؤں میں سے نہیں ہوں جو اپنی بیٹیوں کی نمائش کرتی پھریں۔ مجھے اچھا نہیں لگتا کہ سارے زمانے میں لڑکیوں کو لے کر گھوموں۔ بیٹیاں تو پردے میں ہی بھلی لگتی ہیں۔ پاک اور معصوم بھی۔ اور بنو تم بھی برا مت ماننا مجھے تو تمہارا بھی یوں سر جھاڑ اور منہ پھاڑ کالج آنا

جانا ایک آنکھ نہیں بھاتا۔ انہوں نے تو بے چاری افشاں کو بے بھاؤ کی سنا ڈالیں۔ افشاں تو جز بز ہو کر رہ گئی۔

بیٹی تو بیٹی ثریا خالہ کا بیٹا اظہار بھی جیسے اللہ تعالیٰ کی گائے تھا اچھی بھلی صورت شکل تھی نہایت شریف اور شرمیلا لڑکا تھا سر جھکائے آتا جاتا، نگاہیں تک اوپر نہ اٹھاتا، عورتیں تو عورتیں مردوں سے بھی سلام دعا بمشکل کرتا۔

ثریا خالہ، چھاتی ٹھونک ٹھونک کر اپنی اعلیٰ تربیت کا سکہ جماتیں اکثر مائیں ان سے امپریس بھی ہو جاتیں۔ واقعی ان کے بچے تو آج کل کے دور میں خدا کا عطیہ تھے۔

☆......☆......☆

''امی جی! یہ ثریا خالہ نیلوفر کو کسی کے سامنے بھی نہیں آنے دیتی بھلا اس کی شادی کیسے ہوگی؟'' ایک روز دیبا نے ذکیہ بیگم سے پوچھا۔

''بیٹی وہ خود تو زمانے بھر میں گھومتی پھرتی ہیں۔ خود ہی اچھا رشتہ تلاش کر لیں گی۔'' ذکیہ بیگم نے جواب دیا۔

☆......☆......☆

دیبا کے لیے سامنے گھر میں رہنے والے رشید صاحب کے بیٹے فیصل کا رشتہ آیا ہوا تھا فیصل نیک اور شریف لڑکا تھا فیملی بھی اچھی تھی۔ فیصل، عاکف کا اچھا دوست بھی تھا۔ یوں ذکیہ بیگم نے ہاں کر دی۔ ثریا بیگم کو پتا چلا تو بھاگی بھاگی چلی آئیں۔

''ائے ہئے ذکیہ یہ کیا کر رہی ہو۔ باؤلی ہوئی ہو گیا؟ یہ کیا کرنے جا رہی ہو۔'' آتے ہی ذکیہ بیگم کو جھنجوڑا۔

''کیوں آپا خیر تو ہے۔ کیا ہوا۔'' بیگم ذکیہ اس اچانک افتاد پر گھبرا گئیں۔

''ارے بھئی سامنے گھر سے رشتہ آیا اور تم نے قبول بھی کر لیا'' لہجے میں خاصی ناگواری تھی۔

''کیا کہہ رہی ہو آپا؟ کیا مطلب ہے آپ کا؟ ذکیہ بیگم کے لیے ثریا بیگم کی بات بہت ناخوش گوار تھی۔

''ارے بھئی! یہ لڑکا فیصل جو ہے یقیناً اس نے دیبا پر پہلے نظر رکھی ہوگی۔ جب دیکھو چھت پر ٹنگا رہتا ہے کہیں دونوں میں......''

''توبہ کرو آپا!'' ذکیہ بیگم نے تیز لہجے میں ان کی بات کاٹی۔ کیا اول فول بک رہی ہو؟ میں بچپن سے دیکھ رہی ہوں فیصل کو بہت شریف، نیک اور فرماں بردار بچہ ہے۔ اپنے کام سے کام رکھنے والا......اسے فرصت کہاں ہوتی ہے چھت پر تانکا جھانکی کرنے کی۔ نوکری اور گھر کے علاوہ مسجد کا راستہ جانتا ہے وہ۔ اور میں نے بہت سوچ سمجھ کر یہ فیصلہ کیا ہے۔ میرے خیال میں دیبا کے لیے فیصل جیسے لڑکے کا رشتہ آیا ہے تو یہ ہمارے لیے خوش قسمتی ہے۔'' ثریا بیگم کی بات پر ذکیہ بیگم کو سچ مچ غصہ آ گیا تھا۔ اپنی دال نہ گلتی دیکھ کر ثریا خالہ کھسیا گئیں۔ کچھ بن نہ پڑا تو سر کھجا کر بولیں۔

''ہمیں کیا بھئی۔ تم جانو تمہارا کام۔ جب تم لوگ راضی ہو تو، میں تو یوں ہی زمانے کی اونچ نیچ سمجھانا چاہتی تھی۔'' پان کی پیک کیاری میں تھوکتے ہوئے وہ بولیں اور جانے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئیں۔ ذکیہ بیگم نے انہیں روکا بھی نہیں وہ چادر سر پر ڈال کر نکل گئیں۔

☆......☆......☆

ثریا خالہ کی وہی روٹین تھی، دن بھر محلے میں گھومنا ادھر ادھر کی ٹوہ لینا۔ دوسروں پر تنقید کرنا خاص کر محلے بھر کی بیٹیوں کو عتاب کا نشانہ بنانا اور اپنی بیٹی کے قصیدے پڑھنا۔

☆......☆......☆

دیبا کی شادی ہوگئی اور اس کے گھر والے بہت اچھے تھے۔ دیبا خوش اور مطمئن تھی۔ بہت سارے دن بیت گئے اب ذکیہ بیگم عاکف کے لیے لڑکیاں تلاش کرنے لگیں۔

ایک دن اچانک ذکیہ بیگم کے ذہن میں خیال آیا کہ کیوں نہ نیلوفر کو عاکف کے لیے مانگ لیں۔ افشاں اور دیبا بھی راضی ہوگئیں کیوں کہ نیلو فر واقعی ایک اچھی لڑکی تھی۔ دیبا کی شادی کو ایک سال کا عرصہ ہونے والا تھا ذکیہ بیگم کا خیال تھا کہ افشاں اپنے ایگزامز سے اور دیبا کی ڈیلوری سے فراغت ہو جائے تو پھر نیلوفر کے لیے عاکف کا رشتہ لے کر جائیں۔

ایک رات دیبا کی طبیعت خراب ہوگئی۔ فیصل کو اس کے آفس کی طرف سے بینک کی سہولت تھی مگر ہاسپٹل کچھ دور تھا۔ دیبا کی ساس، ذکیہ بیگم اور فیصل دیبا کو لے کر ہاسپٹل گئے تھے کچھ گھنٹوں کے انتظار کے بعد ڈاکٹر نے بیٹا ہونے کی خوش خبری سنائی۔ سب لوگ بہت خوش تھے۔

تین دن بعد دیبا کو ہاسپٹل سے ڈسچارج کر دیا گیا فیصل ٹیکسی کے لیے گیا تو ذکیہ بیگم نے سامان وغیرہ اکٹھا کیا۔ دیبا کی آنکھ لگ گئی تو انہوں نے سوچا ٹیکسی آجائے گی تو اٹھا دوں گی یہ سوچ کر وہ باہر کوریڈور میں آبیٹھیں اچانک داخلی راستے سے اظہار داخل ہوا۔ پیچھے پیچھے ایک خوبصورت سی لڑکی تھی۔ سادہ سا کاٹن کا سوٹ تھا جس نے دوپٹا سر پر سلیقے سے لیا ہوا تھا۔ اظہار نے ذکیہ بیگم کو نہ دیکھا وہ لڑکی کو کرسی پر بٹھا کر ریسیپشن کی طرف بڑھ گیا۔ ذکیہ بیگم کو تجسس ہوا کل ہی تو ثریا خالہ نے بتایا تھا کہ اظہار کسی کام کے سلسلے میں حیدر آباد گیا ہوا ہے۔ اور وہ اکثر حیدر آباد جایا کرتا تھا۔ پھر یہاں اس لڑکی کے ساتھ کیا کر رہا ہے۔

اظہار جب دوسری جانب بڑھ گیا تو ذکیہ بیگم نے اٹھ کر لڑکی کے پاس آگئیں۔

''کیا ہوا ہے تمہیں بیٹی؟'' انہوں نے قریب آ کر سوال کیا۔

''وہ میرا چیک اپ کرانا ہے۔'' اس نے شرماتے ہوئے بتایا۔ ''وہ...... میں پریگنٹ ہوں۔ تیسرا مہینہ ہے۔'' لہجہ بدستور شرمیلا تھا۔

''اکیلی ہو۔'' اپنے دل میں ابھرتے بے شمار سوالات کو دباتے ہوئے سوال کیا۔

''نہیں نہیں ...... میرے شوہر ہیں ساتھ۔ ابھی ابھی اسی طرف گئے ہیں اظہار۔ پانچ ماہ پہلے ہماری شادی ہوئی ہے۔

''وہ تمہارا شوہر ہے ذکیہ بیگم کو لگا کہ جیسے ان کے پیروں تلے زمین نکل گئی ہو۔''

''جی ...... بلیک پینٹ اور بلو شرٹ میں۔ وہ میرے شوہر ہیں اظہار......؟'' لڑکی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''اچھا۔'' ذکیہ بیگم بمشکل حواسوں پر قابو پاتے ہوئے بولیں تب ہی دور سے فیصل آتا دکھائی دیا تو وہ اٹھ گئیں۔

ان کے قدم من من بھر کے ہو رہے تھے۔ کمرے میں داخل ہونے سے پہلے انہوں نے مڑ کر دیکھا۔ اظہار آچکا تھا اور لڑکی کا ہاتھ تھام کر ڈاکٹر کے روم کی طرف جا رہا تھا۔

''یا اللہ! یہ تو سچ اظہار ہے۔ اظہار اور شادی وہ بھی بنا بتائے......؟'' ثریا خالہ کو اتنا فخر تھا اور اظہار نے چپکے سے شادی بھی کر ڈالی اور یہ وجہ تھی کہ اکثر وہ حیدر آباد کا کہہ کر تین تین دن گھر سے غائب رہتا تھا ذکیہ بیگم کو لگا جیسے انہوں نے اس لڑکی کو کہیں دیکھا ہے جو اظہار کی دلہن ہے۔ انہوں نے ذہن پر زور ڈالا انہیں کچھ عرصے پہلے کی بات یاد آگئی۔

"یہ ...... لڑکی یہ لڑکی تو ...... سیل گرل تھی اور ان کے گھر آ چکی تھی۔" ذکیہ بیگم کو اچھی طرح یاد آ چکا تھا۔

☆......☆......☆

دوپہر کا وقت تھا ثریا خالہ ذکیہ بیگم کے ہاں آئی ہوئی تھیں اور دونوں برآمدے میں بیٹھ کر باتیں کر رہی تھیں کہ ہلکی سی دستک کے ساتھ ہی ایک پیاری سی لڑکی نے دروازے سے جھانکا اور تھوڑا سا آگے آ گئی۔

"السلام وعلیکم آنٹی یہ واشنگ پاؤڈر لیں گی۔؟ فلاں کمپنی کا ہے اور اس کے ساتھ ایک بیوٹی سوپ فری ہے۔" اس نے دونوں طرف دیکھتے ہوئے شائستہ لہجے میں کہا......

"...... اے ...... لڑکی ...... ! خدا کو مانو ...... بھلا کوئی اس طرح کسی کے گھر میں گھستا ہے۔ اچھی طرح جانتی ہوں تم جیسی لڑکیوں کو۔ شرم و حیا تو چھو کر نہیں گزری تم کو۔ ایسے گھس جاتی ہوں گی نا جانے کتنے گھروں میں۔ چلو ہم تو عورتیں ہیں اگر مرد ہو اکیلا بھی ہو تو ...... تو سوچو کیا حشر ہوگا تمہارا۔ توبہ ...... توبہ ...... کیسی بے لگام لڑکیاں ہیں آج کل کی ...... اللہ رحم کرے۔"

ثریا خالہ کی زبان کی گاڑی اسٹارٹ ہوتی تو سگنل توڑتی ہوئی بس چلتی ہی جاتی۔ لڑکی بیچاری ہونق بنی مجرموں کی طرح انہیں دیکھتی جا رہی تھی۔ بڑی بڑی معصوم آنکھوں میں آنسو جھلکنے لگے تھے۔ گویا اس نے کوئی بڑا گناہ کر دیا ہو۔ ذکیہ بیگم کو اس لڑکی پر بہت ترس آیا۔ کسی کو کیا حق پہنچتا ہے اس طرح کسی کی بے عزتی کر ڈالے۔ لڑکی نے ایک نظر ذکیہ بیگم پر ڈالی اور الٹے قدموں پلٹ کر تیزی سے دروازے سے باہر نکل گئی۔ ثریا خالہ نے ایک نفرت بھری نگاہ اس کی پیٹھ پر ڈالی اور حسب عادت پان منہ سے بھرے کلوں پر ظلم کر ڈالا۔

"آپا تم بھی کمال کرتی ہو۔ بھلا اتنا کچھ کہنے کی کیا ضرورت تھی۔ بے چاری ضرورت مند ہو گی تب ہی تو اتنی گرمی میں گلی گلی گھوم کر چار پیسے کما رہی ہے۔ اگر ایسی ویسی ہوتی تو کاہے کو اتنی محنت مشقت کرتی۔" ذکیہ بیگم نے برہمی سے ثریا خالہ کو مخاطب کیا۔

"اے ہے رہنے دو بیگم تم تو ...... بہت دیکھی ہیں ایسی دیدہ ہوائی لڑکیاں۔ یہ سب خصم ڈھونڈنے کے بہانے ہیں۔ اچھی صورت کی آڑ میں پیسے والے لڑکوں کو پھنسانا اچھی طرح جانتی ہیں ایسی لڑکیاں۔ نہ جانے کس گھر کو آگ لگائیں گی ایسی چلتر لڑکیاں۔ کون سے شریف لڑکے کو اور شریف گھرانے کو پھانسیں گی ......؟" ثریا بیگم کے لہجے میں نفرت اور حقارت تھی جو ذکیہ بیگم کو بہت بری لگی۔

"اُف اللہ!" ذکیہ بیگم نے سر تھام لیا۔ یہ اظہار کی بیوی تو وہی سیلز گرل لڑکی تھی جس کو ثریا بیگم نے اتنا ذلیل کیا تھا۔ اتنا حقیر اور آوارہ سمجھا تھا۔ آج وہی حقیر لڑکی ان کے گھر کے وارث کو جنم دینے جا رہی تھی۔ بقول ان کے ان کے گھر کو آگ لگانے آ گئی تھی۔ ان کے شریف بیٹے کو پھانس لیا تھا۔

فیصل ٹیکسی لے آیا ذکیہ بیگم مستقل اظہار کے بارے میں سوچے جا رہی تھیں۔ کتنا بڑا دھوکہ دے رہا تھا وہ اپنی ماں کو۔ اس لڑکی کو اپنا لیا تھا جو ماں کی نظر میں بات کرنے کے قابل بھی نہ تھی۔ کتنا بھروسہ اور مان تھا ثریا بیگم کو اپنی اولاد پر۔ دیبا اسپتال سے اپنے گھر ہی گئی تھی ذکیہ بیگم اسے گھر پہنچا کر اپنے گھر آ گئیں۔

☆......☆......☆

گھر آ کر بھی ذکیہ بیگم الجھی الجھی سی رہیں۔

اظہار کتنا معصوم اور سیدھا لگتا تھا۔ اس سے ایسی حرکت کی قطعی امید نہ تھی۔ وہ تو اماں کی اجازت کے بغیر کسی سے سلام دعا نہ کرتا تھا۔

ذکیہ بیگم بنا کر چائے بنا کر پی رہی تھیں کہ ثریا بیگم آگئیں بڑی گرم جوشی سے گلے لگا کر مبارک باد دی۔ ذکیہ بیگم کا دل چاہا کہ انہیں اظہار کے بارے میں بتا دیں مگر ان کی ہمت نہ ہوئی۔

ادھر ادھر کی باتیں ہونے لگیں۔ کچھ دیر الٹی سیدھی باتیں اور دنیا کی برائیاں کر کے ثریا بیگم واپس چلی گئیں۔

اس رات کو ذکیہ بیگم دیر تک جاگتی رہیں کہ نیلوفر کے لیے عاکف کا رشتہ لے جائیں یا نہیں۔

تین بجے کے بعد ذکیہ بیگم کی آنکھ لگی۔ تو فجر میں بھی نہ اٹھ پائیں۔

''امی، امی جلدی اٹھیں۔ ثریا خالہ کی طبیعت خراب ہوگئی۔ رشید انکل وغیرہ انہیں ہسپتال لے جا رہے ہیں۔'' صبح صبح عاکف کی تیز آواز پر وہ ہڑبڑا کر اٹھیں۔

''الٰہی خیر! کیا ہوا......؟'' دوپٹہ سر پر ڈال کر وہ تیزی سے کمرے سے باہر نکلیں۔

ہوا یہ کہ حسب معمول دودھ والا فجر کے بعد دودھ لے کر آیا تو ثریا بیگم کے گھر کا دروازہ خلاف توقع کھلا ہوا تھا۔ اس نے کافی آوازیں دیں، جب جواب نہ ملا تو پڑوس میں رہنے والے اکبر صاحب کو بتایا۔ دو تین لوگ مل کر اندر گئے تو دیکھا گھر میں صرف ثریا بیگم تھیں وہ بھی بے ترتیبی سے بے ہوشی کی حالت میں پلنگ پر پڑی تھیں۔ ان کے ہاتھ میں پرچی تھی جس پر نیلوفر کی کچی ہینڈ رائیٹنگ میں کچھ لکھا تھا......

اماں!

میں اپنی مرضی سے گھر چھوڑ کر جا رہی ہوں۔ میں سرکاری اسپتال میں آنے والے ایک لڑکے ڈیوڈ کو پسند کرتی ہوں اور وہ بھی مجھے چاہتا ہے۔ تم کسی صورت ہماری شادی نہیں کرواؤ گی، اس لیے میں گھر سے جا رہی ہوں اور مجھے پتا ہے تم یہ برداشت کر لو گی...... کیوں کہ یہ ساری غلطی تمہاری ہے۔ تم نے ہمیں کبھی بھی اپنی مرضی سے جینے نہیں دیا۔ اور نہ ہمیں وہ وقت دیا جس کی ہمیں ضرورت تھی۔ مجھے تالے میں رکھ کر تم دوسروں کی خبریں لیتی پھرتی رہیں۔

کبھی میرے بارے میں، میری ضرورت اور میری پسند کے بارے میں نہیں سوچا۔ اماں اگر تم ادھر ادھر جھانکنے کی بجائے اپنے گھر، اور اپنے بچوں پر توجہ دیتیں تو آج یہ نوبت نہ آتی۔ تمہاری ان باتوں کی وجہ سے ہی بھائی نے بھی شادی کر لی ہے۔ اگر وہ لوٹ آئے تو کم از کم اب اسے اور اپنی بہو کو قبول کر لینا۔

تمہاری نیلوفر۔

اُف خط کیا تھا بم تھا...... ذکیہ بیگم نے بھی سارا خط پڑھ ڈالا۔ لوگ ثریا بیگم کو لے جانے کے لیے ایمبولینس منگوا رہے تھے لیکن...... اتنی دیر میں...... وہ ختم ہو چکی تھیں۔ ذکیہ بیگم پھوٹ پھوٹ کر رو دیں۔ اس نادان عورت کی نادانی پر جس نے خود اپنے گھر کو اپنے ہاتھوں سے برباد کر دیا تھا۔

اولاد پر ماں باپ کا بہت حق ہوتا ہے اور ماں باپ یقیناً ان کے لیے بہتر سوچ اور اچھے فیصلے کرتے ہیں مگر کہیں کہیں ثریا بیگم جیسے نادان ماں باپ بھی ہوتے ہیں جو ناجائز ضد اور پابندیاں لگا کر اپنے بچوں کو خود ہی بگاڑ دیتے ہیں۔ میانہ روی زندگی کے لیے بہت ضروری ہے کہ انتہا پسندی سوائے نقصان کے اور کچھ نہیں دیتی۔

☆......☆......☆......☆

مکمل ناول

اُمِ مریم

رحمٰن، رحیم، سدا سائیں

"مجھے یہ بتاؤ بریرہ! میں نے اس سے شادی کی۔ تمہیں دکھ ہونا چاہیے تھا۔ تمہیں دکھ نہیں ہوا۔ میں نے اس عورت کے عذاب سے اپنی جان چھڑالی۔ تمہیں خوشی ہونی چاہیے تھی۔ تمہیں شاک لگا۔ میری خوشی تمہاری خوشی نہیں بن سکتی۔ میرا دکھ تمہیں بھی متوجہ نہیں کرسکا۔ اس کے باوجود تم......

زندگی کے ساتھ سفر کرتے کرداروں کی فسوں گری، ایمان افروز ناول کا بارھواں حصہ

گزشتہ اقساط کا خلاصہ

بیک وقت حال و ماضی کے دریچوں سے جھانکنے والی یہ کہانی دیا سے شروع ہوتی ہے۔ جسے مرتد ہونے کا پچھتاوا، ملال، رنج، دکھ اور کرب کا احساس دل و دماغ کو شل کرتا محسوس ہوتا ہے۔ جو رب کو ناراض کر کے وحشتوں میں مبتلا ہے۔ گندگی اور پلیدگی کا احساس اتنا شدید ہے کہ وہ رب کے حضور سجدہ ریز ہونے میں مانع رکھتا ہے۔ مایوسی اس کی اتنی گہری ہے کہ رب جو رحمٰن و رحیم ہے، جس کا پہلا تعارف ہی یہی ہے۔ اسے یہی بنیادی بات بھلائے ہوئے ہے۔ دیا جو در حقیقت علیزے ہے اور اسلام آباد چاچا کے ہاں میڈیکل کی تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے مکین ہے۔ یوسف کرسچن نوجوان جو اپنی خوبروئی کی بدولت بہت سی لڑکیوں کو استعمال کر چکا ہے۔ علیزے پر بھی جال پھینکتا ہے۔ علیزے جو دیا بن کر اس سے ملتی ہے اور پہلی ملاقات سے ہی یوسف سے متاثر ہو چکی ہے۔

یہ ملاقاتیں چونکہ غلط انداز میں ہو رہی ہیں۔ جبھی غلط نتائج مرتب کرتی ہیں۔ یوسف ہر ملاقات میں ہر حد پار کرتا ہے علیزے اسے روک نہیں پاتی مگر یہ انکشاف اس پر بجلی بن کر گرتا ہے کہ یوسف مسلمان نہیں ہے۔ دنیا میں آنے والے اپنے ناجائز بچے کو باپ کا نام اور شناخت دینے کو علیزے یوسف کے مجبور کرنے پر اپنا مذہب نا چاہتے ہوئے بھی چھوڑ کر عیسائیت اختیار کرتی ہے مگر ضمیر کی بے چینی اسے زیادہ دیر اس پر قائم نہیں رہنے دیتی۔ وہ عیسائیت اور یوسف دونوں کو چھوڑ کر رب کی ناراضگی کے احساس سمیت نیم دیوانی ہوتی سرگرداں ہے۔ سالہا سال گزرنے پر اس کا پھر سے بریرہ سے ٹکراؤ ہوتا ہے جو خیالات کی چکی میں پس کر خود بھی سراپا تغیر کی زد میں ہے۔ علیزے کی واپسی کی خواہاں ہے اور علیزے کی مایوسی اور اس کی بے اعتباری کو اُمید میں بدلنا چاہتی ہے۔ مگر یہ اتنا آسان نہیں۔

علیزے اور بریرہ جن کا تعلق ایک مذہبی گھرانے سے ہے۔ بریرہ علیزے کی بڑی بہن مذہب کے معاملے میں بہت شدت پسندانہ رویہ رکھتی تھی۔ اتنا شدت پسندانہ کہ اس کے اس رویے سے اکثر اس سے وابستہ رشتوں کو تکلیف سے دوچار ہونا پڑا۔ خاص کر علیزے...... جس پر علیزے کی بڑی بہن ہونے کے ناتے پوری اجارہ داری ہے۔ عبدالغنی ان کا بڑا بھائی ہے۔ بریرہ سے بالکل متضاد صرف پرہیزگار نہیں عاجزی و انکساری جس کے ہر انداز سے جھلکتی ہے اور اسیر کرتی ہے۔ در پردہ بریرہ اپنے بھائی سے بھی خائف ہے۔ وہ صحیح معنوں میں پرہیزگاری و نیکی میں خود سے آگے کسی کو دیکھنا پسند نہیں کرتی۔ ہارون اسرار شوبز کی دنیا میں بے حد حسین اور معروف شخصیت کے طور پر جانا جاتا ہے۔ گھر کی دینی محفل میں وہ بریرہ کی پہلے آواز اور پھر حسن کا اسیر ہو کر
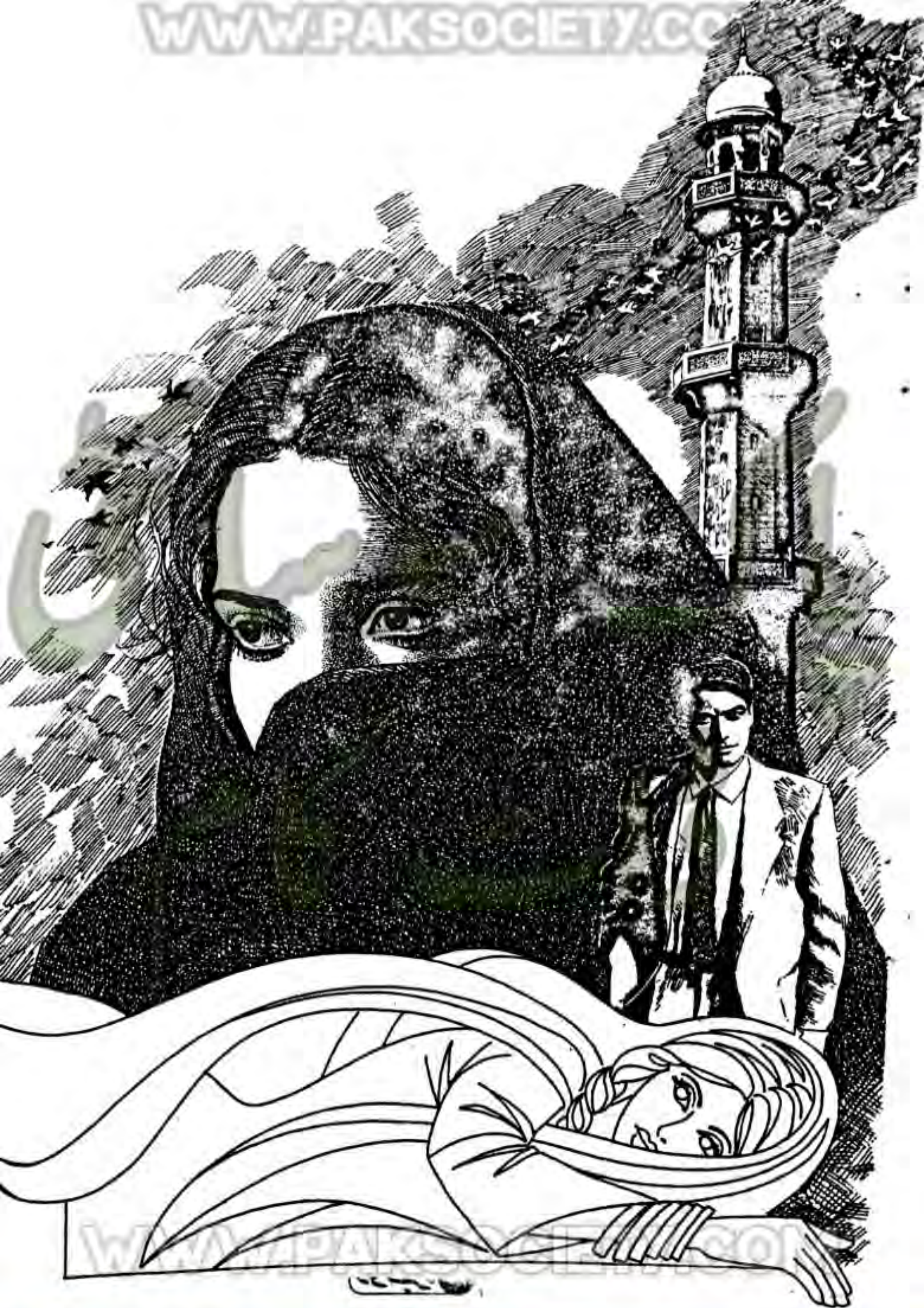
اس سے شادی کا خواہاں ہے۔ مگر بریرہ ایک گمراہ انسان سے شادی پر ہرگز آمادہ نہیں۔ ہارون اس کے انکار پر اس سے بات کرنے خود ان کے ہاں آتا ہے اور شوبز تک چھوڑنے پر آمادگی کا اظہار کرتے ہوئے اسے رضامند کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ وہیں اس موقع پر اس کی پہلی ملاقات عبدالغنی سے ہوتی ہے۔ ہارون اسرار کسی بھی صورت عبدالغنی کو اس رشتہ پر رضامندی پر التجا کرتا ہے۔ عبدالغنی سے تعاون کا یقین پا کر وہ مطمئن ہے۔ اسے عبدالغنی کی باوقار اور شاندار شخصیت بہت بھاتی ہے۔ محلے کا اوباش لڑکا علیزے میں دلچسپی ظاہر کرتا ہے۔ جس کا علم بریرہ کو ہونے پر بریرہ علیزے کی کردار کشی کرتی ہے۔ علیزے اس الزام پر سوائے دل برداشتہ ہونے کے اور کوئی صفائی پیش کرنے سے لاچار ہے۔

اسامہ ہارون اسرار کا چھوٹا بھائی حادثے میں اپنی ٹانگیں گنوا چکا ہے۔ ہارون کی ممی اپنی یتیم بھتیجی سارہ سے زبردستی اس کا نکاح کراتی ہیں۔ جس کے لیے اسامہ ہرگز راضی نہیں اور نہ ہی سارہ کو اس کے حقوق دینے پر آمادہ ہے۔ لیکن دھیرے دھیرے سارہ کی اچھائی کی وجہ سے وہ اس کا اسیر ہونے لگتا ہے اور بالآخر اس کے ساتھ ایک خوشگوار زندگی کا آغاز کرتا ہے۔ لاریب ہارون کی چھوٹی بہن جو بہت لاابالی نظر آتی ہے۔ ہارون کے ہمراہ کالج واپسی پر پہلی بار عبدالغنی کو دیکھ کر اس کی شخصیت کے سحر میں خود کو جکڑا محسوس کرنے لگتی ہے۔ لاریب کی دلچسپی عبدالغنی کی ذات میں بڑھتی ہے۔ جسے بریرہ اپنی منگنی کی تقریب میں خصوصاً محسوس کر جاتی ہے۔ لاریب محبت کی راہوں کی تنہا مسافر ہے۔ عبدالغنی انجان بھی ہے اور لاتعلق بھی۔ لاریب کے لیے یہ بات بہت تکلیف کا باعث ہے کہ وہ بھی اس کی حوصلہ افزائی نہیں کرے گا۔ علیزے لاریب کی ہم عمر ہے۔ دونوں میں دوستی بھی بہت ہو چکی ہے۔ وہ لاریب کی اپنے بھائی میں دلچسپی کی بھی گواہ ہے مگر وہ لاریب کی طرح ہرگز مایوس نہیں ہے۔

شادی کے موقع پر بریرہ کا رویہ ہارون کے ساتھ بھی بہت لیا دیا اور سرد مہری ہی نہیں حاکیت آمیز بھی ہے۔

اسے ہارون کے ہر اقدام پر اعتراض ہے۔ وہ اس پر ہر قسم کی پابندیاں عائد کرنے میں خود کو حق بجانب سمجھتی ہے اور اس کی ساتھی اداکارہ سوہا کی ہارون سے بے تکلفی اسے سخت گراں گزرتی ہے۔ ممی کو اپنی بیٹی کا عبدالغنی جیسے نوجوان میں دلچسپی لینا ایک آنکھ نہیں بھاتا جبھی ایک معمولی بات پر وہ لاریب کے سامنے عبدالغنی کی بے حد تحقیر کرتی ہیں۔ اس سے پہلے وہ لاریب کو بھی جتلا چکی ہوتی ہیں کہ وہ ایسے خواب دیکھنا چھوڑ دے۔ لاریب کو عبدالغنی سے سے روا رکھا جانے والا ممی کا رویہ بغاوت پر ابھارتا ہے۔ وہ تمام لحاظ بھلائے جواب تک اس کے قدموں کو اس راہ پر آگے بڑھنے سے روکے تھے اپنا گھر چھوڑ کر عبدالغنی کے پاس آ کر عبدالغنی سے خود کو اپنانے کی گزارش کرتی ہے۔ عبدالغنی اس کی جذباتی کیفیت کو سمجھتے ہوئے اسے بہلا، سمجھا کر واپس بھیجتا ہے۔ مگر لاریب اس مصالحانہ عمل کو سمجھے بغیر اسے اپنی ریجکشن اور تذلیل سمجھتے ہوئے شدید ہیجان میں جتلا ایکسیڈنٹ کروا بیٹھتی ہے۔ ممی اس کی حالت پر حراساں جبکہ لاریب اسی ہسٹریائی کیفیت میں جتلا عبدالغنی کے حوالے سے اپنی ہر شدت اور شدت پسندانہ بے بسی ان کے سامنے عیاں کر جاتی ہے۔ ممی جو بریرہ کے حاکمانہ رویے اور ناشکرانہ انداز کی بدولت سخت دل برداشتہ ہیں اور اپنی بیٹی کو اس کے بھائی کے حوالے کرنے میں شامل ہیں۔ لاریب کی خوشی کی خاطر اس شادی پر بالآخر آمادہ ہونے پر ایک بار پھر مجبور ہو جاتی ہیں۔ لاریب کی دائمی مسکراہٹ کی چاہ انہیں عبدالغنی کے سامنے ہاتھ پھیلانے پر مجبور کرتی ہے۔

بریرہ لاریب کو ناپسند کرتی ہے۔ جبھی اسے یہ اقدام ہرگز پسند نہیں آتا مگر وہ شادی کو روکنے سے قاصر ہے۔ لاریب عبدالغنی جیسے منکسر المزاج بندے کی قربتوں میں جتنا سنورتی ہے۔ ہارون بریرہ کے حوالے سے اسی قدر رائیگانیوں کا شکار ہے۔ لیکن اس وقت تنہا ہوتی ہے۔ جب وہ علیزے کے حوالے سے اس پر الزام عائد کرتی ہے۔ صرف ہارون نہیں...... اس سطحی حرکت کے بعد علیزے بھی بریرہ سے نفرت پہ مجبور ہو جاتی ہے۔ وقت کچھ اور آگے سرکتا ہے۔ بریرہ کے دل شکن رویے کے باوجود ہارون اس کی توجہ کا منتظر بار بار اس کی طرف پیش رفت کرتا ہے۔ اس خواہش کے ساتھ کہ وہ بھی لاریب کی طرح سدھار کا متمنی ہے۔ مگر بریرہ جو علیزے کی بے راہ روی کا باعث خود کو گردانتی ہے اور احساسِ جرم میں جتلا رب کو منانے ہر صورت علیزے کی واپسی کی ملتمس ہے۔ ہارون کے ہر احساس سے گویا بے نیاز ہو چکی ہے۔ ہارون اس بے نیازی کو لاتعلقی اور بے گانگی سے تعبیر کرتے ہوئے مایوسی کی اتھاہ گہرائیوں میں اترتا نا صرف شوبز کی دنیا میں دوبارہ داخل ہوتا ہے بلکہ ضد میں آ کر بریرہ کو جھنجوڑنے کی خاطر سوہا سے شادی بھی کر لیتا ہے۔ علیزے کے حوالے سے بالآخر بریرہ کی دعائیں مستجاب ہوتی ہیں۔ لیکن تب تک ہارون کے حوالے سے گہرا نقصان اس کی جھولی میں آن گرا ہوتا ہے۔

علیزے کی واپسی کے بعد عبدالغنی سمیت اس کے والدین بھی علیزے کے رشتے کے لیے پریشان ہیں۔ علیزے قرآن پاک کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد خود بھی یہ علم بانٹ رہی ہے۔ عبدالہادی اپنے روحانی استاد کے زیر تربیت ایک کامل مومن کی شکل میں ان کے سامنے ہے۔ وہ اسے نور کی روشنی پھیلانے کو ہجرت کا حکم دیتے ہیں۔

عبیر ایک بدفطرت عورت کے بطن سے جنم لینے والی باکردار اور باحیا لڑکی ہے۔ جسے اپنی ماں بہن کا طرزِ زندگی بالکل پسند نہیں۔ وہ اپنی ناموس کی حفاظت کرنا چاہتی ہے۔ مگر حالات کے تارِ عنکبوت نے اسے اپنے منحوس پنجوں میں جکڑ لیا ہے۔ کامیاب علاج کے بعد اسامہ پھر سے اپنے پیروں پر چلنے میں کامیاب ہو چکا ہے۔ اسامہ چونکہ فطرتاً کاملیت پسند ہے۔ کسی بھی چیز کا ادھورا پن اسے ہرگز گوارا نہیں مگر اس کے بیٹے میں بتدریج پیدا ہونے والی معذوری کا انکشاف اسے سارہ کے لیے ایک سخت گیر شوہر، متکبر انسان کے طور پر متعارف کراتا ہے۔ وہ ہرگز اس کی کے ساتھ بچے کو قبول کرنے پر آمادہ نہیں۔ عبیر کو حالات اس نہج پر پہنچا دیتے ہیں کہ وہ ایک مسجد میں پناہ لینے پر مجبور ہو جاتی ہے۔ اُس کی شرافت دیکھ کر موٴذن صاحب اُسے اپنی پُرشفقت پناہ میں لے کر اُس کی ذمے داری قبول کر لیتے ہیں۔ اُم جان اور بابا جان حج کے لیے روانہ ہو جاتے ہیں۔ عبدالغنی سے موٴذن صاحب بہت متاثر تھے، وہ اُس سے اپنی اس پریشانی کا ذکر کرتے ہیں اور اُسے قابلِ بھروسہ جان کر عبیر کو عقد میں لینے پر زور دیتے ہیں۔ عبدالغنی انتہائی مجبوری کی حالت میں اُن کا یہ فیصلہ قبول کر کے عبیر سے نکاح کر لیتا ہے۔ یہ سب کچھ اتنی اچانک ہوتا ہے کہ وہ لاریب سے اس بارے میں کوئی ذکر تو کجا مشورہ بھی نہیں کر پاتا۔ عبیر کو لے کر عبدالغنی گھر آ جاتا ہے۔ لاریب کے لیے یہ سب کچھ سہنا آسان نہیں ہوتا، وہ اُسی وقت گھر چھوڑ کر چلی جاتی ہے۔ چونکہ گھر میں کوئی بڑا نہیں ہوتا، اس لیے لاریب کو سمجھانا عبدالغنی کے بس سے باہر تھا۔ علیزے، عبدالہادی کے ساتھ اُس کی ماما سے ملنے اُن کے آبائی گھر چلی جاتی ہے۔ جب عبدالہادی علیزے کو اپنی ماں سے ملوانے کے لیے کہتا ہے تو وہ ایک غیر مسلم عورت سے ملنے کے لیے فوری طور پر انکار کر دیتی ہے۔ عبدالہادی کے لیے یہ ایک بہت بڑا اچنبھا تھا۔ کیونکہ اُس کی ماں......

(اب آپ آگے پڑھیے)

اس کی اداس آنکھیں دریچے کے پار بھیگے لان پر ٹھہری تھیں۔ بارش کے ننھے قطرے درختوں سے ٹکرا کر خفیف سا شور پیدا کر رہے تھے۔ اس نے ایک نظر پھر کھڑکی کے پار ڈالی اور خود پلٹ کر تیز قدموں سے باہر آ گئی۔ نم آلود ہوا کی خنکی میں شدت تھی مگر اس کے باوجود اچھی لگ رہی تھی۔ مٹی میں بسی پھولوں کی مہک کو گہرا سانس بھر کے محسوس کرتے اس نے شال کو اچھی طرح لپیٹا۔ اداسی بھری شام دھیرے دھیرے رات کے آنگن میں اترنے کو تھی۔ سردی کا احساس شدید تر تھا مگر وہ اندر نہیں گئی یہاں تک کہ بارش کی شدت کم ہو کر ہلکی پھلکی پھوار میں تبدیل ہونے لگی۔ پودے، پھول، درخت سب دھل گئے تھے۔ سبز پتوں پر بارش کے قطرے بالکل موتیوں کی طرح لگ رہے تھے۔

''میم اندر آ جائیں، سردی بہت ہے۔ آپ کی طبیعت خراب ہو گئی تو سر ہمیں بہت ڈانٹیں گے۔''

ملازمہ خائف سی کچھ فاصلے پر کھڑی تھی۔ علیزے نے گردن موڑ کر اسے دیکھا۔

''کیا وہ لڑا کے ساتھ ہیں؟'' اس کا سوال چبھتا ہوا تھا۔ لہجے میں ازحد کرختگی تھی۔

''جی میم!'' ملازمہ کی تاکید پر وہ ہونٹ کاٹ کر رہ گئی۔

''وہ کہاں...... میں جانا چاہتی ہوں۔'' اس نے تلملاہٹ دبائی۔

''میم! سر روم میں ہیں۔'' ملازمہ نے موٴدب انداز میں آگاہ کیا تھا۔ علیزے دانت بھینچتے آگے بڑھتی چلی گئی۔

''تمہارا درد گویا اس صدف کے ٹوٹنے کی تکمیل ہے۔ جس کے اندر تمہارا فہم بند ہے۔ وہ ایک حیاتِ اعلیٰ ولادت کا دروازہ ہے۔ جس طرح ضروری ہے کہ ایک پھل کا سخت چھلکا ٹوٹے تاکہ اس کا مغز باہر آ سکے۔ اسی طرح ضروری ہے کہ تم بھی اپنے صدف کے ٹوٹنے کا دکھ برداشت کرو۔''

ڈرائنگ روم کے دروازے پر اسے رکنا پڑا تھا۔ عبدالہادی کی آواز باہر تک آ رہی تھی۔ وہ جان سکتی تھی کہ یہ کس سے مخاطب ہے۔ آخر کیا کہہ رہا ہے وہ سن لینا چاہتی تھی۔

''اور اگر تمہارا دل اس قابل ہو کہ زندگی کے روزانہ پیش آنے والے معجزوں کو دیکھ سکے۔ تو تمہارے لیے مسرتوں سے کچھ کم دل نواز نہ ہوگا۔

اور دل کی فضا کے موسموں کو تم اس طرح قبول کر لو گی جس طرح کسان اپنے کھیتوں کے لیے موسموں کا تغیر پسند کرتا ہے۔ پس جب غم کا سب سے سخت اور تکلیف دہ موسم تم پر گزرے گا تو تم سنجیدگی اور متانت کے ساتھ اپنی اس حالت کا مطالعہ کر سکو گی۔ اور جان لو...... تمہارا بہت سا دکھ تمہارا اپنا انتخاب ہے اور در حقیقت ایک کڑوی دوا ہے جو تمہارے نفس خفی کا علاج کرنے کے لیے تمہارا طبیب (اللہ) تمہیں پلاتا ہے۔ بس طبیب پر بھروسہ کرو۔ اور اس کی دوا خاموشی اور سکون کے ساتھ پی جاؤ۔"

وہ جیسے ہی خاموش ہوا علیزے تن فن کرتی اس کے سر پر آ کر چڑھ گئی۔

"عبدالہادی مجھے اسی وقت واپس چلنا ہے۔ آپ میرے ساتھ چل رہے ہیں میں ہرگز انکار نہیں سنوں گی۔ یاد رکھیں...... اگر آپ نے ایسا کیا تو میں بہت غلط کر گزروں گی۔"

وہ چھوٹتے ہی برس پڑی تھی۔ اس کا چہرہ غم و غصے کی زیادتی سے سرخ ہو رہا تھا۔ آنکھوں میں بے تحاشا نمی تھی۔ لزا نے متنفرانہ انداز میں نگاہ کا زاویہ بدلا البتہ عبدالہادی علیزے کی کیفیت پہ متحیر اور متعجب ہونے کے ساتھ پریشان بھی نظر آیا تھا۔

"لیزے...... واٹ ہیپنڈ؟ واٹس سم تھنگ رانگ؟" اس نے تشویش زدہ انداز میں کہتے اسے شانوں سے تھاما تو وہ کچھ اور بھی بپھر گئی تھی۔

"صرف ہاں یا نا میں جواب دیں۔ چل رہے ہیں یا نہیں۔" وہ چیخی تھی۔ عبدالہادی قدرے خفیف سا ہو گیا۔

"ہاں...... چل رہا ہوں۔ ابھی، ریلکس پلیز۔" اس نے بے اختیار کہہ دیا اور اسے بازو کے حلقے میں لے لیا۔ پھر جیسے چلتے چلتے رُک کر معذرت خواہانہ انداز میں جیسے یاد آتے ہو لزا کو مخاطب کیا تھا۔

"سوری ٹو سے لزا! مجھے جانا ہو گا۔ ایکسکیوز می۔"

پھر علیزے کو یونہی تھامے باہر آ گیا۔ اس کی وحشت بھری صورت کو دیکھ کر پریشانی سے بولا تھا۔

"کیا ہوا ہے سویٹ ہارٹ اچانک؟ مجھے ڈرا دیا ہے تم نے۔"

"اچانک؟" وہ بھڑکی اور پھنکاری۔

"یہ عورت! اسے کوئی کام نہیں آپ سے گفت و شنید کے علاوہ۔ میرے منع کرنے کے باوجود بھی آپ......"

"اوہ...... کم آن سویٹی! وہ مجھ سے اپنی الجھنیں شیئر کرتی ہے بیچاری۔ بہت پریشان ہے اور......"

"میری بات سنیں عبدالہادی! میں نے اس کی الجھنوں اور پریشانیوں کا ہرگز ٹھیکہ نہیں لیا۔ او کے؟" وہ انگلی تنبیہہ کے انداز میں اٹھا کر بولی تھی کہ عبدالہادی کو مسکراہٹ دباتے دیکھ کر آنکھیں نکالیں۔

"ہنستے کیوں ہیں؟"

"تم نے نہیں، میں نے...... وہ بات مجھ سے کرتی ہے۔" عبدالہادی کی وضاحت نے اسے جھلسا کے رکھ گئی تھی۔

"ایک ہی بات ہے، نقصان تو میرا ہو رہا ہے۔" اس نے غصیلے تاثرات کے ساتھ کہا تھا۔

عبدالہادی یکدم چونک گیا۔ یہ فقرہ معنی خیز انداز میں تھا۔ وہ خوش کیسے نہ ہوتا۔

"ویسے ایک بات ہے، اکثر غصے میں آپ بہت کام اور پیاری باتیں کر جاتی ہیں۔" جیب سے سیل فون نکال کر وہ شرارت سے کہہ رہا تھا۔

"اب کیا اسے فون کریں گے؟" وہ اس کی بات کا تاثر اور جھینپ مٹانے کو پھر تیز ہوئی۔

"نہیں مجھے جان عزیز ہے ابھی۔ ایئر لائن کال کروں گا۔ ٹکٹس کنفرم کرانے کو۔"

وہ باقاعدہ وضاحت دے رہا تھا۔

''ٹھیک ہے میں اپنا بیگ تیار کرلوں۔ کپڑے تو بدلیں گے آپ؟''

وہ جاتے جاتے رُک کر استفسار کرنے لگی۔عبدالہادی نے کاندھے اچکا دیے تھے۔ علیزے قدرے مطمئن ہو کر واپس اپنے کمرے کی جانب ہولی تھی۔

☆☆

رات کے کسی پہر سارہ کی اچانک طبیعت خراب ہوئی تھی۔ ممی ڈرائیور کے ہمراہ اسے اسپتال لے کر گئیں۔ ہارون شام کو ہی لاہور چلا گیا تھا۔ بریرہ ساتھ گئی تھی۔ ممی نے ملازمہ کو تاکید کردی تھی، اسامہ کو کال کرنے کی۔ جس وقت اسامہ وہاں پہنچا ڈیلیوری ہو چکی تھی۔ میجر آپریشن کے بعد بیٹے کی پیدائش ہوئی تھی۔ ممی جتنی پریشان تھیں۔ سارہ اسی قدر پُریقین تھی آخر وقت تک......

''بیٹا ہوا ہے مبارک ہو۔''

اسامہ بغیر کسی سوال جواب کے چپ چاپ ممی کے پاس آ کر کھڑا ہوا تو ممی نے آہستگی سے کہا تھا۔ وہ محض نظریں اٹھا کر انہیں دیکھتا رہ گیا۔

''اس عورت کی ضد پتا نہیں مجھے کیا دکھانے والی ہے۔'' وہ بڑبڑایا تھا انداز کوفت بھرا تھا۔

''ڈاکٹر کا کہا حدیث نہیں ہوتا۔ ایک اوپر بھی بیٹھا ہے۔ اسی کے فیصلے حتمی اور اہم ہوتے ہیں۔'' ممی کو غصہ آ گیا تھا۔ اتنے کمزور غصے پر اسامہ نے ہونٹ بھینچ رکھے۔ نرس نے جب بچہ لاکر گود میں دیا تو ممی نے بہت بے خبری سے اسے الٹ پلٹ کر دیکھا تھا۔ ہاتھ پیر پھرائے تھے۔ گلابی نرم گداز صحت مند بچہ جو آنکھیں کھول کر دیکھتا اور گلا پھاڑ کر روتا تھا۔ ہاتھ پیر چلاتا تھا۔

''اسامہ! دیکھو بالکل صحت مند ہے۔ بالکل ٹھیک۔ الحمدللہ!'' ان کی آواز کانپتی تھی۔ وہ روتی تھیں۔ وہ ہنس رہی تھیں۔ اسامہ نے گہرا سانس بھرا۔ اور عاجز سا ہو کر بولا تھا۔

''کیا ہو گیا ہے ممی! اُرسل بھی پیدا ہونے کے کئی ماہ تک صحت مند رہا تھا۔'' اس کا انداز جلا بھنا ہوا تھا۔ اسے ہرگز خوشی نہیں ہوئی تھی۔

''اللہ نے چاہا تو دیکھنا...... یہ ہمیشہ تندرست رہے گا۔ انشاء اللہ! ہماری، خاص کر اس کی ماں کی دعائیں رائیگاں نہیں جائیں گی۔'' انہوں نے آنسو پونچھتے ہوئے رقت بھری آواز میں یقین سے کہا۔ اسامہ کی آنکھیں بھی بھیگ کر رہ گئیں۔

''انشاء اللہ!'' وہ زیرلب بولا تھا۔ بچے کو سارہ کے ہوش میں آنے کے بعد اسی نے اس کی گود میں دیا تھا۔

''آپ خوش ہیں اسامہ؟'' اس نے روشن آنکھوں سے سوال کیا تھا۔

''دعا کرنا سارہ یہ ہمیشہ تندرست رہے۔'' وہ افسردگی سے بولا تھا۔

''ایسا ہی ہوگا انشاء اللہ!'' وہ یقین سے بولی تھی۔ اسامہ بالآخر مسکرا دیا۔

''ویسے میں تمہاری دعا...... تمہاری امید کا قائل ہو گیا ہوں۔''

سارہ بچے کو پیار کر رہی تھی۔ سر اٹھا کر اسے دیکھنے لگی۔

''آزمائش پڑنے پہ صحیح سمت کا تعین بھی اللہ کی رحمت ہوا کرتی ہے۔ ماں بننے کے بعد ہی تو عورت صحیح معنوں میں دعا مانگنے کے ہنر سے آگاہ ہوا کرتی ہے۔ اور اسامہ......! امید کو ڈھونڈا نہیں جاتا۔ امید کو رکھا جاتا ہے اپنے دل میں۔ اپنے ذہن میں، یہ ننھے بیج کی طرح ہوتی ہے چند دنوں میں بیج زمین کی مٹی سے تو باہر آ جاتا ہے مگر اسے درخت بننے میں بڑی دیر لگتی ہے۔ لیکن وہ درخت بنتا ضرور ہے۔ میں

نے اپنی امید کو اپنی ممکنات کے دائرے میں نہیں رکھا میں جس سے مانگتا تھا۔ وہ کچھ بھی ناممکن نہیں رکھتا۔ میں اتنا جانتی ہوں۔ میں نے اپنی امید کو دعا کے قلب میں ڈھال دیا۔ اور پھر خود کو سراپا دعا کر لیا۔ میں تو یہ سمجھتی ہوں، دنیا میں لاحاصل ہے ہی نہیں۔ جو ہم چاہیں وہ ہماری دسترس میں ضرور آ جائے گا۔ اگر ہمیں اپنے رب پر مکمل بھروسہ اور یقین ہے۔ امید رب سے تعلق جڑنے سے پیدا ہوتی ہے نا امیدی شیطان کا ہتھیار ہے میں جانتی ہوں۔ سو اس سے بچتی رہی۔"

وہ بہت جذب سے اس سے کیفیات شیئر کرتی رہی۔ اسامہ مسکراتا رہا۔

"مجھے لگتا ہے بھابی کی قربت کا اثر ہو گیا ہے تم پہ۔ ویسی ہی باتیں کرنے لگی ہو۔" سارہ کھل کر مسکرا دی تھی۔

"اس میں کوئی بھی شک نہیں۔ بہت نائس ہیں وہ، بہت خاص! اللہ نے بہت ہمت اور حوصلہ عطا فرمایا ہے انہیں۔ دعا ہے ہارون بھائی بھی ان کی قدر کرنے لگیں۔"

"ہاں بالکل، جیسے میں تمہاری کرنے لگا ہوں۔" اسامہ کے چھیڑنے پہ سارہ نے گھورا تھا۔

"آپ تو رہنے ہی دیں بس۔ جتنے کٹھور ہیں ناں......"

"تم مجھے کٹھور سمجھتی ہو سارہ......؟ حالانکہ یہ حقیقت ہے کہ میں محرومی دیکھ چکا ہوں۔ یہ بہت تکلیف دہ ہے، بہت زیادہ۔ جو دکھ میں خود برداشت کر چکا تھا وہ کسی تھرڈ پرسن کے لیے بھی تصور نہیں کر سکتا تھا کجا اپنی اولاد...... تم یہ سمجھتی رہیں کہ میں ارسل کو اس لیے نہیں ملتا، اسے اس لیے نہیں دیکھتا کہ وہ مجھے اچھا نہیں لگتا۔ سارہ میں اسے اس لیے نہیں دیکھتا تھا کہ مجھ سے اس کی محرومی برداشت نہیں ہوتی تھی۔ مجھ سے اس کا دکھ سہا نہیں جاتا تھا۔ ایسا ہوتا ہے ناں کہ ہم فرار چاہ رہے ہوتے ہیں۔ میں بس فرار چاہ رہا تھا مگر تم نے دوری دے کر مجھے اس فرار سے روک دیا۔ میں نے اس حقیقت کو تسلیم کر لیا کہ مجھے بھاگنا نہیں ہے۔ مجھے اس کا سامنا کرنا ہے۔ اس کا حل نکالنا ہے۔"

یاسیت سے کہتا وہ اس پر اپنی کیفیات آشکار کر رہا تھا۔ سارہ نے کچھ کہے بغیر اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ پہ تسلی آمیز انداز میں رکھ دیا۔

"کبھی کبھار اصلاح کے لیے بھی سختی اپنائی جاتی ہے۔ خواب غفلت سے نکالنے کو جھنجھوڑنا لازم ٹھہرتا ہے۔ بس اتنی سی بات تھی اسامہ! ہر معاملہ جو بھی ہمیں اپنے خلاف لگتا ہے۔ حقیقت میں وہ ہمیں اپنے اندر اترنے، خود کو دریافت کرنے کا ایک راستہ دکھا رہا ہوتا ہے۔ دکھ بڑا ہو، رویوں کی حوصلہ شکنی بڑی ہو تو ایک لمحے کو دل ضرور دھکا کھاتا ہے یہ فطری سی بات ہے لیکن یہ ضرور ہوتا ہے کہ انسان انہی دکھوں کی وجہ سے مضبوط بھی بنتا ہے۔ آپ اپنی جگہ ٹھیک تھے غالباً اور میں خود کو درست سمجھتی ہوں۔ اسامہ اس وقت میں نے سوچا تھا ایک آپ کی رضا تھی اور ایک اللہ کی...... میں نے اللہ کی رضا کا انتخاب کیا۔ آج کامیابی بھی اسی لیے میرے پاس ہے کہ میرا انتخاب درست تھا۔ دیکھیں ہر لحاظ سے میں فیض یاب ہوں۔ اللہ نے صحت مند اولاد سے نواز کر آپ کو مجھے لوٹا دیا۔ اگر میں ڈگمگا جاتی تو اولاد تو چھنتی مجھ سے...... آپ کا ساتھ بھی برقرار نہ رہتا اور جو اللہ کی رضا کو کھوتی وہ الگ۔" اس کے ناصحانہ انداز پر اسامہ قائل ہوئے بغیر نہیں رہ سکا۔

"درست کہا گیا ہے۔ نیک بیوی بھی اللہ کا انعام ہوا کرتی ہے۔ میں اللہ کا شکر گزار ہوں کہ مجھے اس نعمت سے سرفراز کیا گیا۔"

اب آپ ارسل احمد کا علاج کروائیں گے نا اسامہ؟'' سارہ نے اس کا ہاتھ ایک امید سے پکڑا تھا۔ اسامہ کے چہرے پر عجیب سی خفت پھیل گئی۔

''صرف علاج نہیں۔ میں اس کے ہر معاملے میں، ہر مسئلے میں تمہارے ہم قدم ہوں گا۔ انشاء اللہ!''

''اعلیٰ...... اور اب آپ کو اسے پیار کرنے سے پہلے یہ اطمینان بھی نہیں کرنا پڑے گا کہ کوئی آس پاس ہے تو نہیں۔ اور اگر میں اتفاقاً دیکھ لوں تو مجھ پر برسیں گے بھی نہیں۔''

مسکراہٹ دبائے، شرارتی انداز میں کہتی وہ اسامہ کو دیکھ کر کھلکھلائی تھی اسامہ جھینپا تھا اور جھیپ مٹانے کو اسے مارنے کو ہاتھ بڑھایا تھا مگر خود بھی ہنس دیا تھا۔ وہ جھکا اور سارہ کے دہکتے ہوئے گال پہ اپنے ہونٹ رکھ دیے۔ سارہ کی ہنسی تھم گئی۔ اب جھینپنے کی باری سارہ کی تھی۔ دونوں کی نظریں چار ہوئی تھیں۔ دونوں آسودگی میں مسکرا رہے تھے۔

☆......☆......☆

بہار تازہ کے ہاتھ تھامے
برستے بادل کی بارشوں میں
مہکتے آنچل کو سر پر اوڑھے
کوئی گلابوں کی کالی شاخوں پہ
اپنے ہونٹوں سے پھول ٹانکے
کوئی تو ہم کو بھی اتنا سوچے
کہ خود کو ہم پہ ہی وار ڈالے
کوئی تو اتنا لپٹ کے روئے
کہ اب کے ہم کو ہی مار ڈالے

اس نے ایک سرد آہ بھری تھی۔ اور جھک کر سگریٹ سلگانے لگا۔ عجیب تھی اس کی قسمت بھی، وہ ہمیشہ محبت کے پیچھے بھاگتا تھا۔ محبت کے جگنوؤں کو مٹھیوں میں قید کر لینے کی کوشش میں ہلکان...... مگر ہر بار کھلا تھا۔ یہ محض...... محض سراب کے تعاقب کے سوا کچھ نہیں تھا۔ بریرہ اس کی زندگی میں شامل ہوئی تھی تو جوش امید کے ساتھ جذبے بھی زندہ تھے مگر اس کا رویہ، اس کے اندر موجود ہر امید کو بے دلی اور یاسیت میں ڈھال گیا۔ مایوسی ایسی تھی کہ بجائے سنبھلنے کے وہ نیچے گرتا چلا گیا تھا، اسے لگا تھا کہ بریرہ کو اس کی ضرورت نہیں۔ واپس انہی راہوں میں پلٹنے پہ نا امیدی کا جذبہ غالب تھا۔ یا پھر یہ خواہش زیادہ شدید تھی کہ بریرہ اس کی ضرورت محسوس کرتی ہوئی اس کی جانب لپکے۔ وہ اس کی چیز تھا اور کھونا بھلا کسے اچھا لگتا ہے مگر اس کی خواہش اس کا تمسخر اڑاتی رہی، بریرہ نے پلٹ کر نہیں دیکھا۔

دکھ، ہیجان، نا امیدی، صدمہ...... اسے سمجھ نہیں آتی تھی کون سا احساس زیادہ زور آور ہے۔ ایسے میں جب سوہا نے اس سے ہمدردی کی۔ اس سے قرب ہوتا۔ چاہا اسے سمیٹا تو اس نے کوئی رکاوٹ کھڑی نہیں کی۔ وہ محبت کا متلاشی خود ترسی کا شکار ہو رہا تھا۔ اس سے قریب ہوتا چلا گیا۔ تب تک بھی اس کا سوہا سے شادی کا ارادہ نہیں تھا۔ وہ لازماً چاہتا تھا بریرہ کو اس کی انوالومنٹ کا پتا چلے اور وہ اب ہی اس پہ دھیان دے لے جب ہی اس نے بالخصوص اسے اپنے ایسے ارادے سے آگاہ کیا تھا جسے پر عمل کرنے کا خود اس کا ایک فیصد بھی ارادہ نہیں تھا مگر بریرہ کا سپاٹ انداز اس کے اندر غضب کی نفرت اور مزاحمت بھر لایا تھا۔ ضد...... کا یہ ایسا مقام تھا، بے بسی کا ایسا مرحلہ تھا جہاں انسان سب سے زیادہ اپنا خود نقصان کرتا ہے۔ اس نے بھی کیا، وہ جان گیا تھا سوہا اچھی عورت نہیں، اس کے بہت سارے مردوں سے بہت آگے تک تعلقات ہیں۔ پابندیاں قبول کرنا اور گھر بنانا اس کے مزاج کا حصہ نہیں۔ اس کے باوجود اس نے اسے اپنی زندگی میں شامل کر لیا

تھا۔ گویا پوری طرح خود کو تباہی اور بربادی کے حوالے کر ڈالا۔ وہ اندر کھائی کے کنارے بیٹھا تھا۔ اور وہ ضدی بچہ تھا، جو چاہتا تھا کوئی آکر اسے اس کھائی میں گرنے سے بچائے۔ اس کے الفاظ میں سختی مگر آنکھوں میں التجا کا رنگ اتر آیا اور کس کے پاس اتنی فرصت تھی کہ کوئی آنکھوں میں جھانکے اور درد کو سمجھے۔

یہی وجہ تھی کہ وہ ہر گزرتے دن کے ساتھ نفسیاتی طور پر تباہ ہو رہا تھا اس کی تمام تر تباہی کے باوجود دل تھا کہ ابھی تک اس دشمن جاں کا راگ الاپا کرتا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ اس کا سب سے زیادہ عتاب بھی اسی پر ٹوٹ رہا تھا۔

ہیجان کی یہ کیفیت ختم ہوئی تو ملال کا احساس اسے مارے ڈالنے لگتا۔ اس کی تمام تر ستم ظریفی کے باوجود اس میں شک کیا تھا کہ وہ خود ہی نور العین بھی، راحتِ جاں تھی۔ وہ تنگ تھا خود اپنے اس جنون سے۔

ماہر نفسیات سے باقاعدہ علاج کروا رہا تھا مگر جیسے کوئی افاقہ نہیں تھا وہ انا کو جھکاتا اسے سب بتا دیتا۔ شاید یہی حل تھا مگر اب اسے لگنے لگا تھا کہ وہ بہت کمزور پڑ رہا ہے جب ہی بہانے سے اسے یہاں لے آیا تھا۔ شاید قریب رہنے سے ہی یہ مسئلہ حل ہو سکتا تھا مگر مسئلہ حل ہونے کے بجائے مزید گھمبیر ہو گیا تھا۔

سوہا نے اس بات کو انا کا مسئلہ بنا لیا تھا۔ وہ ہر صورت بریرہ کو وہاں سے نکالنے کے درپے تھی۔

''میری موجودگی میں یہ عورت نہیں رہ سکتی۔ اسے واپس بھیجو۔''

''اس بات کا فیصلہ مجھے کرنا ہے کہ مجھے کیا کرنا ہے سمجھیں۔'' ہارون غصے میں آکر جتلا گیا تھا۔

''تم شاید یہ بھول رہے ہو ہارون اسرار کہ یہ گھر تمہارا نہیں رہا ہے اب۔ میرے نام ہو چکا۔ اس میں کسے رہنا ہے اس کی فیصلہ بھی میرا ہوگا۔'' سوہا کا جتلاتا ہوا انداز طنزیہ بھی تھا اور مضحکہ اڑاتا ہوا بھی۔

یہ بھی گئے وقتوں کا حصہ تھا کہ سوہا نے اس سے جہاں اور بہت کچھ لوٹا تھا وہاں یہ گھر بھی اپنے نام کرا لیا تھا۔ شاید وہ اسی مقصد کے تحت اس کی زندگی میں شامل ہوئی تھی۔ ہارون کو سمجھ آئی تو تھی مگر بہت تاخیر سے۔

''اگر ایسی بات ہے تو پھر میری ضرورت بھی ختم ہوئی ہے تمہاری زندگی سے سوہا احمد! میں بھی چلا جاتا ہوں۔'' وہ دکھ سے شل ہو گیا تھا جیسے۔ سوہا گڑبڑائی۔

''تم بات کو سمجھنے کی کوشش کیوں نہیں کرتے ہو ہارون! تم نے مجھے کبھی اپنی خاندانی بیوی کی حیثیت نہیں دی۔ تم میری خواہش کے باوجود کبھی اپنی فیملی سے ملوانے لے کر نہیں گئے پھر میں کیوں برداشت کروں اسے۔''

''اس لیے کہ میں ایسا چاہتا ہوں۔'' ہارون نے بات ہی پلٹا دی۔ اور سوہا مصلحتاً خاموش ہو گئی۔ مگر یہ مصلحت باقی معاملات میں قائم نہیں رہی۔ اس کا رویہ قدم قدم پہ بریرہ کے ساتھ ہتک آمیزی سمیٹ لایا۔ وہ ملازماؤں سے بھی بدتر انداز میں اس سے بات کرتی تھی۔ ایسے میں بریرہ کا تدبر، اس کا تحمل دیکھنے کے لائق ہوا کرتا تھا۔ اگر ہارون خود کئی بار یہ سب نہ دیکھ لیتا تو اسے کبھی بھی معلوم نہیں ہوتا۔ پہلے تو اس نے سوہا کی خود طبیعت واش کی تھی پھر بریرہ سے الجھنے کھڑا ہو گیا۔

''تمہاری زبان اگر ہے تو اس کا استعمال بھی کر لیا کرو۔ کیوں تم نے اس واہیات عورت کی اتنی بدتمیزی برداشت کی آخر؟'' وہ غصے میں سرخ ہو رہا تھا بریرہ نرمی سے مسکرانے لگی۔

''اٹس او کے ہارون! غلطی میری ہی تھی۔ مجھے

ابھی اس گھر کے طور طریقوں کا نہیں پتا ناں تو......"

"شٹ اپ بریرہ! تمہاری اس خواہ مخواہ کی عاجزی سے وہ اتنی سر چڑھ رہی ہے۔ ایک بات یاد رکھو۔ ہر شخص ایسا نہیں ہوتا جو آپ کی شرافت کے مظاہرے کو آپ کی عاجزی سے تعبیر کرے۔ آج کل لوگ اس میں اپنی برتری سمجھتے ہیں، یوں اور شیر ہوتے ہیں۔

"اچھائی اور بھلائی کو جاری رہنا چاہیے ہارون! اگر برائی ہار ماننے کو تیار نہیں تو اچھائی اور نیکی کیوں ہار تسلیم کرے اور بلاشبہ بھلائی کی تاثیر بالآخر اپنا آپ منوالیتی ہے۔" اس کا سمجھانے کا، قائل کرنے کا انداز وہی دھیما پن لیے تھا۔ ہارون ٹھنڈا سانس بھر کے رہ گیا۔ گویا کہہ رہا ہو کہ تمہیں سمجھانا میرے بس کی بات کہاں۔

"مجھے اک بات کرنی تھی آپ سے۔" بریرہ کے مخاطب کرنے پر ہارون جو پلٹ چکا تھا تھم کر اسے دیکھنے لگا۔

"ایک اخبار سے مجھے دینی کالم لکھنے کی آفر ہوئی ہے۔ یہ بھی ایک تبلیغ کا انداز ہے۔ آپ کی اجازت چاہیے تھی۔"

"جھکی پلکوں کے ساتھ بات کرتی وہ بلا کی حسین گڑیا لگتی تھی۔ جو اپنی نزاکت و دلکشی کے باعث نگاہوں کو جکڑ لیا کرتی ہے۔ سحر طاری کر دینے کے فن سے آگاہ ہوتی ہے۔

"اس میں اجازت کی کیا ضرورت ہے۔ تم کر سکتی ہو۔"

"اسے اتنی آزادی ہے اور میں...... میرے ہر کام پہ اعتراض ہے۔ ہارون اسرار تم جہنم میں جاؤ گے سیدھے، دیکھ لینا۔ دو شادیوں کا پتا تھا تمہیں مگر ان میں بیلنس کیسے رکھنا ہے یہ خبر نہیں تھی۔"

سوہا جانے کس کونے سے نکل کر چیخنے لگی تھی۔

بریرہ کے چہرے پر بدحواسی چھا گئی۔

"اپنی بکواس بند کرو اور جاؤ یہاں سے۔" ہارون کا لہجہ سخت اور پھنکارتا ہوا تھا۔

"یہ عزت ہے تمہاری نظروں میں بس میری کہ اس دو ٹکے کی عورت کے سامنے مجھے ذلیل رسوا کرو۔"

سوہا حلق کے بل چلائی اور باقاعدہ آنسو بہانے لگی۔

"اسے پردوں میں چھپا کر رکھتے ہو اور مجھے...... مجھے ہر جگہ نمایاں کر کے ساتھ لیے پھرنے کا کیا رعب ہے۔ ہارون اسرار؟ بیوی کا درجہ تو اسی کو دیتے ہو تم۔ میں تو جیسے کوئی نمائشی چیز ہوں تمہارے لیے۔"

ہاتھ میں پکڑا قیمتی موبائل طیش میں فرش پر مار کر وہ چیخی تھی۔ بریرہ گھبرا کر وہاں سے چلی گئی۔ ہارون اسرار طنزیہ مسکرایا۔

"تو نہ کروا اپنی نمائش۔ کم از کم میں نے تمہیں اس کام پہ نہیں لگایا۔ اور بریرہ سے اپنا مقابلہ کرنا چھوڑ دو۔ اس کا اور تمہارا واقعی کوئی مقابلہ نہیں ہے، کسی بھی لحاظ سے۔"

سوہا ششدر رہ گئی۔ جب یہ سکتہ ٹوٹا تو قیامت برپا ہو گئی تھی۔ وہ پاگلوں کی طرح بپھر کر آگے آئی اور ہارون اسرار کو زوردار دھکا دیا تھا۔

"تو اعتراف کر لیا بالآخر تم نے وہ خاص ہے تمہارے لیے تو سنو ہارون اسرار! میں لعنت بھیجتی ہوں تم اور اس پر بھی۔ مجھے طلاق دو ابھی اسی وقت اور دفع ہو جاؤ میرے گھر سے۔ یہ طے ہے کہ میں اب مزید ایک لمحہ بھی برداشت نہیں کر سکتی۔"

ہارون کچھ لمحوں کو بالکل ساکن رہ گیا تھا۔

"مہر کی لاکھوں کی رقم بچانے کو تم مجھے ہرگز طلاق نہیں دو گے ہے ناں؟ مگر یہ خام خیالی ہے تمہاری۔ اگر تم نے مجھے شرافت سے نہ چھوڑا تو میں کورٹ میں چلی جاؤں گی۔ بس ختم ہو جانا چاہیے

اب یہ کھیل۔'' اس کے لہجے کی حقارت اور نفرت بتاتی تھی اب کوئی گنجائش باقی نہیں بچی۔

میں تمہیں طلاق دیتا ہوں۔

طلاق دیتا ہوں۔

طلاق دیتا ہوں۔

مہر کی رقم تمہیں کاغذات کے ساتھ مل جائے گی۔'' ہارون کے لہجے میں کمال درجے کا سکون تھا۔ یوں جیسے عرصے بعد کسی بھاری بوجھ سے نجات حاصل ہوئی ہو۔ یہ کیفیت یکطرفہ نہیں تھی۔ دوسری جانب سوہا کا بھی وہی حال تھا۔

☆......☆......☆

''السلام علیکم!''

دروازہ ایک دھماکے سے کھول کر وہ ننھی بچی کی طرح بھاگتی ہوئی اندر آئی اور بانہیں پھیلا کر اُم جان سے لپٹ گئی پھر بابا جان کے گلے کا ہار بنی تھی۔

''آئی ایم ویری سوری مسنگ یو ام جان اینڈ بابا جان۔'' وہ کھلکھلائی تھی۔ بابا جان نے محبت سے اس کا گال نرمی سے تھپک دیا اور عبدالہادی سے ملنے لگے جو مسکرا رہا تھا۔

''حج بہت مبارک ہو۔ اللہ پاک قبولیت کے درجے عطا فرمائے آمین۔'' وہ ان کے سینے سے لگ گیا۔

''ثم آمین۔ جزاک اللہ واحسن جزا۔'' بابا جان کا لہجہ مشفقانہ وعاجزانہ تھا۔

''سب بہت کٹھور ہیں۔ کسی نے بھی یاد نہیں کیا مجھے ام جان! اتنی بور ہوتی رہی میں وہاں۔'' وہ لاریب سے مل کر ان کے پاس وہاں بیٹھی تھی اور شکوہ کیا۔

''اتنا شاندار ساتھی ساتھ کیا تھا تمہارے، پھر بوریت کا کیا سوال۔'' لاریب نے لقمہ دیا۔ علیزے قدرے جھینپ کر رہ گئی۔ اس کے چہرے کے ان حسین رنگوں کو لاریب نے بہت دھیان سے دیکھا تھا اور محسوس کیا تھا۔

''علیزے بیٹے ان سے ملو۔ یہ بھی تمہاری بھاوج ہیں۔ عبیر عبدالغنی!''

بابا جان نے خود عبیر کو آواز دے کر باہر بلایا تھا۔ وہ بہت گریزاں لگتی تھی۔ جھجکتی ہوئی آ کر وہاں آئی اور سلام کیا تھا۔ جس کا جواب عبدالہادی نے پُر خلوص مسکراہٹ کے ساتھ دیا تھا۔ علیزے البتہ یکدم بہت خاموش ہو کر رہ گئی تھی اس نے ہونٹ بھینچ کر لاریب کو دیکھا جس کے چہرے پر یکدم ہی تاریکی کا احساس چھا گیا تھا۔ آنکھوں میں دکھ کے ساتھ رقابت کے رنگ بھی گہرے تھے۔ عبیر نے خود بڑھ کر اپنا نازک، سنہری ہاتھ مصافحے کو بڑھایا جسے علیزے نے بہت بے دلی سے جیسے مجبوراً تھاما اور رسم نبھا کر چھوڑ دیا۔ انداز کی بیگانگی اور رکھائی عبیر کو محسوس ہوئی تھی۔ جب ہی اس کی سنہری رنگت میں خفت کا احساس شامل ہو گیا تھا۔

''بھائی کو کیا ضرورت پڑ گئی تھی شادی کی؟'' وہ چیخ چیخ گئی تھی۔

''علیزے......!!!'' بابا جان کی تنبیہہ میں کافی خفگی تھی۔ علیزے کا منہ لٹک گیا۔ عبدالہادی نے چہرہ پھیر کر سرعت سے مسکراہٹ چھپائی۔ اس کے باوجود علیزے کی تیز نگاہ سے بچ نہیں سکا تھا۔ وہ اسے گھورتی ہوئی ایک جھٹکے سے اٹھی تھی کہ ام جان نے اس کی ناراضگی محسوس کرتے نرمی سے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے اپنے پاس بٹھا لیا۔

''پوچھو گی نہیں میری بیٹی میں نے کیا دعا مانگی ہے وہاں اس کے لیے۔'' ان کے انداز میں خصوصی محبت کا رنگ تھا۔ علیزے کی آنکھوں میں اشتیاق در آیا۔

''جی بتایئے ناں، کیا دعا مانگی؟''

''عبیر بیٹے آپ چائے بنا لاؤ۔ اور مجھے دیکھ کر

بتاؤ اگر کسی چیز کی ضرورت ہے تو۔'' بابا جان نے عمیر کو وہاں نظر انداز ہوتا محسوس کیا تو نرمی سے مخاطب کیا تھا۔ عمیر نے کنفیوز ہوتے لاریب کو دیکھا تھا۔ اسے لاریب کی تنبیہہ یاد تھی۔ وہ اس کا کچن میں جانا ہرگز پسند نہیں کرتی تھی۔ مگر یہ حکم بابا جان کا تھا۔ اب تو لاریب کی مجال بھی نہیں تھی بولنے کی۔ اس کے باوجود وہ بہت خائف سی بیٹھی تھی۔''

''میں نے دعا مانگی ہے اللہ پاک میری بیٹی کی گود نیک اور صالح بیٹے سے بھردے۔'' ام جان نے اسے ساتھ لگا کر ماتھا چوما تھا اور نہایت محبت سے کہا۔ علیزے بے تحاشا سرخ پڑ گئی۔ نگاہ اٹھائے بغیر ہی اسے عبدالہادی کی پُرتپش نظروں کا احساس چہرہ تپاتا ہوا محسوس ہورہا تھا۔ وہ ام جان کی آڑ میں ہو کر اپنا چہرہ اس کی نظروں سے محفوظ کر گئی تھی۔

''افوہ ام جان آہستہ۔ بابا جان بھی یہیں ہیں۔ مجھے سخت شرم آرہی ہے۔'' ام جان کے ساتھ لاریب بھی بے تحاشا ہنسنے لگی تھی پھر اس کے بازو میں چٹکی بھری تھی۔

''صرف بابا جان سے کیوں؟ عبدالہادی سے یہ شرم کیوں نہیں آرہی؟ وہ بھی موجود ہیں محترمہ! کیا دوستی ہوگئی ہے ان سے جواب یہ بات بری نہیں لگی۔ پہلے تو کاٹ کھانے کو دوڑتی تھیں۔''

وہ اس کے کان میں گھس کر سوال کرتی اسے سخت عاجز کر گئی۔

''اچھا بکو مت۔ میرا ایسا ہرگز کوئی مطلب نہیں تھا۔ اور فاصلے پر ہٹو۔ معاملہ ایسا چل رہا تھا کہ وہ محترم سمجھیں گے میری تجربہ کار بھابی مجھے ضروری ٹپ دے رہی ہیں۔'' وہ کھلکھلائی تھی لاریب نے خوشگوار حیرت میں گھر کر اسے دیکھا اور دل سے مسکرائی۔

''واقعی بدل گئی ہو۔ لگتا ہے محترم عبدالہادی صاحب کے حسن کا جادو چل گیا ہے۔'' لاریب کا انداز ہنوز سرگوشیانہ تھا۔ علیزے نے سر نخوت سے جھٹک دیا۔

''یہ حسن پہلے بھی کہیں گیا ہوا نہیں تھا۔ میں اس سے گھائل ہونے والی نہیں تھی۔''

''پھر کیا کارنامہ انجام دیا موصوف نے؟'' لاریب کی حیرت قائم دائم تھی۔ وضاحت طلب بھی۔

''یہ تو بس اللہ کا کام ہے لاریب! میرے تمام شکوک و شبہات اسی نے دور کیے ہیں۔ میرے دل میں ان کی محبت ایسے غیر محسوس انداز میں پیدا کی کہ خود مجھے بھی علم نہیں ہوسکا۔'' علیزے کے انداز میں خوشبو سی مہکنے لگی۔ لاریب اسے دیکھتی رہ گئی۔

''اچھا دیٹس گڈ! یہ بتاؤ ام جان کی دعا قبول بھی ہوئی؟ یعنی کوئی خوشخبری ہے تمہارے پاس۔'' اس کا انداز چھیڑتا ہوا تھا۔ علیزے پھر سے گلابی پڑنے لگی۔

''اتنی اتاولی مت بنو تم۔'' وہ مصنوعی غصے سے کہہ کر دوسری جانب دیکھنے لگی۔

''میں کیوں! یہ عبدالہادی صاحب کو ہونا چاہیے آثار بتاتے ہیں جلد ہی سن لیں گے یہ گڈ نیوز بھی۔'' لاریب کا انداز شریر تھا علیزے اب کہ اتنا جھینپی تھی کہ بنا لحاظ کے اسے گھونسا دے مارا تھا۔

''بہت بدتمیز ہو۔'' وہ جھینپ مٹانے کو اسے گھور رہی تھی۔ عبدالہادی سمیت بابا جان اور ام جان نے بھی چونک کر انہیں دیکھا۔

''کیا ہوا؟'' ام جان حیران تھیں۔

''بتا دوں؟'' لاریب نے شرارت کو طول دیا۔ علیزے نے پھر مکا تان لیا۔

''خبردار!'' وہ چیخی تھی۔ لاریب ہنستے ہوئے اٹھ گئی۔

☆☆

اے خاصۂ خاصان رسل وقت دعا ہے
امت پہ تیری آکے عجیب وقت پڑا ہے

"افراتفری کہ اس دور میں ہر کوئی پریشان ہے۔ ہر چہرے پہ سوال ہے۔ سکون کی تلاش کا سوال خواہش ہے امن کی ایک سیدھی سی بات ہے جو ہماری سمجھ میں نہیں آئی۔ یہ ساری بدنظمی، سارا انتشار مذہب سے دوری کا باعث ہے۔ اللہ کی نافرمانی کا عتاب ہے۔ غفلت کا نتیجہ ہے۔ ابھی چند دنوں پہلے میں نے کسی سے ایک بہت اہم سوال سنا تھا۔ سوچا آج تفصیل جواب دے دوں۔ دین دنیا میں توازن کیسے قائم ہو؟"

"آپ یہ دیکھو یہ دنیا ہے۔ آپ کھاتے ہو، کماتے ہو، لیکن اس دنیا میں بھیجنے والے نے آپ کو ایک روڈ میپ دے کر بھیجا۔ جس کو آپ دین کہیں تو یہ کوئی دنیا سے علیحدہ چیز نہیں ہے۔ آپ جب کوئی نئی مشین خریدتے ہیں تو ساتھ میں ایک بک لٹ ملتی ہے۔ اب وہ بک لٹ تو مشین نہیں ہے لیکن اگر آپ اس بک لٹ میں لکھی ہوئی ہدایت کو اگنور کر دو گے۔ نظر انداز کر دو گے تو مشین لازماً خراب ہو جائے گی۔ سو آپ کا دین دراصل وہ ہدایت والا بک لٹ ہے۔ جب ہم دین کو نظر انداز کر کے دنیا گزارتے ہیں تو خدا کی قدرت ہے۔ زندگی سے سکون و اطمینان اور ترغیب ختم ہونے لگتی ہے۔ ان اہم ضروریات کا فقدان از خود احساس دلاتا ہے اور یہی احساس ہمیں توازن کو قائم رکھنے پر اکساتا ہے۔ کیوں کہ بحر حال شعوری یا لاشعوری طور پر ہمیں مسلمان ہونے کی حیثیت سے یہ احساس بھی دامن گیر رہتا ہے کہ آخر مرنا ہے، اور حساب دینا ہے۔ اب اس قدر آسان ترین طریقہ یہ ہے زندگی میں توازن قائم کرنے کا کہ آپ اپنی دنیا میں دین کو داخل کر لو یا دین کو دنیا میں داخل کر لو، انشاء اللہ مقاصد حاصل ہو جائیں گے۔

آپ ساری دنیا کو دیکھو اور غور کرو کیسے کیسے نظارے رب نے پیدا کر دیے اور پھر ان نظاروں کو دیکھ کر 'سبحان اللہ' کہو تو یہ آپ کا دین ہو گیا۔ اللہ کی بڑائی بیان کرتے رہو اور اللہ کا شکر ادا کرتے رہو۔ بس آپ کا توازن خود بخود قائم ہو جائے گا۔ ہمیشہ یاد رکھیں اللہ اپنے بندے کا ہمیشہ منتظر رہتا ہے آؤ تو سہی فلاح پانے کے لیے دل کے شیشے پہ کتنا میل ہے، کیوں فکر کرتے ہو ایمان کے شیشے پر کتنی ہی گرد اور مٹی کیوں نہ ہو۔ اسے صاف کیا جا سکتا ہے۔ صرف ایک ہاتھ پھیرنا پڑتا ہے اور اس میں عکس نظر آنا شروع ہو جاتا ہے۔ اور وہ ہاتھ محبت کا ہاتھ ہوتا ہے۔ محبت ایمان سے ہوتی ہے۔ رب سے ہوتی ہے......"

آگے صفحہ خالی تھا۔ قلم کاغذ کے درمیان میں کھلا پڑا تھا۔ صاف لگتا تھا وہ لکھتے ہوئے کسی کام سے اٹھ گئی ہو گی۔ ہارون نے گہرا سانس بھر کے دونوں ہاتھ آنکھوں پر رکھ دیے اس کی آنکھوں کی جلن یکلخت بے تحاشا بڑھ گئی تھی۔ اس کی کتنی خواہش تھی کہ کبھی بریرہ اپنی ساری صلاحیتیں اس پہ صَرف کر دے۔ اسے ہر برے کام سے روک کر اچھائی کے راستے پر اپنے ہمراہ کر لے مگر......

"ہارون......!" وہ اس کی آواز پہ چونکا تھا اور سرخ نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔

"آپ نے سوہا سے جیسے بات کی، ایسے نہیں کرنا چاہیے تھی۔ اگر انہیں شکایت ہے تو اچھی بات ہے یہ تو۔ وہ بھلائی کے راستے پر چلنے کی خواہش مند ہیں۔ ہم ان کا ساتھ دیں گیآپ ان کی باتوں کا برا نہ مانا کریں بلکہ انہیں سمجھنے کی کوشش کریں پلیز!"

وہ عاجزی سے کہہ رہی تھی ہارون اسی خاموشی سے اسے دیکھتا رہا۔

"برے لوگوں کو بھول کر اچھے لوگوں کی تلاش سے کہیں بہتر ہے کہ لوگوں کی بڑی باتیں بھول

جائیں۔ اور ان میں اچھی باتوں کو تلاش کریں۔" وہ اپنی بات پر زور دے کر کہہ رہی تھی۔ ہارون کھنکھارا۔

"اب اس کی ضرورت نہیں رہی۔ بی کوز میں اسے طلاق دے چکا ہوں تم نے جو بھی اس پہ اپنی توانائیاں صرف کرنی تھیں مجھ پہ کرلو۔ میں بھی منتظر ہوں تمہاری ایسی ہی توجہ کا کب سے۔"

اس کا لہجہ سنجیدگی لیے تھا۔ بریرہ کو جیسے سکتہ ہوتے ہوتے رہ گیا۔

"کیا کہہ رہے ہیں ہارون......!!" اس کے حلق سے آواز پھنس کے نکلی تھی۔ ہارون نے یوں ہونٹ بھینچے جیسے ضبط کے کسی دشوار اور کڑے مرحلے سے گزر رہا ہو۔

"مجھے یہ بتاؤ بریرہ! میں نے اس سے شادی کی۔ تمہیں دکھ ہونا چاہیے تھا۔ تمہیں دکھ نہیں ہوا۔ میں نے اس عورت کے عذاب سے اپنی جان چھڑالی۔ تمہیں خوشی ہونی چاہیے تھی۔ تمہیں شاک لگا۔ میری خوشی تمہاری خوشی نہیں بن سکتی۔ میرا دکھ تمہیں بھی متوجہ نہیں کرسکا۔ اس کے باوجود تم مجھ سے محبت کی دعویدار ہو۔ ہاہ...... یہ کیسی محبت ہے بریرہ! میں کسی سوالی کی طرح ہمیشہ ان دیکھا دامن پھیلائے تمہاری محبت کا طلبگار بنا بیٹھا رہا۔ تمہیں پتا نہیں چل سکا، پھر بھی تم کہتی ہو کہ تمہیں میرا احساس رہا۔ کیسے یقین کروں؟" وہ جیسے روسا دیا بریرہ گنگ تھی اس کی صلاحیتیں جیسے گہرے صدمے نے بے کار کرڈالی تھیں۔

"ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ میں اس خون چوسنے والی بلا کو چھوڑنے کے بجائے تمہیں چھوڑ دیتا اور خود کو مکمل بربادی کی نذر کر ڈالتا مگر اس دل کا کیا کروں...... جو انا کو خاطر میں لاتا بھی تھک گیا تھا۔ وہ کاسہ جو میں نے کبھی نہیں پھیلایا اسے تمہارے سامنے پھیلانے پر مجبور ہوگیا۔ اس میں اپنی محبت، اپنی توجہ کے سکے ڈال دو۔ میری بیمار روح کو شفا نصیب ہو جائے۔ میرے سسکتے دل کو قرار آجائے میرے زخمی دل پہ مرہم لگ جائے......"

وہ باقاعدہ ہچکیوں سے رونے لگا تو بریرہ کے حلق سے کربناک چیخیں نکلنے لگی تھیں۔ وہ سب کچھ فراموش کر کے بھاگی آئی تھی اور اس کے سامنے گھٹنوں کے بل گر گئی تھی۔ اس کے قدموں میں اپنا چہرا جھکا کہ زارو قطار رونے لگی۔

"اللہ کی قسم کھا کر کہتی ہوں ہارون! یہ غفلت نہیں تھی۔ یہ بے نیازی اور نفرت بھی کیسے ہوسکتی تھی کہ میرے دل نے اللہ جانتا ہے، آپ کے نام پہ دھڑکنا سیکھا تھا۔ آپ کی محبت نے دل میں جگہ پائی تھی۔ ہاں میں علیزے کی طرح دن رات آپ کو سمجھانے کا فریضہ اس لیے انجام نہیں دے سکتی کہ آپ کی خفگی سے ڈرتی تھی۔ آپ کی ناراضگی کا خیال آپ کو مجھ سے دور رکھتا تھا۔ یہ گریز اور شرم کے علاوہ اور کچھ نہیں تھا حالانکہ ایسا نہیں ہونا چاہیے تھا۔ اس کوتاہی پر مجرم ہوں میں آپ کی۔ مجھے اعتراف ہے، مجھے کبھی اندازہ نہ ہوسکا۔ میرا یہ گریز کس درجہ تباہی و بربادی کا باعث بن گیا لیکن آپ بچ گئے۔ آپ بھٹکنے سے بچالیے گئے ہارون۔ یہ بھی رب کی رحمت ہے۔ میں سمجھ سکتی ہوں۔ یہ دعاؤں کی قبولیت کا اشارہ ہے۔ یقین کریں میں دن رات خدا سے آپ کے راہ راست پہ آنے کی دعائیں مانگتی تھی مجھے معاف کر دیں اور ایک اور موقع دے دیں۔ وعدہ کرتی ہوں سارے شکوے دور کر دوں گی۔ پلیز...... پلیز۔"

ہارون نے بے ساختہ ٹھٹکتے ہوئے اسے دیکھا۔ اس کی پوزیشن وہی تھی۔ انداز ایسا لگ رہا تھا اگر معافی کا اشارہ نہ ملا تو روتے، سسکتے، تڑپتے جان ہار دے گی۔ وہ بے اختیار جھکا تھا اور اسے شانوں سے

تھام کر نرمی سے اپنے مقابل کرلیا۔ بریرہ دھندلائی ہوئی نظروں سے اسے دیکھتی سسکیاں بھرتی رہی۔ پھر بے اختیار اس کے سینے سے لگ گئی تھی۔ ہارون نے اسے بازوؤں کے حصار میں مقید کرلیا تھا۔

''انسان مایوس یا پریشان اس وقت ہوتا ہے جب اپنے رب کو راضی کرنے کے بجائے لوگوں کو راضی کرنے لگ جائے۔ بریرہ! میری ساری جان کا ہی کی بس اتنی سی کہانی ہے۔ میں نے اس اہم بات کو فراموش کردیا تھا ہے ناں۔''

''آپ ٹھیک کہتے ہیں ہارون! اور اللہ کا ہی پہلا حق ہے ہماری محبت و خلوص پہ۔''

بریرہ نے اس کا چہرہ ہاتھوں کے پیالے میں لے کر نرمی سے آنسوؤں میں نمی چنی۔

''میں نے کہیں پڑھا تھا بریرہ! مرد چاہے خود سارے جہان کی خاک چھان لے لیکن جب وہ شریک حیات کا انتخاب کرتا ہے تو نیک اور پارسا عورت چاہتا ہے۔ میں اسے فرسودہ بات تصور کرتا تھا۔ میں خود کو براڈ مائنڈڈ سمجھتا تھا شاید اس لیے۔ لیکن جب میں نے یہ انتخاب کیا تو لاشعوری طور پر یہ بات سچ ثابت ہوگئی۔ میں نے جانا میں بھی ایک روایتی مرد ہوں۔ میری سوچ بھی عام ٹیپکل مرد کی سوچ ہے۔ لیکن بریرہ میں نے اب جانا ہے اصل میں وہ میرا نہیں اللہ کا انتخاب تھا۔ اللہ نے مجھے ہدایت کے لیے چنا تھا۔ میں نے جب تمہیں پہلی بار وعظ کرتے سنا تو میں بے اختیار خواہش مند ہوگیا تھا تمہاری ہمراہی کا میری تمنا تھی میں تمہارے ساتھ ایک ایسے گھر کی بنیاد رکھوں جس میں سب قوانین اللہ کے قوانین ہوں۔ جس میں اللہ کی خوشنودی کا ہر لحاظ سے خیال رکھا جائے لیکن مجھے اس خواہش کی تکمیل میں بہت صبر اور انتظار کرنا پڑا۔ شاید تب میں اس قابل نہیں تھا۔''

بریرہ نے گہرا سانس بھرا اور اس کے ہاتھوں کو تھام کر بہت عقیدت مندانہ بوسہ ثبت کیا تھا۔

''ہم انشاء اللہ اب ایسے گھر کی بنیاد رکھیں گے جہاں اللہ کے قوانین نافذ کیے جائیں گے۔ ہم اپنے بچوں کو دین پہ عمل کرنا نہیں سکھائیں گے، محبت سے عمل کرنا سکھائیں گے۔ فرض کی ادائیگی کا ہی نہیں بتائیں گے، خلوص کے ساتھ ادائیگی کا بتائیں گے۔ کیوں کہ اگر صرف عمل ہو، خلوص اور محبت نہ ہو تو کسی بھی لمحے دین سے دوری ممکن ہے۔ محبت و اخلاص ہوگا تو جدائی اور اس کا تصور بھی محال ہوگا۔''

اور ہارون اس کے نظریے کا قائل ہوتا مسکرانے لگا تھا۔ صرف وہی نہیں ماحول میں ہر سو جیسے روشنی سی پھیل گئی تھی۔

☆☆

''آپ اس کے کمرے میں آخر گئے کیسے؟''

عبدالغنی کو اپنی عدالت کے کٹہرے میں کھڑا کیے وہ چلا رہی تھی۔ عبدالغنی نے کسی ناگواری سے اسے دیکھا تھا۔

''اس سوال کا کیا مطلب ہے؟ کیا میں عمیر کے پاس نہیں جاسکتا؟ میں نے تمہیں شاید آگاہ نہیں کیا، تو اب بتا دیتا ہوں کہ میں نے تمہاری اور عمیر کی ایک ایک ہفتے کی باری لگائی ہے۔ لاریب میں جب اس کے ساتھ ہوں گا، تو میرے سب کاموں کی ذمہ داری بھی اس کی ہے، مثلاً ناشتا کھانا وغیرہ ہاں باقی معاملات میں میں ہر وقت تمہیں اور اسے دستیاب ہوں بالکل ویسے جیسے میں اپنے والدین اور بہنوں کو دستیاب ہوں۔ انصاف وعدل کے تقاضوں کو پورا کرنے میں رکاوٹ نہ بنو تم۔ اللہ کے ہاں جوابدہ ہونا ہے مجھے اس معاملے میں۔'' عبدالغنی کا لہجہ گو کہ دھیما تھا مگر اس میں سختی نمایاں تھی۔ لاریب نے جانے کیسے اس کی یہ طویل بات صبر سے سنی تھی پھر متنفرانہ

ہنکارا ابھرا تھا۔
''میں بھی آپ کو یہی بتانا چاہتی ہوں عبدالغنی! کہ میں واپس ایسے ہی نہیں آئی۔ مجھے کسی نے مجبور کیا تھا اور باقاعدہ میری واپسی کو مشروط کیا تھا۔'' اس کا لہجہ طنزیہ تھا۔ عبدالغنی الجھن زدہ انداز میں اسے دیکھنے لگا۔ یوں جیسے کچھ سمجھ نہ پایا ہو۔
''مطلب کیا ہے تمہاری بات کا؟''
''بہتر ہوتا عبدالغنی کہ مطلب خود وہ آپ کو بتا دیتی جس نے عہد شکنی کی کوشش کی۔ جب وہ اپنا حق بخش چکی تھی تو آپ کو اس کمرے میں بلانے کا مقصد کیا تھا۔'' وہ چیخ پڑی تھی۔ عبدالغنی جیسے چکرا کر رہ گیا، اس کی رنگت واضح طور پر متغیر ہوئی تھی۔
''مطلب عمیر نے خود آپ سے کہا کہ......'' وہ حیرت کی زیادتی سے بات مکمل نہیں کر سکا۔ طیش کے باعث اس کی آواز قدرے اونچی ہو چکی تھی۔
''آپ بلائیں اسے یہاں، پوچھیں اس نے مجھے خود کال نہیں کی تھی۔ نہیں کہا تھا کہ میں واپس آ جاؤں۔ وہ آپ سے ہرگز بھی کوئی تعلق نہیں رکھے گی۔ آپ صرف میرے ہوں گے عبدالغنی!'' اس نے روہانسی ہوتے اصل بات واضح کی۔ عبدالغنی کا چہرہ جانے کس احساس کے تحت بے تحاشا سرخ پڑ گیا۔ اس نے وہیں کھڑے کھڑے عمیر کو اونچی آواز میں پکارا تھا۔ اُم جان اور بابا جان گھر پہ نہیں تھے۔ بابا جان کے کسی دوست کے ہاں ان کی دعوت تھی۔ عبدالغنی گھر پہ آیا تو عمیر کو موجود نہ پا کر اس کی خیریت دریافت کرنے بیٹھک میں چلا گیا تھا۔ بس اتنی سی بات تھی۔ کچھ وہ اسے بریرہ کا دیا ہوا تحفہ (انگوٹھی) بھی اسے دینا چاہ رہا تھا مگر لاریب اسے تو عمیر سے بات کرنے کا بھی موقع نہیں دیتی تھی۔ عبدالغنی بھی یہ سوچ کر خاموش رہا کہ جب تک وہ لاریب کے ساتھ ہے اسے ہرٹ نہ کرے۔ عمیر کی باری پر وہ اس سے بات کرنے لگا۔ مگر لاریب نے طوفان اٹھا دیا تھا۔
''ج...... جی۔'' عمیر پہنچ چکی تھی۔ فق رنگت، لرزتی ٹانگوں کے ساتھ صاف لگتا تھا اس کی ذہنی حالت کیا ہو سکتی ہے۔
''بیٹھ جائیں آپ! اور مجھے بتائیں عمیر آپ نے لاریب کو کال کیوں کی؟ کیوں اسے وہ بات کہی؟'' وہ پھر برہم ہونے لگا۔ عمیر کے پاس اس بات کا جواب نہیں تھا البتہ لاریب کو یہ سب سوال جواب اور وضاحتیں بہت انسلٹنگ فیل ہو رہا تھا۔
''میں آپ سے کچھ پوچھ رہا ہوں عمیر!'' عبدالغنی کو اس کی مجرمانہ خاموشی بے حد کھلی تھی۔
''یہ سچ ہے شاہ! میں نہیں چاہتی تھی میری وجہ سے لاریب ہرٹ ہوں۔ میری وجہ سے آپ کا گھر برباد ہو۔'' وہ سسکی تھی۔ لاریب کے چہرے پر اس کے لیے نفرت کا الاؤ سا دہک رہا تھا۔ عبدالغنی عاجز ہو کر رہ گیا۔
''یہ آپ کے مسائل نہیں تھے۔'' وہ تڑخ گیا تھا۔
''لیکن یہ میری وجہ سے ہو رہا تھا۔'' وہ عاجزی سے کہہ گئی۔ عبدالغنی گہرا متاسفانہ سانس بھر کے رہ گیا تھا۔
''بہت بے وقوف ہیں آپ۔ جائیں اپنے کمرے میں۔'' وہ بے حد خفگی سے یہی کہہ سکا۔ عمیر تو جیسے سر پہ پاؤں رکھ کے بھاگی تھی۔
''ہو گئی تسلی؟ مجھ پہ تو جیسے اب یقین ہی نہیں رہا آپ کو۔'' لاریب کلسی تھی۔ غصے سے اس کی صبیح رنگت شہابی ہو رہی تھی۔ عبدالغنی تاسف بھری نظروں سے اسے دیکھتا رہا۔
''کسی کی بے بسی سے فائدہ اٹھانا کم ظرفوں کا شیوہ ہوا کرتا ہے لاریب! میں کیا کہوں؟ میرے پاس تو جیسے الفاظ ہی ختم ہو گئے ہیں۔ بس اتنا سن لو میں نے تم سے محبت کی تھی۔ میں تم سے عقیدت رکھتا

تھا۔ تھا کا مطلب تو سمجھتی ہوگی تم۔ مجھے ڈر ہے کہ میں تم سے نفرت نہ کرنے لگ جاؤں۔ لاریب! اتنا جان لو۔ تم نے آج مجھے بہت دکھ دیا۔ کاش مجھے اندازہ ہو جاتا پہلے۔ تم اتنی بڑی آزمائش بن جاؤ گی تو میں کبھی دوسری شادی نہ کرتا۔''

بے حد یاسیت سے کہتا وہ تھکے ہوئے انداز میں پلٹ کر کمرے سے ہی نہیں گھر سے بھی نکل گیا تھا۔ لاریب ساکت کھڑی تھی۔ کچھ دن پہلے تب اسے ایسا لگا تھا جب عبدالغنی نے دوسری شادی کی اس کا سب سے بڑا نقصان ہوا ہے۔ اس سے بڑا دنیا میں کوئی نقصان نہیں ہو سکتا۔ آج ایک بار پھر اسے اندازہ ہوا یہ نقصان اس کے سابقہ نقصان سے کہیں زیادہ بڑا ہے۔ ہاں اس نقصان سے بڑھ کر اس دنیا میں کوئی اور نقصان نہیں ہو سکتا تھا۔

☆☆

''آپ نے اکثر اس بات کا مشاہدہ کیا ہوگا کہ جب ہم کوئی اچھا کام کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں اس کے مواقع بہت کم اور بہت دیر سے ملتے ہیں لیکن اگر ہم کوئی غلط کام کرنا چاہیں تو اس کے مواقع بہت جلدی جلدی ملنا شروع ہو جاتے ہیں بلکہ وہ کام بھی فٹافٹ ہو جاتا ہے یہ اس لیے ہوتا ہے کہ برائی ہمیشہ خوشنما شکل لیے آگے پیچھے پھرتی رہتی ہے اور اچھائی پردے میں چھپی ہمارا انتظار کر رہی ہوتی ہے کہ ہم جائیں اور اسے پورے وقار کے ساتھ اپنا لیں۔''

وہ لزا سے محو گفتگو تھا۔ آواز وہاں تک آ رہی تھی۔ علیزے کا ضبط بالآخر جواب دے گیا۔ اس نے چائے کی پتی کا ہاتھ میں پکڑا جار ایک جھٹکے سے پختہ فرش پر پٹخ دیا۔ کانچ ٹوٹنے کی آواز ابھری اور ٹکڑے بکھر گئے اس کا خیال تھا۔ لازمی عبدالہادی اٹھ کر آئے گا مگر وہ گفتگو میں مشغول رہا تھا یعنی کوئی فرق نہیں پڑا تھا۔

''تمہاری باتوں کا یہی سحر تھا، جو مجھے وہاں سے یہاں تک کھینچ لایا۔'' لزا نے لپک کر کہا تھا۔ علیزے کا طیش سے برا حال ہونے لگا۔ وہ تو اسے دیکھ کر آدھے سے زیادہ خون جلا چکی تھی۔ رہا سہا اب ختم ہو رہا تھا۔

''تم یہاں رہ کیسے رہے ہو آخر؟ امیزنگ! کہاں وہ محل! کہاں یہ ٹوٹا پھوٹا کبوتر کے کابک جیسا مکان! واپس چلو یوسف۔''

لزا نے اسے اپنا سبق پڑھانے کی کوشش کی۔ علیزے نے اسے جا کر کھری کھری سنانا چاہی تھیں مگر وہ ایک سے دوسرا قدم نہیں اٹھا سکی۔ وہ بغیر چپل کے تھی۔ عقل تو لزا کی آمد نے ماؤف کی ہوئی تھی۔ کانچ کے ٹکڑوں کا خیال کس کو رہنا تھا نتیجہ ظاہر تھا۔ اس کے دونوں پیر اسی غفلت میں بری طرح فگار ہو چکے تھے۔ کہاں کا ضبط اور صبر۔ وہ تو جیسے سب بہہ گیا تھا۔ عبدالہادی اس کی دل خراش چیخوں کی آواز پر بدحواس بھاگا آیا تھا۔

''مائی گڈنیس! یہ کیسے ہو گیا؟'' وہ اس کے زخمی پیر اور اتنا خون دیکھ کر گھبراہٹ کا شکار ہونے لگا تھا۔

''لیزے پلیز تو ٹیز ریلکس ڈارلنگ! ابھی رک جاتی ہے بلیڈنگ۔'' وہ سراسیمہ سا کہتا اسے بازوؤں میں سنبھال کر اندر لایا تھا اور بستر پر بٹھا کر ٹانگوں کے نیچے تکیہ رکھ کر اس کے پیروں کا جائزہ لینے لگا۔

''بہت گہرے کٹ ہیں یوسف! اسٹیچنگ ہوگی۔ ڈاکٹر کے پاس لے کر چلو نا اسے یار۔''

لزا بھی خاصی پریشان ہو چکی تھی۔ فکر مندی سے اس کے گھائل پیروں کے تلوؤں کو دیکھ کر بولی۔

''گاڑی چاچو لے کر گئے ہوئے ہیں۔ میں ڈاکٹر کو یہیں بلا کر لاتا ہوں بس دو منٹ لیزے!''

وہ لمحہ بھر کو اس کے پاس رک کر گال سہلا کر بولا

نمک کی تاریخ

ماہرین آثار قدیمہ اور مؤرخین اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ نمک کا استعمال بہت قدیم ہے، یعنی اس کی شہادت پتھر کے زمانے سے ملتی ہے۔ ابتدا ہی سے غذا اور ادویات میں استعمال ہونے کی وجہ سے اس کی اہمیت بہت بڑھ گئی تھی، جس کا اظہار قدیم مصنفین کے ہاں ملتا ہے۔ مثلاً یونانی شاعر اسے الٰہی مادہ (divine substance) کہتا ہے۔ افلاطون کے مطابق، یہ خدا کے نزدیک ایک پسندیدہ شے ہے، اس وجہ سے اس کی قدر و قیمت بڑھ گئی۔ ابی سینیا، یا حبشہ میں جب مہمان آتا تھا تو اسے بطور عزت نمک کی ڈلی پیش کی جاتی تھی، تاکہ وہ اُسے چاٹے۔ پائرینیز (Pyrenees) کے علاقے میں یہ دستور تھا کہ شادی کے وقت مرد کی بائیں جیب میں نمک کی ڈلی رکھ دی جاتی تھی، تاکہ وہ مردانگی کی حفاظت کرے۔ سویڈن کے کچھ علاقوں میں یہ دستور تھا کہ لڑکیوں کو خوابوں والا دلیہ کھلایا جاتا تھا، جس میں خوب نمک ہوتا تھا، اور پھر بغیر پانی پیے وہ سو جاتی تھی، تاکہ اُس کا مستقبل کا شوہر خواب میں آئے، اور اُس کی پیاس بجھائے۔ یورپ میں یہ آداب میں سے تھا کہ نمک کو انگلیوں سے نہ چھوا جائے۔ اسے برتن سے چاقو کی نوک پر لیا جاتا تھا، اور پھر پلیٹ میں ڈالا جاتا تھا۔ اُمرا کھانے کی میز پر نمک رکھتے تھے، تاکہ اِس سے اُن کی دولت اور امارت ظاہر ہو۔

برِصغیر ہندوستان میں یہ رسم ہے کہ مزاروں پر، یا کچھ رسومات کے وقت بچوں کو نمک چٹایا جاتا ہے، تاکہ اُنھیں برکت ملے، اور وہ آفتوں سے محفوظ رہیں۔ (مطالعہ۔ رخسانہ رضوی۔ لندن)

تو، تو علیزے نے بے اختیار اس کا ہاتھ اپنے کانپتے ہاتھوں میں دبوچ لیا تھا۔

''پلیز! مجھے تنہا نہ چھوڑ کر جائیں۔'' وہ اور شدت سے رو پڑی۔ عبدالہادی مخمصے میں پڑ گیا۔

''لیزے پلیز کنٹرول یور سیلف! دیکھو اس وقت اس کے سوا کوئی چارہ نہیں۔''

''افوہ! تم ڈاکٹر کو کال کرو۔ یہاں بلا ؤ یا مجھے بتا دو میں لے آتی ہوں۔'' لزا نے پھر مداخلت کی تھی۔

''ہاں یہ ٹھیک ہے عبدالہادی نے سیل فون جیب سے نکالا تھا اور ڈاکٹر سے رابطہ کرنے میں مشغول ہو گیا۔ لزا کی کال آ رہی تھی وہ ایکسیوز می کہہ کر باہر نکل گئی۔

''بہت درد ہو رہی ہے تمہیں؟'' عبدالہادی نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

''اس سے زیادہ نہیں جتنی اس عورت کے ساتھ آپ کو دیکھ کر ہوتی ہے۔'' وہ قدرے غصے سے بولی تھی۔ عبدالہادی گنگ سا ہو کر رہ گیا۔ پھر جب تک ڈاکٹر نہیں آیا دونوں کے درمیان خاموشی حائل رہی۔ علیزے کے تاثرات میں خفگی بھی تھی اور دکھ بھی، اس سے زیادہ وہ خود کو آشکار نہیں کر سکتی تھی۔ جب تک ٹانکے لگتے رہے مرہم پٹی ہوتی رہی۔ وہ ہونٹ کاٹ کر آنسو روک رہی تھی۔ ڈاکٹر کے جانے کے عبدالہادی نے اسے پانی کے ساتھ پین کلر دینا چاہی تب اس کا ضبط ایک بار پھر چھلک پڑا تھا۔

''مجھے اس ہمدردی یا دوسرے لفظوں میں آپ کی بھیک کی کوئی ضرورت نہیں۔ چلے جائیں یہاں سے۔'' ہاتھ مار کر دوا گراتے ہوئے اس کا لہجہ سرد تھا۔ عبدالہادی کے احساسات کیا تھے وہ قطعی نہیں سمجھ پایا البتہ کچھ کہے بغیر وہ اٹھ کر وہاں سے چلا گیا تھا۔ علیزے جانے کتنی دیر تک گھٹ گھٹ کر روتی رہی چونکی اس وقت جب سرہانے پڑے فون کی وائبریشن محسوس ہوئی تھی۔ اس کا ہرگز ارادہ نہیں تھا

کسی سے بات کرنے کا، فون اٹھانے کا مقصد موبائل آف کرنے کا تھا۔ مگر اسکرین پر بریرہ کا نام چمکتا دیکھ کر اس کا دل بھر آیا۔ دل کچھ اور بھی غم سمیٹ لایا۔

''بجو......'' وہ بے اختیار پھر ہچکیوں سے رو پڑی دوسری جانب بریرہ اسی قدر پریشان ہوئی۔

''مجھے نہیں پتا آپ لوگوں نے اتنی شدت سے اس شخص کی محبت کی دعائیں کیوں مانگی تھیں میرے لیے۔ میں بس جانتی ہوں پہلے سے زیادہ مصیبت میں آ گئی ہوں میں۔'' بریرہ کے ہزار سوالوں کے جواب میں وہ بے ربط سا بولی تھی۔ بریرہ مزید ہونق ہو کر رہ گئی۔

''بجو! بس مجھ سے برداشت نہیں ہوتا کہ میرے علاوہ کسی اور پر توجہ دے۔ وہ لزا سے بات کرتا ہے تو میرا خون کھولنے لگتا ہے۔ اتنی جلن ہوتی ہے جو بیان میں نہیں لائی جا سکتی۔'' وہ روتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ عبدالہادی مغرب کی نماز کی ادائیگی کے بعد اندر آتے ہی تھم گیا۔ وہ اس سے خفا تھی۔ وہ منانا چاہتا تھا مگر نماز کا ٹائم ہونے پر اس کام کو بعد میں ٹالتا اٹھ کھڑا ہوا تھا کہ اب اسے دل کی بھڑاس نکالتے پا کر گہرا سانس بھر کے رہ گیا۔ وہ اس کا ارتکاز توڑنا نہیں چاہتا تھا۔

دل سے بوجھ ہٹانے کا متمنی تھا۔ جب ہی ڈسٹرب نہیں کیا اور اس کے فارغ ہونے کا انتظار کرنے لگا۔

''افوہ گڑیا! یہ بھی کوئی مشکل کام ہے۔ تم بتا دو اسے کہ تمہیں اچھا نہیں لگتا۔ سو سمپل۔'' بریرہ نے پیار سے سمجھایا تھا۔ علیزے اسی قدر بھڑکی۔

''کوئی ایک بار بتایا...... ہزاروں بار ناگواری ظاہر کی۔ وہ پتا نہیں کس مٹی سے بنے ہیں نہیں سمجھتے۔ بجو وہ اتنے بھی معصوم نہیں ہو سکتے کہ میرے بدلے انداز و اطوار سے کچھ نہ سمجھیں۔ مجھے تو لگتا ہے میرے دل میں ان کے لیے کوئی جذبہ نہیں رہا۔ جب ہی تو کوئی پیش رفت نہیں کی۔ اب کیا اپنے منہ سے کہوں میں کہ میں منتظر ہوں ان کی۔'' وہ خدشوں میں گھری کہہ رہی تھی۔ بریرہ نرمی سے مسکرا دی۔

''اس میں کوئی حرج نہیں ہے علیزے! وہ ہرگز کوئی غیر نہیں شوہر ہیں تمہارے۔'' علیزے تو جیسے بدک سی گئی تھی۔

''ہرگز نہیں۔ میں کبھی یہ نہیں کر سکتی۔ میں بے شرم نہیں ہوں۔ نہیں سمجھتے نہ سمجھیں بے شک۔''

''افوہ علیزے......'' معاً لائن کٹ گئی۔ علیزے نے چونک کر فون کان سے ہٹایا۔ تو احساس ہوا بیٹری ڈیڈ ہو چکی ہے۔

''اوہ شٹ! اسے بھی ابھی ختم ہونا تھا۔'' اس نے غصے میں فون پٹخا۔ تب ہی عبدالہادی کھنکارتا ہوا اندر چلا آیا تھا۔ ہونٹ ایسے باہم دبا رکھے تھے گویا مسکراہٹ ضبط کرنے کی سعی ہو۔ علیزے نے چونک کر بلکہ گھبرا کر اسے دیکھا۔ وہ کب آ گیا تھا۔ اس کا دل دھڑکا۔ کہیں کچھ سن لینے کے خیال سے۔

''غصہ نہ کریں۔ میرا فون لے لیں۔ بات ضرور کریں۔'' وہ اپنا فون بڑھائے کھڑا تھا۔ مسکراہٹ اب واضح تھی اور گہری بھی، شریر بھی۔ علیزے نے نخوت سے ناک چڑھالی۔

''ضرورت نہیں اس فیاضی کی۔ اتنی بھی اہم بات نہیں تھی۔'' وہ دوسری جانب دیکھ رہی تھی۔

''واقعی......؟'' عبدالہادی مشکوک ہوا۔ علیزے تلملا کر اسے گھورنے لگی۔

''مطلب کیا ہے اس بات کا؟'' وہ چڑ رہی تھی خوامخواہ۔

''میرا مطلب ہے بات بہت اہم تھی۔ یقیناً۔ بجو شاید آپ کو مجھے منانے پہ قائل کر لیتیں۔ ڈیئے یار

یہ زیادتی نہیں کی آپ نے میرے ساتھ۔ سب سے زیادہ میرا حق تھا کہ آپ اپنی بدلتی کیفیت مجھے بتاتیں۔'' وہ بے حد شوخ انداز میں کہتا اس کے پاس آبیٹھا۔ علیزے دھک سے رہ گئی۔ رنگت یکدم فق ہوئی تھی۔ مگر اگلے ہی لمحے وہ ایک جھٹکے سے اٹھی۔

''اگر آپ نے سن ہی لیا ہے تو شرم ہی کر لیں۔ خوامخواہ کسی کو ستانا بھی تو گناہ ہے۔'' اس نے بھڑکتے ہوئے کہا تھا۔ عبدالہادی نے سرد آہ بھری۔

''یعنی سارے گناہ، ساری غلطیاں میرے کھاتے میں شمار ہوئیں۔''

''تو کیا ایسا نہیں ہے؟ آپ کو پتا نہیں لگا تھا کہ میں......'' وہ اسے گھورتے ہوئے کہتی تھمی تو عبدالہادی نے بھنوؤں کو سوالیہ انداز میں جنبش دی تھی۔

''کیا میں نے آپ کو احساس نہیں دلانا چاہا تھا؟ آپ کو میں نے۔ آپ کے گھر میں اپنے کمرے میں رکھا، بعد میں آپ کے پاس آئی۔ اس کا کیا مطلب تھا۔ میں نے کتنی بار لزا کے سامنے آپ پہ استحقاق جمایا۔ ایسا پہلے ہوتا تھا۔ آپ مجھے بس جھکانا چاہتے تھے۔ مجھے سزا دینا چاہتے تھے۔''

غصے میں بولتی وہ یکدم ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر رونے لگی تو عبدالہادی بوکھلا اٹھا۔

''لیزے...... لیزے! پلیز۔ ایسا کچھ نہیں ہے۔ قسم سے جتنی نفرت دیکھی تھی میں نے تمہاری۔ اس کے بعد بس محتاط تھا۔ میں ہرگز تمہیں ہرٹ کرنا نہیں چاہتا تھا۔ میں تمہیں سنبھلنے کے لیے ٹائم دینا چاہتا تھا۔ تاکہ تم مجھے پوری آمادگی اور رضامندی سے قبول کرو۔ میں شکر گزار ہوں اپنے رب کا کہ یہ اس نے یہ حسین لمحے عطا فرمائے ہیں مجھے۔''

اسے بازو کے حصار میں لے کر زبردستی اس کے ہاتھ چہرے سے ہٹائے وہ کتنی محبت اور توجہ سے اسے چپ کراتا آنسو صاف کر رہا تھا۔ علیزے نے ہچکی بھرتے اسے شاکی انداز میں دیکھا۔

''اگر یہ آپ کی بات مان بھی لی جائے۔ تو یہ لزا کا کیا چکر تھا۔ کیوں جلا رہے ہیں مجھے ایسے۔'' وہ کڑھتی تھی۔ عبدالہادی ہنس دیا۔

''یار وہ واقعی مجھے بہت پسند کرتی تھی کبھی۔ شاید اب بھی کرتی ہے۔ جبھی میرے پاس صرف مجھ سے وہ باتیں سننا چاہتی ہے جو اسے کسی اور کے منہ سے اتنا انسپائر نہیں کرتیں اور اللہ جانتا ہے لیزے میرا مقصد نیک ہے۔ میں یہ سوچ کر اس سے ہر بار ملتا ہوں۔ ممکن ہے وہ میرے ذریعے ہی رب تک جا پہنچے۔ اللہ نے اس کی ہدایت کا ذریعہ مجھے بنایا ہو۔''

''لیکن اگر اس نے آپ کو مجھ سے چھین لیا تو؟'' اس نے ہراس میں مبتلا ہو کر اسے دیکھا تھا۔

''چھوڑو یار لزا کے قصے کو۔ آج میں اتنا خوش ہوں۔ ٹائم کیوں اِدھر اُدھر برباد کریں۔ آؤ پیار کی باتیں کرتے ہیں۔'' وہ اسے شرارت سے دیکھتا ہوا سنجیدگی سے بولا تو علیزے ایک دم ٹپٹا گئی تھی۔

''ہرگز نہیں۔ پہلے تو آپ مجھے سارے حساب دیں۔ کیوں مجھے اتنا خوامخواہ پریشان کیا۔'' وہ بسوری تھی۔ عبدالہادی زور سے ہنس دیا۔ بڑی سرشار ہنسی تھی۔ بڑی آسودہ، بہت دلکش۔

''آپ کا حکم سر آنکھوں پہ۔ بتاؤ کیسے حساب دوں۔ زبانی کلامی...... یا عملی......؟''

اس کا انداز شوخ و شنگ تھا۔ جو علیزے کی ساری طراری، سارا اعتماد چھین کر لے گیا۔ وہ نہ صرف بے تحاشا سرخ پڑی بلکہ بدک کر فاصلے پر بھی ہو گئی تھی۔

''ہرگز کوئی بدتمیزی نہیں چلے گی۔'' وہ چلائی تھی۔ عبدالہادی نے کہاں سنی۔

''کیوں نہیں چلے گی۔ پرمٹ حاصل ہوا ہے

آپ کی ہر قسم کی رضا مندی کا۔'' وہ گنگنایا اور اسے کاندھوں سے تھام کر خود سے قریب کیا۔ علیزے مصنوعی خفگی سے چیختی اس کے مضبوط کاندھے پر مکے مارنے لگی۔ عبدالہادی نے مسکراتے ہوئے اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے ہونٹوں سے لگالیا۔

بس ایک معافی ہماری توبہ کبھی جو اب ہم ستائیں تم کو
لو ہاتھ جوڑے لو کان پکڑے اب اور کیسے منائیں تم کو

اس کی سماعتوں میں وہ اپنے سرگوشیانہ لہجے کی خوشبو بھری آواز میں اتنا خوبصورت اظہار کر رہا تھا کہ علیزے محصور ہو کر رہ گئی تھی۔ سحر زدہ مبہوت۔ عبدالہادی اس کے اسی انداز کو نشانہ بنا کر ہنسنے لگا تھا۔

''ابھی تو صرف زبانی کلامی اظہار ہوا ہے تو آپ کا یہ حال ہے۔ عملی اظہار پر بے ہوش نہ ہو جانا۔'' وہ کتنا شوخ ہو رہا تھا۔ علیزے اتنا جھینپی تھی کہ کانوں کی لوئیں تلک سرخ پڑ گئی تھیں۔ اس نے پھر مکا اس کے کاندھے پر مارنا چاہا۔ عبدالہادی نے یونہی ہنستے ہوئے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے اپنے ساتھ بھینچ لیا تھا۔ علیزے نے آسودگی میں گھرتے ہوئے آہستگی سے آنکھیں بند کر لیں۔

☆☆☆

اس کے اندر ایسی وحشت اتری تھی۔ ایسا ہراس کہ اسے عبدالغنی کے علاوہ سب کچھ بھول گیا۔ اس کی دلدوز چیخوں پہ ہی پورا گھر اس کے گرد اکٹھا ہو گیا تھا۔ اس کا چہرہ خوفناک حد تک زرد تھا اور دل کی دھڑکنیں ڈوبتی جا رہی تھیں۔ بے ربط سے الفاظ میں وہ محض اتنا بتا سکی تھی۔ جو فون کال ریسیو ہوئی تھی اسے۔ اس میں عبدالغنی کے ایکسیڈنٹ کی اطلاع ملی تھی۔ اس کی حالت نازک تھی۔ اطلاع ایسی تھی جس نے اُم جان اور بابا جان کی بھی توانائیاں نچوڑ لیں۔ دل خدشات لیے دھڑکتے تھے۔ تو آنکھوں میں کسی حادثے کا خوف گھات لگا کر آن بیٹھا تھا۔

اُم جان برستی آنکھوں کے ساتھ زیر لب قرآنی آیات کا ورد کرنے میں مشغول ہوئی تھیں۔ عبیر یوں کھڑی تھی۔ جیسے سکتہ ہو گیا ہو۔ بابا جان نے ہی ہمت کر کے ہارون اور عبدالہادی کو فون پر صورت حال بتلا کر آنے کا کہا تھا۔ خود فوری طور پر صدقے کے لیے بکرے کا انتظام کرنے میں لگ گئے۔ ایک گھنٹے بعد ہارون اور عبدالہادی تقریباً آگے پیچھے وہاں پہنچے تھے۔

''مجھے عبدالغنی کے پاس لے چلیں بھائی!'' لاریب دھاڑیں مار مار کر رو رہی تھی۔ بریرہ اور علیزے کے بھی چہرے اڑے ہوئے تھے۔ لیکن جو لاریب کی حالت تھی، وہ سب سے خراب تھی۔

''ہاں۔ ہاں چلتے ہیں۔'' ہارون نے نرمی سے اسے ساتھ لگایا۔ وہ اور زیادہ شدتوں سے رو دی۔

''انہیں کچھ ہو گا تو نہیں ناں بھائی؟ وہ ٹھیک ہو جائیں گے؟'' وہ سہم سہم کر سوال کرتی تھی۔

''آپ چلیں گی بھابی؟'' عبدالہادی نے عبیر سے سوال کیا تھا۔ جو نم آنکھیں جھکائے گم صم کھڑی تھی۔ ہارون نے گردن موڑ کر اس نازک مگر بے حد بے ضرر لڑکی کو دیکھا۔

''جی...... آپ کو چلنا چاہیے۔'' اس نے عبدالہادی کی تائید کی تھی۔ عبیر کی آنکھیں بھر آئیں وہ سر کو نفی میں ہلانے لگی۔

''نہیں۔ آپ لوگ جائیں۔ میں یہیں ان کا انتظار کروں گی۔ اللہ نے چاہا تو وہ خود چل کر واپس آئیں گے۔''

''انشاء اللہ!'' اُم جان کے علاوہ علیزے اور بریرہ نے بھی بے اختیاری میں یک زبان ہو کر کہا۔ لاریب نے آنسو پونچھتے ہوئے دل کی گہرائیوں سے آمین کہا تھا۔

سارے رستے وہ اس کا دل جیسے اللہ کے حضور گڑ

گڑاتا رہا تھا۔ مگر عبدالغنی کی حالت کو دیکھ کر، سن کر اس کا دل پاتال میں گرتا چلا گیا۔ اسے لگا اللہ نے اس کی ایک بھی گزارش ماننے سے انکار کر دیا تھا۔ وہ ایمرجنسی میں تھا اور جیسے ہر لمحہ زندگی سے، اس سے دور ہو رہا تھا۔ اس کی بائیک گاڑی سے ٹکرائی تھی۔ یہ ٹکر اتنی شدید تھی کہ وہ کئی فٹ دور اچھل کر گرا تھا۔ چوٹ دماغ میں آئی تھی۔ ڈاکٹرز نے اس کے کومے میں جانے کا بھی خدشہ ظاہر کیا تھا۔ یہاں آ کر تو اُم جان بھی دل چھوڑ گئی تھیں۔ بابا جان کے پیروں تلے سے زمین سرکنے لگی تھی اور لاریب...... اسے لگتا تھا۔ ایک بار پھر لگا تھا۔ اس سے بڑا نقصان اور نہیں ہو سکتا۔ ڈاکٹر نے چوبیس گھنٹے اہم بتلائے تھے۔ ان میں اسے ہوش نہ آنے کی صورت میں اس کے کومے میں جانے کا خطرہ بڑھ جاتا تھا۔

لاریب...... حواس باختہ کھڑی تھی۔ اسے عبدالہادی کی ایک ایک بات یاد آئی۔ وہ اسے کیسے پیار سے دیکھتا تھا۔ وہ اسے کتنے خاص انداز میں مناتا تھا۔ اس نے پانچ سالوں میں کبھی کانٹا چبھنے کی بھی تکلیف نہیں دی تھی اسے۔ پھر...... پھر ایک بات وجہِ اختلاف بن کر کھڑی ہو گئی، ان کے بیچ۔ وہ کتنی شاکی تھی اس سے۔ کتنی خفا۔ اس قدر بے حس بھی بن گئی، اور ظالم بھی۔ کتنے سخت الفاظ استعمال کر گئی تھی اس کے لیے۔ مگر اس کا تحمل اور بردباری کمال درجے کی تھی۔ مگر اس کی اس آخری حرکت پہ وہ کنٹرول کھو گیا تھا۔

وہ صحیح کہتا تھا۔ وہ اس سے کیسی محبت کرتی تھی۔ اس کی خاطر ذرا سا کمپرومائز نہ کر سکی۔ اس کی خوشی پر ذرا سی گنجائش نہ نکال سکی۔ وہ اس شخص کے لیے دکھ کا باعث بنی تھی۔ جس سے سب سے زیادہ محبت کا دعویٰ تھا اسے۔ جس نے اس کی چاہت کا حق بھی ادا کر کے دکھا دیا تھا۔ جو اس کی بے اعتنائی برداشت کر کے بھی اسے جواباً بے اعتنائی کی مار نہ مار سکا۔ وہ اس قیمتی شخص کو کس درجہ دکھ سے ہمکنار کرتی رہی۔ صرف اسے نہیں اللہ کو بھی ناراض کرتی رہی۔ حالانکہ عبدالغنی نے سمجھایا بھی تھا۔

''عدل کا تقاضا ہے لاریب! جو اپنے لیے پسند کرو، وہی دوسرے کے لیے بھی چاہو۔ تم جانتی نہیں ہو مجھے؟ میں نے شوق میں شادی نہیں کی۔ میرا مقصد تمہیں ہرٹ کرنا بھی نہیں تھا۔ کچھ کام خالصتاً اللہ کرواتا ہے۔ جن میں اپنی مرضی، اپنا ارادہ عمل دخل نہیں رکھتا۔ ایسا مت کرو۔ ایسا کر کے تم اللہ کے غضب کو آواز نہ دے لو۔ مجھے ڈر ہے۔''

مگر وہ سنتی کہاں تھی۔ وہ سمجھتی کہاں تھی۔ وہ تو بھول گئی تھی کہ عبدالغنی اگر اسے ملا تھا۔ تو یہ بھی اللہ کی عطا تھی۔ وہی اللہ اگر چاہتا تو اس سے چھین بھی سکتا تھا اور اللہ نے اس پر گرفت کرنے میں دیر نہیں لگائی۔ وہ ہلکان تھی۔ رو رو کر، تڑپتے ہوئے۔

''میرے اللہ! معاف فرما مجھے، غلطی میری ہے، سزا میں سب کو شامل نہ کر۔ عبدالغنی واپس لوٹا دے۔ اس بے گناہ لڑکی کی خاطر واپس لوٹا دے۔ اس کا تو کوئی قصور نہیں ہے۔ تُو جانتا ہے۔ اسے پھر سے بے اماں ہونے سے بچالے۔ میں اپنے لیے نہیں مانگتی۔ جانتی ہوں خفا کر بیٹھی ہوں تجھے۔ اُم جان اور بابا جان کے لیے عبدالغنی کو ٹھیک کر دے۔ میرے عبدالعلی کو یتیم ہونے سے بچالے۔ میرے اس بچے کو عبدالغنی کا سایۂ شفقت عطا فرما دے جو ابھی اس دنیا میں بھی نہیں آیا۔

اللہ جی! مجھے ایک موقع عطا فرما دے۔ عمر بھر کی تشنگی اور پچھتاوے سے مجھے صرف تُو بچا سکتا ہے۔ مجھ پر رحم فرما دے۔''

اس کی ہچکیاں بندھ گئی تھیں۔ اس کی آواز بھرا گئی تھی۔ مگر اس کی گریہ وزاری نہیں تھم رہی تھی۔ وہ

عزم لے کر اس دربار میں گئی تھی۔ خالی نہیں لوٹنا تھا۔ اس شدت سے اس نے زندگی میں کہاں کچھ مانگا تھا رب سے۔ اس شدت سے تو اس نے عبدالغنی کو تب بھی نہیں مانگا تھا جب وہ اس کی بے پناہ خواہش رکھتی تھی اور اللہ تو وہ ہے، جسے مانگنے والے ہاتھ پسند ہیں۔ اللہ تو وہی ہے۔ جسے دل سے گڑگڑانے والے پسند ہیں۔ پھر اس وقت تو بے شمار دعائیں اُس کے دربار میں اسی التجا کے ساتھ پیش ہو رہی تھیں۔

رحمٰن رحیم سدا سائیں

کی پکاریں تھیں۔ وہ کیسے اپنی رحمانیت و رحیمیت کا اظہار نہ کرتا۔ اس کی رحمت کی بارش چھما چھم برس پڑی تھی۔

☆☆

''شکر ہے مالک کا۔ آپ ٹھیک ہیں اب۔ پریشان تو سب ہی بہت تھے ہم۔ مگر جو حالت لاریب کی تھی۔ مجھے تو لگتا تھا بھائی کو تھوڑی دیر اور ہوش نہ آتا تو خدانخواستہ یہ لازمی عدم روانہ ہو جائے گی۔''

علیزے اب قدرے ریلیکس تھی۔ جبھی ہنستے ہوئے لاریب کا مذاق اڑا رہی تھی۔ عبدالغنی نے مسکرا کر لاریب کو دیکھا۔ اس کی رنگت بالکل ماند پڑ گئی تھی۔ آنکھوں کے نیچے گہرے سیاہ حلقے تھے۔ پپوٹے سوجن کا شکار بے حد بوجھل، بال الجھے ہوئے لباس شکن آلود۔ اس کے باوجود وہ بے حد پیاری لگ رہی تھی۔

''میں شکرانے کے نفل پڑھ لوں۔ دیر نہیں کرنی چاہیے مالک کی نعمت کے جواب میں شکر کی ادائیگی میں۔'' اُم جان گھٹنوں پر دباؤ ڈال کر اٹھی تھیں۔ ساتھ ہی بابا جان بھی اٹھ گئے۔ ان کا بھی ارادہ یہی تھا۔

''آیئے۔ میں وضو کراتی ہوں آپ کو۔'' عبیر سعادت مندی سے اٹھتے ہوئے اُم جان کو سہارا دے کر باہر لے گئی۔

''بہت نائس ہے یہ۔ میں تو قائل ہو گئی ہوں ان کی۔'' علیزے نے بے ساختہ اظہارِ خیال کیا۔

عبدالغنی نے بے اختیار لاریب کو دیکھا۔ وہ سر جھکائے کسی سوچ میں گم بیٹھی تھی۔ کچھ دیر بعد جب بریرہ اور علیزے بھی وہاں سے اٹھ گئیں تو عبدالغنی نے بہت دھیان سے اسے دیکھا تھا۔

''لاریب......! کیوں پریشان ہو؟'' وہ کچھ نہیں بولی۔ بس آنسو بھری آنکھوں سے اسے دیکھتی رہی۔ رنگت ہنوز زرد تھی۔ جس ذہنی اذیت میں مبتلا رہی تھی۔ اس کے آثار چہرے کے اضمحلال سے ظاہر تھے۔ عبدالغنی کو اس پر رحم اور پیار اک ساتھ آیا تھا۔

''قریب آؤ لاریب!'' وہ اپنا بازو اٹھا کر بولا تھا۔ لاریب سرک کر نزدیک ہو گئی۔ اس کا ہاتھ پکڑا۔ لبوں سے چھوا اور آنکھوں سے لگا لیا۔

''آپ کو ناراض کر دیا تھا میں نے...... بلکہ اپنے اللہ کو بھی۔ عبدالغنی! مجھے معاف کر دیں۔ پتا نہیں کیا ہو گیا تھا مجھے۔ کسی کی بات سمجھ ہی نہیں آتی تھی۔ دیکھیں اللہ نے کیسے سمجھایا مجھے۔''

اس کے قریب آ کر وہ اس کے کاندھے پر سر رکھتی ہوئی بھراہٹ زدہ آواز میں بولی تھی۔ عبدالغنی نے نرمی و ملاحت سے اس کا گال تھپتھپایا تھا۔

''مقامِ شکر ہے کہ تم سنبھل گئیں۔ مجھے بس اسی بات کی خوشی ہے۔ لاریب...... جن سے ہم محبت کرتے ہیں۔ ان کی دنیا سے زیادہ ہمیں ان کی عاقبت کی فکر ہونی چاہیے۔ مجھے بھی تمہاری عاقبت خراب ہونے کا اندیشہ تھا۔ آزمائش اللہ کی طرف سے ہوتی ہے۔ اس میں سرخروئی کی دعا ضرور مانگنی چاہیے۔''

"ٹھیک کہا آپ نے...... میں واقعی کم ظرفی اور کمینگی پر اتر آئی تھی عبدالغنی مگر اللہ نے میرا کتنا خیال کیا۔ اُس نے میرا گمراہ ہونا، بھٹکنا پسند نہیں کیا۔ اس نے مجھے خود سے دور نہیں جانے دیا۔ اُس نے فوراً ہی مجھے ٹھوکر لگادی۔ مجھے جتلا دیا۔ بتلا دیا۔ سمجھا ڈالا کہ مجھے اُس کی تقسیم پر راضی رہنا ہے۔ اُس نے مجھے آگاہ کیا اگر وہ دینے پر قدرت رکھتا ہے تو واپس لینے کا اختیار بھی اُس کے پاس ہے۔ عبدالغنی......! میں آپ کو کھونے سے اتنی ہراساں ہوئی کہ میں نے باخوشی آپ کو عبیر سے شیئر کرلیا۔ آپ جلدی سے ٹھیک ہو جائیں۔ پھر میں خود عبیر کو دلہن بنا کر آپ کے حوالے کروں گی۔"

عبدالغنی بھونچکا رہ گیا تھا۔ اس نے لاریب کے بہتے آنسوؤں کو دیکھا تھا اور نرمی سے اسے بازوؤں کے حصار میں لے لیا۔

"جب کوئی کام اللہ کی رضا کے لیے کرتے ہیں لاریب! تو خوشی سے کرتے ہیں۔ حوصلے سے کرتے ہیں۔ مجھے اپنی بیوی مسکراتی ہوئی اچھی لگتی ہے۔ یہ یاد رکھو تم۔"

عبدالغنی نے اس کے آنسو اپنے ہاتھ سے صاف کیے تھے۔ لاریب بھاری دل سے مسکرانے لگی۔

'وہ اللہ جس نے مجھے اس کی سکری فائز کی توفیق بخشی ہے۔ وہی مجھے ہمت اور حوصلہ بھی عطا کرے گا۔ انشاء اللہ! میں یہ بات کبھی فراموش نہیں کرسکتی ہوں کہ عبدالغنی کو اللہ سے میں نے اپنے لیے نہیں عبیر کے لیے واپس لیا ہے۔ یہ حقیقت مجھے دوبارہ کبھی ظلم پر نہیں اکسائے گی۔

اللہ نے چاہا تو میرے لیے یہ فخر، یہ خوشی کافی ہونی چاہیے کہ اللہ کو میری ضرورت ہے۔ اللہ مجھ سے محبت کرتا ہے۔ جبھی تو اُس نے میری دعا کو رد نہیں ہونے دیا۔ جبھی تو اس نے مجھے حسب خواہش عطا فرمایا ہے۔ میں مشکور ہوں اپنے رب کی اور مشکور اور عاجز رہنا چاہتی ہوں۔ مجھے ہر روز کا وظیفہ یاد رکھنا ہے کہ مجھے اپنی اصلاح کرنی ہے۔ مجھے ہر روز یہ دعا مانگنی ہے کہ اللہ مجھے گمراہی سے محفوظ رکھے۔ صراطِ مستقیم پر قائم رکھے۔ خاتمہ بالایمان بالخیر فرمائے۔ کیونکہ ہم اکثر خدا کو غلط سمجھتے ہیں۔

اُس کی طاقت کا غلط اندازہ لگاتے ہیں۔ ہمیں خدا پہ صرف اُس وقت پیار آتا ہے۔ جب وہ ہمیں ہمارے حسب خواہش عطا فرمادے اور اگر ایسا نہ ہو تو ہم اُسے طاقتور ہی نہیں سمجھتے۔ (معاذ اللہ) ہم نماز کے دوران اللہ اکبر کہتے ہیں۔ اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ اللہ سب سے بڑا ہے۔ اور نماز ختم کرتے ہی ہم خود کو بہت کچھ سمجھنے لگتے ہیں۔ جب مجھ پر آزمائش پڑی تو مجھے فوراً یہ لگنے لگا تھا۔ اللہ تو مجھ سے محبت ہی نہیں کرتا۔ حالانکہ خدا تو ہر ایک سے محبت کرتا ہے۔ وہ مجھ سے محبت کرتا تھا۔ جبھی اس نے مجھے آزمائش میں ڈالا۔ میں شکر گزار ہوں اپنے رب رحمٰن و رحیم کی کہ عروج میں میں تکبر میں مبتلا اگر ہوئی بھی تو زوال کے وقت ناشکری سے بچا کر تو یہ کی۔

توفیق دعا کی طاقت عطا فرمائی۔ مجھے اعتراف ہے۔ مجھے یقین ہے۔ اُس رب کی رحمانیت و رحیمیت ہمیشہ سے ہے، ہمیشہ رہے گی۔ بس ہم اُسے سمجھنے میں غلطی کر جاتے ہیں۔'

اس نے گہرا سانس بھرا اور زیرِ لب مسکراتے ہوئے جذب سے پڑھنے لگی۔

رحمٰن رحیم سدا سائیں۔ رحمٰن رحیم سدا سائیں
میری تجھ سے یہی دعا سائیں میرے دل میں دیپ جلا سائیں۔

(ناول رحمٰن، رحیم، سدا سائیں اگلے ماہ سے ایک نیا موڑ لے رہا ہے، ماہ اپریل میں ملاحظہ فرمائیے)

ناولٹ

رضوانہ پرنس

اِک ستم اور

''تم بھی کمال کرتی ہو۔ ابھی ابھی تو آفس سیٹ ہوا ہے۔ ہزار مسائل ابھی بھی سر اٹھائے کھڑے ہیں اور تم اسلام آباد شفٹ ہونے کی بات کر رہی ہو اور پھر انیقہ کا بھی کچھ خیال ہے تمہیں۔ وہ یہاں اکیلے کیسے رہے گی؟'' نعمان کے آخری جملے پر......

محبتوں کا خراج وصولتی ایک خوبصورت تحریر، ناولٹ کی صورت

دکھ کی بات نہیں تھی مگر دل دکھی ہو گئے تھے اور لب جیسے مسکرانا بھول گئے تھے۔ رحمان صاحب اور صبا کے یہاں جب بیٹے کی چاہ میں تیسری بیٹی پیدا ہوئی تو ان کے دل کچھ بجھ سے گئے۔ ان کے یہاں پہلے ہی گلابی گلابی رنگت والی گڑیا جیسی دو بیٹیاں تھیں اور اس بار بیٹے کی تمنا ایک فطری سی بات تھی لیکن بس یہ کچھ ہی عرصے کی بات تھی کہ پھر ان بجھے ہوئے دلوں کو انیقہ نے اپنی پیاری پیاری سی باتوں اور معصوم اداؤں سے کچھ ایسا روشن کیا کہ بیٹے کے نہ ہونے کا غم کافی حد تک دھندلا سا گیا حالاں کہ انیقہ شکل صورت اور رنگت میں اپنی دونوں بہنوں کے مقابل کم تھی لیکن پھر بھی ہر محفل کو لوٹ لینے کا فن اسی کو آتا تھا۔ اس کے بات کرنے کا دل نشین انداز، برجستہ جملے، ہنستی کھلکھلاتی مزے دار گفتگو جو لوگوں کو بے اختیار ہنسنے پر مجبور کر دیتی، ہر محفل اس کے بنا جیسے سونی سونی سی لگتی۔ شاید اپنے رنگ روپ کی کمی کو اس نے اس طرح سے کور کرنے کی کوشش کی تھی، تب ہی تو نمرہ اور سمیرا کی گوری رنگت اور دہکتے حسن کو نظر انداز کر کے سب لوگ اسی کی دل چسپ باتوں کی طرف متوجہ رہتے لیکن پھر بھی انیقہ کو سب کی ستائشی نظریں بار بار اپنی بہنوں کی جانب ہی اٹھتی ہوئی محسوس ہوتیں۔ نمرہ اور سمیرا میں دو سال کا فرق تھا اور انیقہ، سمیرا سے تین سال چھوٹی تھی۔ وہ ممی ڈیڈی کی لاڈلی ہونے کے ساتھ ساتھ اپنی دونوں بہنوں کی بھی بہت چہیتی تھی کہ اس کی وجہ سے تو گھر میں ایک رونق، ایک میلہ سا لگا رہتا تھا لیکن اس کی ہنستی کھیلتی شخصیت کے اندر ایک ایسا درد چھپا ہوا تھا جسے وہ بچپن سے سہتی آئی تھی۔ اس کی سانولی رنگت اور عام سی شکل صورت نے جیسے اسے اپنی بہنوں کے سامنے ایک عجیب سے احساسِ کمتری میں مبتلا کر دیا تھا۔ خاص طور پر جب بچپن میں لوگ بڑی حیرت سے پوچھا کرتے تھے۔

''انیقہ آخر کس پر گئی ہے، اپنی دونوں بہنوں سے کتنی مختلف ہے۔'' تو ممی بڑی مایوسی سے بتاتی تھیں۔

''بس اتفاق ہے کہ میری یہ بچی اپنی دادی پر چلی گئی ہے۔ سمیرا اور نمرہ نے اپنے ننھیال کا رنگ

روپ لیا ہے۔'' تب اسے اپنی دادی پر بڑا غصہ آتا تھا۔ کیا تھا اگر وہ گوری ہوجاتیں لیکن بڑے ہونے کے بعد اسے دادی پر نہیں بلکہ ممی پر غصہ آتا تھا۔ وہ اکثر ان سے لڑتی۔

''ممی آپ نے نمرہ باجی اور سمیرا کے زمانے میں اپنے میکے والوں کو سوچا، ان کے درمیان زیادہ وقت گزارا تب ہی یہ لوگ اتنی گوری چٹی پیدا ہوئیں اور میرے وقت میں شاید آپ دادی سے لڑتی جھگڑتی رہی ہیں۔ خوب جلی بھنی بھی ہوں گی تب ہی تو میں بھی جلی رنگت کے ساتھ پیدا ہوئی۔'' اس کے اس تجزیے پر پہلی بار تو ممی خوب ہنسی تھیں۔

''بے وقوف لڑکی، یہ سب اللہ کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ اگر میرے بس میں ہوتا تو میں تمہیں دنیا کی سب سے خوب صورت لڑکی بناتی اور ویسے تم ابھی بھی لاکھوں لڑکیوں سے زیادہ پیاری ہو۔ اب نمرہ اور سمیرا تو مجھ سے نہیں لڑتیں کہ ہمارے بال انیقہ کی طرح اتنے لمبے کیوں نہیں اور ہماری آنکھیں اس کی طرح اتنی بڑی اور خوبصورت کیوں نہیں۔'' انہوں نے پیار سے اس کی لانبی چوٹی کو کھینچ کر کہا تھا۔

ویسے یہ حقیقت تھی کہ نمرہ کے بے حد لانبے اور گھنے بال اور بڑی بڑی چمکتی آنکھوں کی لوگ بے ساختہ تعریف کرتے تھے۔ سمیرا تو مارے رشک کے مرجاتی تھی۔

''ہائے انیقہ! کاش میرے بال بھی تمہاری طرح کے ہوتے۔'' تب ایک روز اس کی اس بات پر انیقہ نے شرارت سے اسے دیکھا۔

''ٹھیک ہے! چلو اللہ میاں سے ریکویسٹ کرتے ہیں کہ میرے لمبے بال تمہیں دے کر تمہاری گوری رنگت مجھے بخش دے۔''

''ہائے ایمان سے! اگر ایسا ہوجائے تو کتنا مزہ آجائے۔ اتنی حسین زلفوں پر تو ہزاروں گوری رنگت قربان ہوجائیں۔'' سمیرا نے شرارت بھری ٹھنڈی سانس بھر کر کہا تھا۔

''ناشکری ہو تم سمیرا، اتنا مکمل حسن پا کر بھی ایسی باتیں کر رہی ہو۔'' انیقہ کے لہجے میں چھپی حسرت محسوس کر کے سمیرا کا دل کٹ کر رہ گیا۔ اسے اپنی یہ چھوٹی بہن بہت عزیز تھی اور جب سے نمرہ بیاہ کر امریکا گئی تھی یہ دونوں اور نزدیک آ گئی تھیں۔ دبلی پتلی سانولی سی انیقہ اس کے سامنے کس احساس کمتری کا شکار رہتی ہے۔ یہ بات سمیرا اچھی طرح سمجھتی تھی۔ کبھی کبھی اسے اللہ سے گلہ محسوس ہوتا۔ کیا تھا اگر وہ تینوں بہنوں کو ایک سا رنگ روپ دے دیتا یا پھر انیقہ کی جگہ وہ خود ہوجاتی کم از کم وہ اپنی بہن کو یوں کڑھتے ہوئے تو نہ دیکھتی۔ اس کا بس نہیں چلتا تھا کہ کیسے سارے جہان کی خوشیاں انیقہ کے دامن میں لا کر ڈال دے، تب ہی تو کسی تقریب میں جانے سے پہلے وہ اپنے سے زیادہ انیقہ کی تیاری پر دھیان دیتی تھی۔ اس کا لباس، اس کی جیولری، اس کا میک اپ، ایک ایک چیز پر اس کی پوری توجہ رہتی تھی اور اس کی اتنی محنت انیقہ کو واقعی جیسے کوئی دوسرا ہی روپ دے ڈالتی اور لوگوں سے تعریفیں بٹورتی انیقہ کے چہرے سے چھلکتی خوشی کو محسوس کر کے سمیرا کے دل میں ڈھیر سارا سکون اتر آتا۔

..........☆☆..........

رحمان صاحب کے ایک بہت ہی پرانے دوست اکرام صاحب کی اتفاقاً ہی ان سے ملاقات ہوگئی۔ رحمان صاحب آفس کے کسی کام سے اسلام آباد جارہے تھے۔ جہاز میں جو شخص ان کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھا تھا، اسے دیکھ کر وہ حیران رہ گئے۔ وہ تو ان کی یونیورسٹی کے زمانے کا گہرا دوست اکرام تھا۔ اکرام صاحب بھی ان کو پہچان کر مارے خوشی کے گنگ رہ گئے۔ کتنے طویل عرصے کے بعد وہ لوگ

ایک دوسرے سے مل رہے تھے پھر جو باتوں کا سلسلہ شروع ہوا تو سفر کے اختتام تک بھی ختم نہ ہوا۔ اکرام صاحب کے شدید اصرار پر وہ ہوٹل کے بجائے ان ہی کے گھر پر ٹھہرے۔ مسز اکرام نے ان کی خاطر تواضع میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔

اکرام صاحب کے دو ہی بیٹے تھے۔ بڑا بیٹا ارسلان اپنی بیوی اور دو بچوں کے ساتھ اوپر کے پورشن میں رہتا تھا اور چھوٹا بیٹا نعمان جو امریکا سے ایم بی اے کرنے کے بعد ابھی حال ہی میں واپس لوٹا تھا۔ آج کل اپنے پاپا کا آفس اور ان کا بزنس سنبھالنے میں اپنے بڑے بھائی ارسلان کے ساتھ برابر سے مصروف تھا۔ اکرام صاحب ایک کامیاب بزنس مین تھے۔ لیدر کے بزنس کے علاوہ کئی اور پروجیکٹس پر بھی وہ اپنے دونوں بیٹوں کے ساتھ مصروف عمل تھے۔ باتوں باتوں میں مسز اکرام نے بتایا کہ وہ آج کل نعمان کے لیے کسی اچھی سی لڑکی کی تلاش میں ہیں۔ رحمان صاحب کو نعمان کافی پسند آیا تھا۔ ہینڈسم ہونے کے ساتھ ساتھ وہ بہت خوش مزاج، تمیزدار اور ادب لحاظ کرنے والا لڑکا تھا۔ کوئی خوبی ایسی نہ تھی جو اس میں نظر نہ آتی ہو۔ وہ انہیں اپنی سمیرا کے لیے بالکل موزوں لگا لیکن لڑکی کے باپ تھے اپنے منہ سے بھلا کیسے کہتے لیکن اکرام صاحب کی جہاندیدہ نظروں نے جیسے ان کے چہرے سے ان کی سوچ کو پڑھ لیا۔ اس وقت تو کچھ نہیں کہا لیکن اگلے ہی مہینے وہ نعمان اپنی بیگم کے ہمراہ کراچی پہنچ گئے۔ رحمان صاحب کو اندازہ ہو گیا تھا کہ ان کی آمد بے معنی نہیں۔ وہ اپنی فیملی کے بارے میں مکمل معلومات اپنے دوست کو اسلام آباد میں دے چکے تھے اور اب اکرام صاحب کے ساتھ نعمان کی آمد نے ان کے یقین کو اور بھی مستحکم کر دیا۔ یہ اتنا بہترین رشتہ تھا جسے گنوانے کا وہ اور صبا سوچ بھی

نہیں سکتے تھے۔ انہیں پورا یقین تھا کہ سمیرا ہر لحاظ سے ان لوگوں کے معیار پر پوری اترے گی اور ہوا بھی یہی۔ جاتے جاتے وہ لوگ سمیرا کو ہیرے کی قیمتی انگوٹھی پہنا گئے۔ نعمان کی وارفتہ نظروں نے سمیرا کے دل میں بھی بہت خوبصورت سا احساس جگا دیا تھا۔

وہ لوگ صرف چار دن رکے تھے لیکن یہ چار دن سمیرا کی زندگی کی کتاب کے ایسے صفحے بن گئے جنہیں وہ بار بار پلٹ کر پڑھتی تھی اور اس کا دل نہیں بھرتا تھا۔ نعمان کی ایک ایک بات جیسے خوشبو بن کر اس کے خیالوں پر چھائی رہتی اور وہ خوبصورت شام تو جیسے اس کی آنکھوں میں بس کر رہ گئی تھی۔ جب انگوٹھی پہنانے کی چھوٹی سی تقریب کے بعد نعمان کی خواہش پر وہ اس کے ساتھ ساحل سمندر پر گئی تھی۔ نعمان نے سمندر کے اوپر بکھری چاندنی کے خوبصورت منظر کو بڑی دلچسپی سے دیکھا اور پھر سمیرا کے چہرے پر اڑتی ہوئی زلفوں پر نظریں جماتے ہوئے شرارت سے بولا۔

''اس بھرپور چاندنی میں سمندر اتنا خوبصورت لگ رہا ہے لیکن میں اس منظر کی خوبصورتی انجوائے نہیں کر پا رہا کہ کم بخت یہ نظریں آپ کے چہرے سے ہٹ کر ہی نہیں دے رہیں۔'' سمیرا اس کی نظروں کی گرمی سے کچھ نروس سی ہو گئی۔ اس کی تعریف نے چہرے پر گلال سا بکھیر دیا تھا اور پھر اس شام نعمان کے خوبصورت اظہار نے، اس کی دل نشین باتوں نے، اس کے والہانہ انداز نے اسے زندگی کے ایک ایسے حسین رخ سے آشنا کیا جس نے اس کے دل کی دنیا ہی بدل کر رکھ دی اور جب وہ دونوں دمکتے چہروں کے ساتھ ہنستے مسکراتے گھر لوٹے تھے تو سب ہی نے خوشی کا اظہار کیا تھا ماسوائے انیقہ کے۔ وہ سمیرا سے منہ پھلائے کچن میں چائے بنانے میں مصروف تھی۔

سمیرا اپنی زندگی کے اس نئے حسین موڑ کو، اپنے جذبات، اپنے احساسات کو، آج کی اس خوبصورت رات کے دل کو چھو جانے والے لمحات کو انیقہ کے ساتھ شیئر کرنا چاہ رہی تھی۔ اپنی اس خوشی کو اس کے ساتھ بانٹنے کا من چاہ رہا تھا لیکن پتا نہیں کیوں انیقہ اس سے کٹی کٹی سی پھر رہی تھی۔ اس کی شوخیاں، برجستہ جملے، مزیدار باتیں، وہ اس کا مخصوص دل نشین انداز گفتگو...... ان چار دنوں میں اس کی شخصیت کے سبھی رنگ جیسے کہیں اڑ گئے تھے۔ مہمانوں کے سامنے ایک بہت سنجیدہ اور ریزروسی انیقہ جہاں اس کے ممی ڈیڈی کو حیران کر رہی تھی وہیں...... انیقہ کا یہ نیا روپ سمیرا سے بھی ہضم نہیں ہو رہا تھا۔ وہ تو سمجھی تھی کہ انیقہ، نعمان کو خوب ہی ستائے گی۔ اپنی شرارتوں کا نشانہ بنائے گی اور جس طرح اس نے نمرہ کے رشتے کے موقع پر چھیڑ چھیڑ کر اس کا ناطقہ بند کر دیا تھا، اسی طرح وہ بھی اس کی دلچسپ چھیڑ چھاڑ کا نشانہ بنے گی لیکن انیقہ اس کے بہت اصرار پر بھی بس کچھ ہی دیر کے لیے ان سب کے ساتھ بیٹھتی اور پھر پڑھائی کا بہانہ بنا کر اٹھ جاتی۔ اتفاق سے اس زمانے میں اس کے امتحانات بھی ہو رہے تھے۔ سمیرا بھی اس کے اس رویے کو ایگزام کا سبب مان کر اپنے مہمانوں کو اٹینڈ کرنے میں بزی رہی۔ ان چار دنوں میں خوب ہی نت نئے گھومنے پھرنے کے پروگرام بنے، ہر روز وہ دل و جان سے تیار ہوتی اور اس کے سجے سنورے روپ کو نعمان کی جذبے لٹاتی آنکھیں جب اپنے حصار میں لیے رکھتیں تو اس کا دل چاہتا کہ بس وقت یہیں تھم جائے۔ یہ خوب صورت لمحات ہمیشہ کے لیے امر ہو جائیں۔

ایسے میں ایک بار پھر اسے انیقہ کی کمی محسوس نہیں ہوئی تھی۔ مسز اکرام اپنی ہونے والی بہو پر واری صدقے ہوتے نہیں تھک رہی تھیں۔ اکرام صاحب بھی ہر جگہ اسی کو آگے رکھ رہے تھے۔ صبا اور رحمان صاحب کو اپنی بیٹی کی خوش قسمتی پر ناز ہو رہا تھا اور اس خوبصورت کھلکھلاتے ماحول سے دور انیقہ اپنے کمرے میں کتاب کھولے نہ جانے کن گہری سوچوں میں گم تھی، پھر نہ جانے کیا ہوا کہ وہ بے اختیار دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا کر رونے لگی۔ سمیرا جو اس کی آنکھوں میں آنے والے ہر آنسو کو اپنی پلکوں میں چھپانے کو بے چین ہو جاتی تھی اس وقت اس سے دور نعمان کی کسی بات پر کھلکھلا کر ہنس رہی تھی۔

............☆☆............

''سمیرا تم شادی کے بعد صرف ایک دفعہ ہی کراچی آئی ہو اور وہ بھی صرف چار دن کے لیے۔ بیٹا ذرا جلدی پروگرام بناؤ نا آنے کا۔ سچ بڑا سناٹا سا رہنے لگا ہے گھر میں۔!'' ممی کے اداس لہجے کو سمیرا نے جیسے اپنے دل پر محسوس کیا۔

''اچھا ممی، میں آج ہی نعمان سے بات کروں گی۔ مجھے بھی آپ لوگ بہت یاد آ رہے ہیں اور یہ انیقہ کے ہوتے ہوئے آپ کو سناٹا کیوں محسوس ہوتا ہے بھئی۔ فون دیجیے ذرا انیقہ کو میں اس کی خبر لیتی ہوں۔''

''نہیں سمیرا، اس سے بات کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ وہ تو اب پہلے والی انیقہ رہی ہی نہیں۔ اتنی خاموش اور سنجیدہ سی ہو گئی ہے تمہاری شادی کے بعد کہ حیرت ہوتی ہے۔ سب سے الگ تھلگ زیادہ تر اپنے کمرے میں ہی رہتی ہے۔'' ممی کچھ رنجیدہ سی ہو گئیں۔

''ہاں ممی، یہ بات تو میں نے بھی نوٹ کی تھی۔ میری شادی میں بھی کافی بجھی بجھی سی رہی اور میرے کراچی آنے پر بھی اس نے کوئی خاص گرم جوشی نہیں دکھائی تھی۔ نمرہ نے بھی یہ بات نوٹ کی تھی لیکن اس زمانے میں مہمانوں اور دعوتوں میں ہم لوگ اتنا بزی تھے کہ اس سے ٹھیک طرح سے بات ہی نہیں کر سکے، پھر نمرہ انہی ہنگاموں میں واپس بھی لوٹ گئی اور میں

اسلام آباد آ گئی۔''

سمیرا پریشانی سے بولی تو ممی مزید انیقہ کے رویے کے بارے میں بتانے لگیں۔ تب سمیرا نے دل ہی دل میں طے کرلیا کہ وہ جلداز جلد کراچی جا کر اپنی پیاری سی بہن کو اپنی محبت کے حصار میں لے کر اس سے اس کے بدلے ہوئے رویے، اس کی خاموشی، اس کی اداسی، اس کی کھوئی ہوئی دلکش ہنسی کے بارے میں ضرور معلوم کر کے رہے گی۔ نعمان کی خوبصورت رفاقت اور نئی زندگی کے حسین رنگوں کی جھلملاہٹ میں اسے اپنی لاڈلی بہن کے دکھ، اس کی خاموشیاں کچھ بھی تو نظر نہیں آتے تھے۔

اس کی شادی کو تقریباً تین ماہ ہونے والے تھے اور ان تین ماہ میں اس کی انیقہ سے صرف چار دن ملاقات رہی تھی جب وہ اور نعمان ہنی مون کے لیے لندن اور امریکا جاتے ہوئے چار دن کے لیے کراچی میں بھی رکے تھے۔ اپنے اس مختصر سے قیام کے دوران وہ لوگ دعوتوں اور مہمانوں کی آمدورفت میں اتنے مصروف رہے کہ وہ چاہنے کے باوجود انیقہ کے پاس چند گھڑی ڈھنگ سے بیٹھ بھی نہ سکی۔ خود انیقہ بھی دانستہ اس سے کٹی کٹی سی رہی تھی لیکن اپنی نئی نئی محبت کے خمار میں ڈوبی سمیرا نے اس وقت اس بات کو بہت زیادہ محسوس نہیں کیا تھا لیکن اس وقت ممی سے باتیں کر کے اس کا دل بہت بوجھل ہو رہا تھا۔ اپنی اس بہن کو ہمیشہ اس نے پلکوں پر بٹھا کر رکھا تھا۔ ممی سے زیادہ تو وہ اس کی چھوٹی چھوٹی باتوں کا دھیان رکھتی تھی۔ انیقہ کی شخصیت کو اجاگر کرنے میں سمیرا کا ہی تو بڑا ہاتھ تھا۔ انیقہ تو کسی حد تک بس اسی پر انحصار کرتی تھی...... وہ تو ایک لپ اسٹک بھی بنا سمیرا کی رائے کے نہیں لے پاتی تھی۔ اس کے کپڑے، جیولری، میک اپ سب ہی کچھ تو سمیرا کی پسند کا ہوتا تھا۔ اپنا ہر غم، ہر خوشی وہ اسی کے ساتھ شیئر کرتی تھی۔ اکثر وہ ہنس کر سمیرا سے کہتی۔

''یار تم نے مجھے بالکل اپاہج بنا کر رکھ دیا ہے۔ اب تو صرف سانس ہی میں اپنی مرضی سے لے سکتی ہوں۔'' اس وقت سمیرا کو اس کی ایک بات یاد آ رہی تھی اور دل تاسف کے گہرے سمندر میں ڈوبتا جا رہا تھا۔ اپنے بے پناہ پیار اور توجہ کا اتنا زیادہ عادی بنا کر وہ نعمان کی محبت میں اسے کتنی آسانی سے خود سے دور کر بیٹھی تھی۔

سب لوگ تو اسے انیقہ کی چھوٹی ممی کہہ کر چھیڑتے تھے لیکن وہ ماں تو کیا بہن بھی اچھی نہیں بن پائی۔ ایک دم سے کیسا تنہا کر دیا اس کو۔ سمیرا کی آنکھیں بھر آئیں، دل چاہا کہ اڑ کر انیقہ کے پاس پہنچ جائے اور اس کو اپنے گلے سے لگا کر اپنے آنسوؤں سے اس کا ہر گلہ دھو ڈالے لیکن اس کی نوبت ہی نہیں آئی۔ اس کا سارا پروگرام دھرا کا دھرا رہ گیا۔ وہ انیقہ کے آنسو کیا پلکوں میں چھپاتی وہ تو خود ہی پوری کی پوری آنسوؤں میں ڈوب گئی۔

☆☆

دوسرا دن اپنے دامن میں اس کے لیے کچھ ایسے جان لیوا لمحات لے کر آیا کہ دن کا اجالا بھی اس کے لیے گھٹا ٹوپ اندھیرا بن گیا۔ شدید صدمے نے اسے بالکل چور چور کر دیا۔ اس کے بے پناہ چاہنے والے ڈیڈی ایک ہولناک ٹریفک حادثے میں موقع پر ہی جاں بحق ہو گئے جبکہ ممی شدید زخمی حالت میں اسپتال میں تھیں۔ ابھی کل ہی شام کو تو اس نے ممی سے ڈھیر ساری باتیں کی تھیں۔ انیقہ کے لیے فکرمند ہوتی ممی کو اس نے یہ بتا کر کتنا خوش کر دیا تھا کہ وہ اگلے ہفتے ہی ان لوگوں کے پاس آ جائے گی۔

''سچ سمیرا، تم آ جاؤ گی تو تمہارے ڈیڈی بھی بہت خوش ہو جائیں گے۔ آج کل وہ بہت مس کرنے لگے ہیں تمہیں۔''

''لیکن می آپ ڈیڈی اور انیقہ کو میرے پروگرام کے بارے میں بالکل بھی نہ بتایئے گا۔ میں اچانک ان کو سرپرائز دوں گی۔'' وہ بچوں کی طرح ایکسائیٹڈ ہو کر می سے کہہ رہی تھی اور می بھی ہنس ہنس کر اس کے اس پروگرام کی تائید کر رہی تھیں۔ اس بات سے بے خبر کہ آنے والا کل کتنی بڑی قیامت اپنے اندر چھپائے ان کا منتظر کھڑا ہے اور وہ ایک ہفتے بعد کے خوشیوں بھرے پروگرام میں کھوئی ہوئی تھیں۔ واقعی زندگی ایک ایسا طلسماتی آئینہ ہے جہاں پل بھر میں منظر کچھ ایسے بدل جاتا ہے کہ انسان ششدر رہ جاتا ہے۔ غم، خوشی، آنسو، ہنسی، عزت، ذلت سب لمحوں میں اپنا چولا ایسے بدل لیتے ہیں کہ انسان کچھ سے کچھ ہو جاتا ہے۔ اپنی جادو کی پٹاری میں بڑے ناقابل یقین اور حیران کن لمحات لیے گھومتی ہے یہ زندگی۔ آج صبح اس کے می اور ڈیڈی ایئر پورٹ اپنے کسی دوست کو سی آف کرنے جا رہے تھے کہ راستے میں یہ ہولناک حادثہ پیش آیا اور وہ جو اپنے ڈیڈی کو سرپرائز دینا چاہتی تھی، خود زندگی کے دیے ہوئے اس بے رحم سرپرائز کا شکار ہو گئی۔

☆☆

شدت غم سے نڈھال جب وہ کراچی پہنچی تو اس کی پیاری می کی موت کی خبر نے جیسے اسے حواس سے مزید بیگانہ کر دیا۔ نمرہ ابھی کینیڈا سے نہیں پہنچی تھی۔ سمیرا کا کلیجا انیقہ کو دیکھ کر جیسے شق ہو گیا۔ اس کا چہرہ بالکل سفید ہو رہا تھا۔ وہ بُری طرح سے کانپ رہی تھی لیکن اس کی آنکھوں میں کوئی آنسو نہیں تھا۔ وہ خالی نظروں سے سب کو دیکھ رہی تھی۔ سمیرا نے بے اختیار اسے اپنی آغوش میں سمیٹ لیا۔ انیقہ ایک معصوم چھوٹی سی بچی کی طرح اس سے لپٹ گئی۔ سمیرا اس کو لپٹا کر کچھ اس بے قراری سے روئی کہ گھر کے در و دیوار بھی ہل اٹھے لیکن انیقہ پھر بھی نہ روئی۔

''انیقہ کو رلاؤ سمیرا ورنہ غضب ہو جائے گا۔'' عاصمہ ممانی نے روتے ہوئے سمیرا سے کہا۔

سب ہی کتنی دیر سے اسے رلانے کی کوشش کر رہے تھے لیکن وہ بس ایک سہمے ہوئے کبوتر کی طرح تھر تھر کانپتے ہوئے سب کو بے بسی سے تکی جا رہی تھی۔ خیال تھا کہ سمیرا کو دیکھ کر شاید وہ ضبط کا دامن چھوڑ بیٹھے گی لیکن ہنوز اس کی وہی کیفیت دیکھ کر سب ہی فکر مند ہو گئے تھے۔

''انیقہ میری جان، ہمارے می ڈیڈی ہمیں چھوڑ کر چلے گئے ہیں۔ ہم لوگ تنہا رہ گئے ہیں، ہمارے می ڈیڈی مر گئے ہیں انیقہ۔ یہ دیکھو انیقہ ہماری می کا بریسلیٹ۔'' سمیرا نے روتے ہوئے سائیڈ ٹیبل پر رکھے ہوئے بریسلیٹ کو بے اختیار اپنے ہاتھوں میں اٹھا کر انیقہ کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ یہ بریسلیٹ شاید می چلتے ہوئے پہننا بھول گئی تھیں۔

انیقہ نے پھٹی پھٹی نظروں سے اس بریسلیٹ کو دیکھا۔ یہ اس کی می کا فیورٹ بریسلیٹ تھا جسے وہ ہر وقت اپنی گوری گوری کلائیوں کی زینت بنائے رکھتی تھیں۔

''انیقہ یہ بریسلیٹ می کو بہت پسند تھا، ہے نا......؟'' سمیرا چیخ چیخ کر روتے ہوئے بولی۔ انیقہ نے وہ بریسلیٹ بے اختیار اپنے سینے سے لگا لیا۔ آنسوؤں کے سوتے آنکھوں سے پھوٹ پڑے۔ تب وہ سمیرا سے لپٹ کر کچھ اس شدت سے روئی کہ دونوں بہنوں کو سنبھالنا مشکل ہو گیا اور پھر نمرہ کے پہنچنے پر تو کچھ ایسا قیامت کا سماں نظر آ رہا تھا کہ پتھر سے پتھر دل انسان کی آنکھ نم ہوئی جا رہی تھی لیکن ان کے می ڈیڈی اپنی لاڈلی بیٹیوں کی آہ و زاریوں سے بے نیاز بڑے سکون سے آنکھیں موندے لیٹے ہوئے تھے۔ موت شاید نام ہی تمام محبتوں اور رشتوں کو توڑ کر جانے کا ہے۔ کسی نے سچ کہا ہے کہ

زندگی وقت سے پہلے ختم نہیں ہوتی اور احتیاط کے باوجود وقت کے بعد قائم نہیں رہتی۔

آج اس بات کی سچائی ان کے ممی ڈیڈی کی موت کی صورت میں سب کے سامنے عیاں تھی۔

☆☆

''انیقہ میں نے سوچا ہے کہ تم ہمارے ساتھ اسلام آباد چل کر رہو۔ نعمان کا بھی یہی خیال ہے۔'' سمیرا اسے چائے کی پیالی تھماتے ہوئے اس کے نزدیک بیٹھتے ہوئے بولی۔ انیقہ نے بے اختیار نفی میں سر ہلاتے ہوئے چائے کی پیالی سائیڈ ٹیبل پر رکھ دی۔

''انیقہ میری جان، میرے حال پر رحم کرو، اللہ نے تو امتحان لے لیا ہے مزید امتحان تم نہ لو میرا۔'' سمیرا بے اختیار رو دی۔ انیقہ سر جھکائے بے قراری سے اپنے دونوں ہاتھوں کو مسلتی رہی۔

آج ان کے ممی ڈیڈی کی موت کو ڈیڑھ ماہ ہو گیا تھا۔ نمرہ چہلم کے بعد کل ہی واپس گئی تھی۔ نعمان اور اس کے گھر والے بھی چہلم پر دوبارہ آئے تھے لیکن سمیرا، انیقہ کی وجہ سے ان کے ساتھ واپس نہیں جا سکی تھی۔ ممی اور ڈیڈی کے بعد انیقہ مزید خاموش ہو کر رہ گئی تھی۔ آنسو جیسے اس کی آنکھوں میں ٹھہر گئے تھے۔ وہ زیادہ تر اپنے کمرے میں ہی بند رہتی۔ سمیرا اور نمرہ تو اپنا غم اپنے آنسو ایک دوسرے سے شیئر کرتی رہتی تھیں لیکن انیقہ تو جیسے اپنے ہی خول میں سمٹ کر رہ گئی تھی۔ ان کے لاکھ چاہنے کے باوجود وہ ان کے پاس بھی بہت کم بیٹھتی۔ یہ غم خود سمیرا اور نمرہ کو بھی اتنی بری طرح سے ہلا گیا تھا کہ انہیں انیقہ کے دل میں جھانکنے کا وقت ہی نہیں مل رہا تھا لیکن بہرحال یہ فکر بھی دامن گیر تھی کہ اب انیقہ کا کیا ہوگا۔ انیقہ سے اس مسئلے کو ڈسکس کرنا چاہتیں تو وہ اس شدت سے روتی کہ وہ دونوں سب کچھ بھول کر از سر نو پھر اس عظیم سانحے کو اپنے آنسوؤں سے سینچنے لگتیں۔

نمرہ چاہ رہی تھی کہ وہ انیقہ کو کچھ عرصے کے لیے اپنے ساتھ امریکا لے جائے وہ اپنے سامنے ویزے وغیرہ کی فارمیلٹی پوری کرنا چاہ رہی تھی لیکن انیقہ کسی صورت راضی نہیں ہوئی تھی۔ نمرہ بے حد دل گرفتہ سی واپس لوٹ گئی۔ پہلی بار بنا ممی ڈیڈی کی دعاؤں کے وہ اپنے میکے سے رخصت ہو رہی تھی۔ وہ دن بھی اس کے لیے کسی قیامت سے کم نہیں تھا۔ اپنی دونوں بہنوں کو چھوڑ کر جاتے ہوئے اس کا کلیجا پھٹا جا رہا تھا اور اس وقت ایک بھائی کی کمی کا احساس بے حد شدت سے اسے ستا رہا تھا کہ ایسے وقت میں بھائیوں کا مضبوط حصار بہنوں کو بہت تقویت دیتا ہے۔ اس وقت سمیرا کے لاکھ سمجھانے کے باوجود انیقہ کسی صورت اس کے ساتھ جانے پر راضی نہیں ہو رہی تھی۔ سمیرا بہت کشمکش میں تھی۔ نعمان الگ اپ سیٹ ہو رہا تھا۔ ڈیڑھ ماہ ہو رہا تھا اسے گھر چھوڑے ہوئے لیکن انیقہ کو یوں اکیلے چھوڑتے ہوئے بھی اس کا دل گوارا نہیں کر رہا تھا۔ انیقہ پر عجیب سی بے حسی طاری تھی۔ اسے سمیرا کی پریشانی سے کوئی واسطہ نہیں تھا۔

''تم چلی جاؤ سمیرا! یہاں بوا تو ہیں میرے پاس پھر مالی بابا ہیں۔ فیض کاکا (خانساماں) ہیں۔'' ان لوگوں کو ممی نے نوکروں کا نام بھی احترام سے لینا سکھایا تھا اور پھر یہ ان لوگوں کے بہت پرانے اور خاندانی نوکر تھے۔

انیقہ نے جس سرد لہجے میں یہ بات کہی تھی اسے سمیرا نے بہت محسوس کیا اور وہ آنسو پیتی ہوئی اس کے پاس سے اٹھ آئی۔

ڈیڈی جس کمپنی میں کام کرتے تھے اس نے ڈیڈی کے سارے واجبات ادا کرنے میں دیر نہیں کی تھی جو سمیرا اور نمرہ نے باہمی اتفاق سے انیقہ کے

اکاؤنٹ میں جمع کروا دیے تھے۔ کچھ رشتے داروں نے اعتراض کا نکتہ اٹھایا لیکن نمرہ نے یہ کہہ کر ان کو خاموش کرا دیا۔

''ہم نے اپنے اپنے شوہروں سے مشورے کے بعد ہی یہ فیصلہ کیا ہے۔ ان پیسوں کی حق دار انیقہ ہی ہے۔ ہم لوگ تو ماشاء اللہ اپنے اپنے گھروں میں سیٹ ہیں۔'' لیکن انیقہ کو بہنوں کی اس محبت یا قربانی سے بھی جیسے کوئی غرض نہ تھی۔ پتا نہیں کیوں وہ ایسی ہو گئی تھی۔ بالکل سپاٹ چہرے کے ساتھ اس نے پیپرز سائن کیے تھے۔

☆☆

''ممی ڈیڈی کو تو موت نے ہم سے چھین لیا لیکن انیقہ تو جیتے جی ہم سے چھن گئی ہے نعمان!'' اس شام وہ آنسوؤں بھری آواز میں نعمان کو فون پر بتا رہی تھی۔ انیقہ کے ساتھ چلنے پر انکار نے اسے بہت دل گرفتہ کر دیا تھا۔

''وہ ابھی بہت صدمے میں ہیں سمیرا، تم اس سے زیادہ اصرار مت کرو بلکہ ایسا کرتے ہیں کہ کچھ ماہ کے لیے ہم دونوں کراچی تمہارے گھر ہی سیٹل ہو جاتے ہیں۔ ڈیڈی آفس کی ایک برانچ کراچی میں کھولنا چاہتے ہیں۔ مجھے اس سلسلے میں ویسے بھی بہت آنا جانا ہوگا۔ اس سے بہتر ہے کہ اس دوران ہم لوگ وہیں رک جائیں۔ ان چند ماہ میں یقیناً انیقہ کافی سنبھل جائے گی۔'' نعمان کی یہ بات گویا سکون کی ایک پھوار بن کر اس کے جلتے ہوئے دل پر گری۔

''آپ بہت اچھے ہیں نعمان!'' وہ بے ساختہ رو دی۔

''ایسے مت رویا کرو جان میرا دل پھٹنے لگتا ہے۔'' نعمان کے پیار بھرے لہجے سے مزید بھر آیا۔ ممی ڈیڈی کی دائمی جدائی، نمرہ کے چلے جانے کا غم اور پھر انیقہ کا سرد رویہ۔ ان سب چیزوں نے اسے بالکل توڑ کر رکھ دیا تھا۔ ایسے میں نعمان کی محبت اور ہمدردی کے یہ چند الفاظ اسے بے اختیار رلا گئے تھے۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی جبکہ دوسری طرف نعمان بے تابانہ اسے چپ کرانے کی کوشش کر رہا تھا۔

☆☆

''انیقہ، یہ دیکھو آج میں تمہارے لیے کیا لے کر آئی ہوں!'' سمیرا نے لاؤنج میں داخل ہوتے ہی انیقہ کو اپنی طرف متوجہ کیا جو بڑی محویت سے کوئی ڈراما دیکھ رہی تھی۔

''اُف اوہ سمیرا، ابھی پچھلے ہفتے ہی تو ایک نیا سوٹ تم لا چکی ہو اور آج پھر......'' وہ بات ادھوری چھوڑ کر سمیرا کو شاپر سے سوٹ نکالتے ہوئے دیکھنے لگی۔ پنک کلر کے شیفون کے کرتے پر فیروزی موتی اور تلّے کا کام بے حد حسین لگ رہا تھا۔ فیروزی اور پنک کنٹراسٹ کا دوپٹا اور سلک کی فیروزی شلوار والا یہ سوٹ سچ مچ اتنا خوبصورت تھا کہ انیقہ بس دیکھتی ہی رہ گئی۔ سمیرا نے آ کر اسے گلے سے لگا لیا۔

''انیقہ آج بہت دنوں بعد ہم لوگ کسی خوشی کی تقریب میں جا رہے ہیں۔ میں چاہتی ہوں میری بہن وہاں سب سے خوبصورت، سب سے پیاری لگے۔'' انیقہ کی آنکھیں بھیگ گئیں۔

''خبردار جو تم ذرا بھی روئیں۔ چلو اب جلدی سے تیار ہو جاؤ، نعمان بس آتے ہی ہوں گے۔'' سمیرا نے اس کی آنکھوں میں آئے آنسوؤں کو پونچھتے ہوئے پیار سے کہا تو انیقہ ہولے سے مسکرا دی۔

''سمیرا میری تو تیاری بھی تمہاری محتاج ہے۔''

''اوہ ہاں، یہ بات تو میں بھول ہی گئی تھی۔ چلو جب تک تم کپڑے چینج کرو، میں نہا کر آتی ہوں پھر میں تمہارا میک اپ کر دوں گی۔'' سمیرا عجلت میں کہتی

ہوئی کمرے سے باہر چلی گئی تو انیقہ نے بڑے اشتیاق سے اس سوٹ کو دوبارہ دیکھا اور پھر مسکراتے ہوئے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

آج تقریباً چھ ماہ بعد وہ لوگ ایک سال گرہ کی تقریب میں جا رہے تھے۔ سمیرا نے ممی ڈیڈی کے چلے جانے کے بعد اپنی بھرپور توجہ اور محبت سے انیقہ کو دوبارہ جیسے اس کی کھوئی ہوئی بہن واپس لوٹا دی تھی۔ ماں باپ کی اتنی اچانک دائمی جدائی کے غم کو سمیرا اپنے دل میں چھپا کر اپنی چھوٹی بہن کے آنسوؤں کو جیسے اپنی پلکوں سے چنتی رہی تھی اور آج اپنے کزن کے بیٹے کی سال گرہ میں جانا بھی اس سلسلے کی ایک کڑی تھی۔ یہ غم تو اس کی زندگی کی آخری سانس تک اس کے ساتھ ہی رہنا تھا، سال گرہ میں جانے نہ جانے سے اس کا کوئی تعلق نہ تھا۔ ہاں البتہ اس کی لاڈلی بہن کے چہرے پر آئی ہلکی سی مسکراہٹ کی رمق جیسے اس کے دل کے اندھیروں میں ایک کرن کی طرح روشنی پھیلا دیتی تھی۔ انیقہ کی خاطر ہی وہ کراچی شفٹ ہوئی تھی۔ نعمان نے اس کے ساتھ بہت تعاون کیا تھا۔ اس کے غم، اس کی پریشانیوں اور اس کے مسائل کو اتنی محبت سے شیئر کیا تھا کہ سمیرا کو اس شدید غم کو سہنے کا بے حد حوصلہ ملا تھا اور اپنے جیون ساتھی پر بے حد ناز بھی محسوس ہوا تھا۔

انیقہ کے دل سے بدگمانیوں کا زہر دھونے میں بھی نعمان نے بھرپور کردار ادا کیا تھا۔ خود سمیرا سے دور رہ کر اس نے انیقہ کو اپنی بہن کے ساتھ زیادہ سے زیادہ وقت گزارنے کا موقع دیا تھا۔ جانتا تھا کہ اس وقت انیقہ کو سمیرا کی غمگساری اور اس کی محبت و توجہ کی اس سے زیادہ ضرورت ہے اور اس بات کے لیے بھی سمیرا اس کی بے حد شکر گزار تھی۔ آج بھی نعمان کے اصرار پر ہی اس نے برتھ ڈے پر جانے کا پروگرام بنایا تھا۔

اس وقت وہ نہا کر ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے تقریباً بالکل تیار کھڑی تھی کہ نعمان کمرے میں داخل ہوا۔ پلین اورنج سلک کی ساڑی اور لائٹ سے میک اپ میں کافی عرصے بعد وہ نعمان کو بہت فریش اور پیاری پیاری سی لگی۔ چاندی کے چھوٹے چھوٹے خوبصورت جھمکے اس کے خوبصورت چہرے کی جگمگاہٹ کو مزید بڑھا رہے تھے۔ نعمان کا دل بے اختیار ہونے لگا۔ سمیرا نے آئینے میں اس کا عکس دیکھا تو بے اختیار چونک کر اس کی طرف مڑی۔ وہ شوق کا ایک جہان اپنی آنکھوں میں بسائے اسے اتنے پیار سے دیکھ رہا تھا کہ وہ بلش ہو کر اسی کے سینے میں منہ چھپا بیٹھی۔ تب ہی انیقہ کے پکارنے پر دونوں چونک گئے۔ نعمان کے چہرے پر ناگواری کی لہر دوڑ گئی لیکن دوسرے ہی لمحے وہ اپنے آپ کو سنبھال چکا تھا۔

''جاؤ سمیرا...... اس وقت ہمیں اپنی خوشی سے زیادہ انیقہ کے جذبات کا احساس کرنا ہے۔'' وہ سمیرا کے چہرے پر کشمکش کے تاثرات کو اچھی طرح سے محسوس کر رہا تھا۔

سمیرا نے بڑی بے بسی سے اسے دیکھا تو نعمان نے بہت نرم مسکراہٹ کے ساتھ اس کو باہر جانے کا اشارہ کیا کیونکہ انیقہ متواتر اسے آوازیں دے رہی تھی۔

☆☆

وہ درد سہا ہے جو غیروں کا نہیں تھا
وہ زخم لگے ہیں جو خنجر کے نہیں ہیں

اس وقت رات کا ایک بج رہا تھا۔ وہ تینوں ٹی وی لاؤنج میں بیٹھے ہوئے ٹی وی پر چلنے والی کوئی بہت دلچسپ کامیڈی مووی دیکھ رہے تھے۔ انیقہ کے دلچسپ تبصروں پر نعمان کی بے ساختہ ہنسی جیسے سمیرا کے دل پر چرکے سی لگا رہی تھی۔ وہ بے اختیار اٹھ کر اپنے کمرے کی طرف جانے لگی تو نعمان نے

ایک لمحے کو اسکرین پر سے نگاہیں اٹھا کر اسے دیکھا۔
''سمیرا یار، یہ کیا بوریت ہے۔ اتنا مزہ آ رہا ہے اور تم فلم چھوڑ کر جا رہی ہو؟'' سمیرا نے انیقہ کو دیکھا جو اس کے جانے سے بے نیاز بڑی محویت سے ڈرائی فروٹ کھاتے ہوئے ٹی وی کی طرف متوجہ تھی۔ اس سے پہلے کہ سمیرا کوئی جواب دیتی۔ انیقہ کے سریلے قہقہے پر نعمان کی توجہ پہلے اس کی طرف ہوئی اور پھر نظریں ٹی وی اسکرین پر جم گئیں اور بے ساختہ مسکراہٹ نے اس کے چہرے کا احاطہ کر لیا۔ سمیرا کچھ لمحے کھڑی رہی لیکن انیقہ کی متواتر کھلکھلاتی ہنسی نے نعمان کی توجہ کچھ اس طرح اس کی اور ٹی وی کی جانب مبذول کر دی تھی کہ وہ سمیرا کے وجود کو جیسے بھلا ہی بیٹھا۔ سمیرا آنکھوں میں امڈتے آنسوؤں کے ساتھ کمرے میں آ گئی۔ لاؤنج سے بدستور ان دونوں کے ہنسنے بولنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ اسے اپنا آپ بہت تنہا تنہا سا محسوس ہونے لگا۔ وہ دو لوگ جو اسے اپنی زندگی سے بھی پیارے تھے آج انہوں نے اس کے نزدیک ہوتے ہوئے بھی اسے اکیلا کر دیا تھا۔ اس کا دل بھر آیا وہ گھٹ گھٹ کر رونے لگی۔

پچھلے کئی دنوں سے وہ ایسے ہی تکلیف دہ احساس سے دوچار رہنے لگی تھی۔ انیقہ نے ممی ڈیڈی کی موت کے بعد یونیورسٹی جانا چھوڑ دیا تھا لیکن پھر سمیرا کے بے حد اصرار پر وہ پرائیویٹ امتحان دینے پر راضی ہو گئی تھی۔ اس کی اسٹڈی میں نعمان اس کی کافی ہیلپ کر رہا تھا اور اب تو یوں ہونے لگا تھا کہ سمیرا کہیں جانے کا پروگرام بناتی لیکن نعمان، انیقہ کے ساتھ کتاب کھولے کسی چیپٹر میں الجھا بیٹھا رہتا۔ وہ بے حد بور ہو کر اپنے کمرے میں آ جاتی یا در پھر کافی دیر کے بعد وہ دونوں ہنستے مسکراتے ہوئے اس کے پاس آتے تو وہ بھی اپنے دل کا درد چھپا کر جبراً مسکرا کر ان کی باتوں میں شریک ہو جاتی جو ہنوز پڑھائی کے سلسلے میں ہو رہی ہوتی تھی۔ انیقہ کی شوخیاں، اس کی برجستہ باتیں، اس کی خوبصورت ہنسی سب آہستہ آہستہ واپس لوٹ آئی تھیں۔

''بھئی جب میری شادی ہوئی تھی تو تم کوئی اور انیقہ تھی۔ خاموش، ریزرو اور بہت روکے سوکھے مزاج والی۔ اس شوخ و چنچل انیقہ کو کہاں چھپا دیا تھا تم نے؟ ہمیں تو سالی بہنوئی والی چھیڑ چھاڑ کا کوئی مزہ ہی نہیں ملا۔'' اس دن کھانے کی میز پر انیقہ کی کسی مزے داری بات پر ہنستے ہوئے نعمان نے جب کہا تھا تو انیقہ ایک لمحے کو چپ سی ہو گئی تھی جبکہ سمیرا کے دل میں بھی چھن سے کچھ ٹوٹا تھا۔

''کاش انیقہ ویسے ہی ریزرو اور سنجیدہ رہتی۔'' اس نے ٹھنڈی سانس لے کر سوچا تھا۔ پتا نہیں کیوں یہ شوخ و چنچل سی انیقہ اسے ایک ایسے سائے کے مانند محسوس ہونے لگی تھی جو اس کی زندگی کے چور دروازے سے بڑی آہستگی کے ساتھ اس کی خوشیوں کے باغ کو اجاڑنے کے لیے اندر داخل ہو رہا تھا۔ کتنی ہی بار اس نے اپنے اس خیال کو جھٹکنے کی کوشش کی تھی لیکن دماغ اپنی بات پر ڈٹا ہوا تھا۔ نعمان آفس سے آتا تو کمرے میں آنے کے بجائے وہیں لاؤنج میں رک جاتا جہاں انیقہ کتابیں پھیلائے بیٹھی ہوتی۔ پڑھائی پر یا پھر ٹی وی پر چلتے ہوئے کسی پروگرام کو دلچسپی سے دیکھتے ہوئے وہ اپنے کمرے سے بار بار نعمان کی بے ساختہ ہنسی کی آواز سنتی کہ انیقہ کے مزے دار تبصرے جو جاری رہتے تھے۔ اس کی لانبی زلفیں پشت پر اور شانے پر بکھری رہتیں اور اس کی بے حد خوبصورت بڑی بڑی چمکدار آنکھوں کی روشنی کے حصار میں جیسے نعمان قید ہو کر رہ جاتا۔

''سمیرا کہاں ہو بھئی، دیکھو انیقہ چائے بنا کر لے آئی ہے۔'' وہ درمیان میں اسے پکارتا بھی رہتا تھا لیکن سمیرا کو اس کا یہ انداز بھی بے حد رسمی سا لگتا۔

انیقہ جو اس کی جان وجگر تھی اب جیسے اس کے دل میں ایک کانٹے کی طرح چبھنے لگی تھی۔ اس نے نعمان سے، اپنے جیون ساتھی سے دل کی گہرائیوں سے پیار کیا تھا، محبت کے اسرار ورموز سے آگاہی اسے نعمان کے اپنی زندگی میں آنے کے بعد ہی تو ہوئی تھی۔ وہ تمام باتیں وہ تمام جملے جو اس کے اندر ایک طوفان برپا کر دیتے تھے، اس کی روح میں سرایت کر جاتے تھے، اسے کسی اور دنیا میں لے جاتے تھے، اب نعمان جیسے بھولتا جا رہا تھا یا پھر انیقہ اپنی دلچسپ باتوں کے سحر میں اسے کچھ اس طرح جکڑ لیتی کہ نعمان کے پاس سمیرا کے لیے کچھ کہنے کا وقت ہی نہ بچتا اور سمیرا کی اداسی اس کی دل گرفتگی کو نظر انداز کرنے میں بھی اسے کمال آتا جا رہا تھا، ورنہ سمیرا کے چہرے پر ہلکی سی دکھ کی پرچھائیں بھی اسے پریشان کر دیتی تھی۔ وہ تو اس کی زندگی تھا اس کی ہر سانس میں نعمان صرف نعمان بستا تھا پھر وہ کیسے اس کا یہ بدلتا روپ، بدلتا ہوا رویہ سہہ لیتی۔ لیکن وہ یہ نہیں جانتی تھی کہ دل بدلتے ہیں تو رویے بھی بدل جاتے ہیں۔ اس کا نعمان اس کے لیے پرایا ہوتا جا رہا تھا اور اس کو پرایا کرنے والی اس کی اپنی تھی...... اس کی اپنی ماں جائی جسے اس نے ماں سے بھی بڑھ کر چاہت دی تھی۔ وہ ان دونوں کے بدلتے ہوئے رویوں کو اچھی طرح سے محسوس کر رہی تھی لیکن اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ اس سچویشن کو کیسے ہینڈل کرے۔ محض شک کی بنیاد پر وہ کیسے اتنی چھوٹی بات کر سکتی تھی لیکن بہرحال اس کا رویہ انیقہ کے ساتھ کافی سرد ہوتا جا رہا تھا لیکن انیقہ اب وہ پہلے والی انیقہ بھی تو نہیں رہی تھی۔ اسے جیسے سمیرا کی اداسی، خفگی اور اس کی سرد مہری سے کوئی سروکار ہی نہیں رہا تھا۔ وہ تو اس دنیا میں گم اور مست تھی جس میں نعمان بستا تھا۔

☆☆............

"چلیں نعمان ہم واپس اسلام آباد چلتے ہیں۔ کل ہی میری ماما سے فون پر بات ہوئی ہے۔ اب وہ کچھ زیادہ ہی مس کرنے لگی ہیں ہمیں۔" اس دن رات کو نعمان کے بازوؤں میں سر رکھتے ہوئے اس نے بہت پیار سے کہا تو نعمان نے الجھ کر اسے دیکھا۔

"تم بھی کمال کرتی ہو۔ ابھی ابھی تو آفس سیٹ ہوا ہے۔ ہزار مسائل ابھی بھی سر اٹھائے کھڑے ہیں اور تم اسلام آباد شفٹ ہونے کی بات کر رہی ہو اور پھر انیقہ کا بھی کچھ خیال ہے تمہیں۔ وہ یہاں اکیلے کیسے رہے گی؟" نعمان کے آخری جملے پر سمیرا نے چونک کر اسے دیکھا۔ اسے نعمان کی یہ فکر مندی انیقہ کے لیے ذرا بھی اچھی نہیں لگی تھی۔

"میں نے نمرہ سے بات کی ہے وہ انیقہ کو امریکا بلانے کا سوچ رہی ہیں۔ وہیں کوئی اچھا سا رشتہ دیکھ کر وہ اس کی شادی کر دیں گی۔ آپ کو اس سلسلے میں فکر مند ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔" سمیرا کے لہجے میں خود بخود تلخی در آئی۔

"تم بہنوں کا جو دل چاہتا ہے وہ کرو لیکن میں ابھی اسلام آباد ہرگز شفٹ نہیں ہو سکتا۔ تمہیں جانا ہے تو جاؤ۔" وہ ایک جھٹکے سے اپنا بازو اس کے سر کے نیچے سے نکالتے ہوئے کروٹ بدل کر لیٹ گیا۔ سمیرا کو محسوس ہوا جیسے نعمان نے کروٹ نہیں بلکہ اپنی نظریں اس کی طرف سے پھیر لی ہیں۔ وہ چپ چاپ ساکت لیٹی چھت کو گھورتی رہی۔ دل میں جیسے کوئی خنجر گھونپ رہا تھا۔ کمرے میں پھیلا اندھیرا اسے اپنے دل اور زندگی پر چھایا ہوا محسوس ہو رہا تھا پھر وہ بے اختیار رونے لگی۔ اس کی سسکیاں یقیناً نعمان کے کانوں تک پہنچ رہی تھیں لیکن وہ جو اس کی آنکھ میں ایک آنسو نہیں برداشت کر سکتا تھا آج اس کی درد بھری سسکیوں سے بے نیاز دوسری طرف منہ کیے بظاہر سوتا رہا اور سمیرا کی پوری رات روتے

ہوئے گزر گئی۔

صبح اس کی آنکھ دیر سے کھلی، وہ گھبرا کر اٹھ کر بیٹھ گئی۔

"اف نعمان کو آفس سے دیر نہ ہو جائے۔" وہ عجلت میں سلیپر پہنتے ہوئے کمرے سے باہر آئی تو ڈائننگ ٹیبل پر پڑے جھوٹے برتنوں کو دیکھ کر وہ ٹھٹک سی گئی۔

"ارے سمیرا تم کب جاگیں، میں تمہارے لیے چائے لاتی ہوں۔" دفعتاً انیقہ کی آواز پر وہ بری طرح سے چونک گئی۔ جو مسکراتے ہوئے باہر سے آرہی تھی۔

"نعمان کیا آفس چلے گئے؟" اس نے انیقہ کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے بہت خشک لہجے میں پوچھا۔

"ہاں......" انیقہ کا جواب بہت مختصر تھا۔

"یہ ناشتا تم نے بنایا ہے؟" سمیرا کا چہرہ ضبط کی شدت سے سرخ ہو رہا تھا۔

"ہاں۔" انیقہ کے اسی انداز میں جواب دینے پر اس کے ضبط کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔

"فیض کا کا نے کیوں نہیں بنایا ناشتا؟ تمہیں کیا ضرورت تھی؟" شدید غصے میں بے ربط جملے اس کے منہ سے نکل رہے تھے۔ پوری رات کی ٹینشن کا ردعمل بھی تھا۔

"سمیرا ایسی کون سی قیامت آگئی اگر میں نے نعمان بھائی کا ناشتا بنا دیا یا انہیں باہر تک سی آف کرنے چلی گئی۔" وہ بظاہر مسکرا کر بڑے ٹھنڈے لہجے میں بولی تھی لیکن انداز اتنا تپا دینے والا تھا کہ سمیرا بُری طرح سے بھڑک گئی۔

"ہاں...... قیامت ہی ٹوٹنے والی ہے میرے گھر پر، میری سگی بہن کے ہاتھوں!" وہ قہر آلود نگاہوں سے اسے دیکھ کر چیخ کر بولی تو انیقہ نے میز پر سے پانی کا گلاس اٹھا کر اس کی طرف بڑھایا۔

"سمیرا تمہیں غصے میں میری کوئی بات سمجھ میں نہیں آئے گی۔ چلو پانی پی کر اپنے آپ کو کول ڈاؤن کرو۔"

سمیرا نے اس کے ہاتھ سے گلاس لے کر پوری قوت سے دیوار پر دے مارا۔ ایک زوردار چھناکے سے گلاس کے ٹکڑے چار سو بکھر گئے۔ فیض کا کا کچن سے دوڑتے ہوئے آئے تو انیقہ نے ایک خاموش نظر سمیرا کی جانب ڈالی اور تیزی سے دروازے سے باہر نکل گئی۔ سمیرا دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا کر زور زور سے رونے لگی۔ فیض کا کا متوحش ہو کر اس کے سر پر ہاتھ رکھے اسے سمجھانے کی کوشش کر رہے تھے۔ ان کی کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ آخر دونوں بہنوں کے درمیان ایسی کیا بات ہو گئی ہے کہ جس کا اتنا شدید ردعمل سامنے آیا ہے۔

☆☆

خبر نہ تھی وہ مجھے قتل کرنے آیا ہے
میں اس کو دوست سمجھتا تھا وار کرنے تک

وہ بڑی ہمت کر کے انیقہ کے کمرے میں داخل ہوئی تھی۔ انیقہ قالین پر دیوار سے ٹیک لگائے ہوئے بیٹھی تھی۔ دراز زلفیں شانوں پر بکھری ہوئی تھیں۔ آنکھیں لہو رنگ ہو رہی تھیں۔ سمیرا کا دل اسے دیکھ کر کٹنے لگا اپنے اوپر غصہ آنے لگا۔ کتنی گھٹیا بات کہہ دی تھی آج اس نے انیقہ سے۔ وہ اس پر چلا کر اپنے کمرے میں آکر کتنی دیر تک روتی رہی تھی اور جب آنسوؤں نے دل کا بوجھ کافی کم کر دیا تو خود بخود اسے اپنے رویے پر ندامت سی محسوس ہونے لگی تھی۔

انیقہ کا اس کے سوا تھا ہی کون۔ کتنی مشکلوں سے تو اس نے انیقہ کو اپنی بھرپور توجہ اور محبت سے ایک بار پھر زندگی کی طرف لوٹایا تھا لیکن اب اس کی مسکراہٹوں کو بلاوجہ ہی شک کی آگ میں جلانے کے

درپے ہو رہی تھی اور ساتھ ساتھ نعمان کی محبت کو بھی کھونے کا سامان کر رہی تھی۔

''اگر اس کو پتا چل گیا کہ میں اس کے خلوص کو غلط نظروں سے دیکھ رہی ہوں تو وہ مجھے بھی معاف نہیں کرے گا۔'' اس نے شرمندگی سے سوچا اور بوجھل قدموں سے انیقہ کے پاس آ کر قالین پر بیٹھ کر بے اختیار اس کے دونوں ہاتھ تھام لیے۔

''سوری انیقہ، پتا نہیں مجھے کیا ہوتا جا رہا ہے۔ شاید میں ممی ڈیڈی کے بعد کچھ زیادہ ہی حساس ہو گئی ہوں۔ میں نے تم دونوں کے خوب صورت رشتے کو پتا نہیں کیوں ایسی بدصورتی سے دیکھا۔ پلیز مجھے معاف کر دو۔'' وہ اس کے دونوں ہاتھ اپنی آنکھوں سے لگا کر بے اختیار رو دی۔ انیقہ نے ہولے سے اپنے ہاتھ اس کے ہاتھوں سے چھڑا لیے۔

''سمیرا رو نہیں اور نہ ہی مجھ سے معافی مانگو...... شاید قصور میرا ہی ہے۔'' اس کا لہجہ اتنا عجیب تھا کہ سمیرا اسے دیکھتی رہ گئی۔ دل عجیب انداز سے دھڑکنے لگا۔ اس نے انیقہ کی جانب دیکھا تو ایک عجیب سی بے خوفی اور سرمستی اس کی آنکھوں میں چھلکتی نظر آئی۔ سمیرا کو یوں محسوس ہوا جیسے ان نگاہوں میں کوئی بہت بڑا طوفان چھپا ہو۔

''نہیں انیقہ، مجھے تم سے اتنی گری ہوئی بات نہیں کہنی چاہیے تھی۔'' وہ دھڑ دھڑاتے ہوئے دل کے ساتھ بولی تو انیقہ ہولے سے مسکرا دی۔

''سمیرا میں سوچتی ہوں محبت وہاں کیوں ہو جاتی ہے جہاں نہیں ہونی چاہیے اور تب کیوں ہو جاتی ہے جب نہیں ہونی چاہیے؟''

''انیقہ تم کہنا کیا چاہتی ہو؟'' سمیرا کی آواز لڑکھڑا سی گئی۔

''میں خود نہیں جانتی سمیرا کہ میں کیا چاہتی ہوں۔'' وہ ایک دم ہی رو پڑی۔

سمیرا سب کچھ سمجھ کر بھی حقیقت سے نگاہیں چرا رہی تھی۔ اس کا دل ڈوبا جا رہا تھا۔ انیقہ اس کی لاڈلی چھوٹی بہن تھی لیکن کبھی کبھی ایک لمحے کی نفرت سالہا سال کی محبت کو پلک جھپکتے میں مٹا دیتی ہے اور وہی لمحہ اپنی پوری سفاکی کے ساتھ دونوں بہنوں کے درمیان آ گیا تھا۔ آج پہلی بار انیقہ کے آنسو اسے زہر کے مانند اپنے دل میں اترتے ہوئے محسوس ہوئے۔ وہ بے اختیار بنا کچھ اور کہے اٹھ کھڑی ہوئی۔

''سمیرا میں تم سے کچھ کہنا چاہتی ہوں۔'' اس کے بڑھتے ہوئے قدموں کو انیقہ کی آواز نے پل بھر کے لیے روکا۔

''میں کوئی بھی فضول بات سننے کے موڈ میں نہیں ہوں۔'' وہ بہت خشک لہجے میں کہتی ہوئی تیزی سے باہر نکل گئی۔ انیقہ نے دیوار کی پشت سے ٹیک لگا کر آنکھیں بند کر لیں۔ آنسوؤں سے اس کے رخسار تر ہو رہے تھے۔

''میں کیا کروں سمیرا...... کیسے تم کو بتاؤں کہ نعمان کو تم سے پہلے میری نظر نے چوما تھا۔ میں نے پہلے اسے اپنے دل میں بسایا، اس کے بعد تم نے اسے چاہا۔'' ماضی کے اندھیرے میں چھپا وہ منظر ایک بار پھر انیقہ کی نگاہوں کے سامنے جگمگا اٹھا۔ جب اس نے پہلی بار نعمان کو دیکھا تھا۔ کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ وہم ایسے لمحہ تسخیر میں کسی سے ملتے ہیں کہ پھر کبھی اس لمحے کے سحر سے نکل ہی نہیں پاتے۔ کسی نے سچ کہا ہے کہ محبت دل میں داخل ہونے کے لیے اجازت نہیں مانگتی۔ ایسے پلک جھپکتے دل میں اتر جاتی ہے کہ انسان بے بسی کی تصویر بن کر رہ جاتا ہے۔ انیقہ کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا تھا جب اس نے پہلی بار نعمان کو دیکھا تھا۔

اس دن اتفاق سے سمیرا، فراز ماموں کے ہاں

رہنے گئی ہوئی تھی۔ وہ یونیورسٹی سے تھکی ماندی جب گھر واپس لوٹی تو شدید گرمی اور دھوپ سے اس کا چہرہ کملایا ہوا اور سانولی رنگت مزید گہری ہو رہی تھی۔ بوا نے بتایا کہ رحمان صاحب کے کوئی دوست بمعہ بیگم اور بیٹے کے اچانک اسلام آباد سے آگئے ہیں اور اس وقت وہ لوگ آرام کر رہے ہیں۔ وہ ممی سے تفصیل پوچھنے تیزی سے ان کے کمرے کی طرف جا رہی تھی کہ اچانک ہی کسی سے بُری طرح سے ٹکرا گئی۔ ہاتھ میں پکڑی فائل اور کتابیں دور جا گریں۔

''آئی ایم ویری سوری!'' اس دل کش بھاری آواز پر اس نے بے اختیار نگاہیں اٹھائیں تو وہ بے حد چمکتی ہوئی خوبصورت ساحر آنکھوں سے کچھ ایسے جا الجھیں کہ چند سیکنڈ تک وہ جیسے ایک ٹرانس میں رہی۔

''آپ شاید رحمان صاحب کی بیٹی ہیں؟'' وہ کچھ تجسس بھری نگاہوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

''جی ہاں......'' وہ جلدی سے جھک کر اپنی فائل اور کتابیں اٹھانے لگی۔ پتا نہیں کیسی مقناطیسی شخصیت تھی اس کی کہ دل بے اختیار بار بار اس کو دیکھنے کی خواہش کر رہا تھا۔ پہلی بار زندگی میں کسی نے اس کے دل کے بند دروازے پر کچھ ایسے دستک دی تھی کہ اس نے بنا سوچے سمجھے اپنے دل کے سارے کواڑ اس کے لیے کھول دیے تھے۔ یہ محسوس کیے بنا کہ نعمان کی آنکھوں میں اسے دیکھ کر کچھ مایوسی سی جھلکنے لگی تھی۔

''ایکسکیوزمی، مجھے ایک ضروری کال کرنی ہے۔'' وہ موبائل ہاتھوں میں لیے بنا اپنا تعارف کروائے تیزی سے باہر کی طرف چلا گیا۔ انیقہ نے اسے یوں جاتے دیکھا تو ایک شوخ سی مسکراہٹ اس کے لبوں پر آگئی۔ کچھ بہت برجستہ جملے لبوں پر آنے کو مچل اٹھے، وہ دبے قدموں اس کے پیچھے چلی آئی، وہ موبائل پر کسی سے محو گفتگو تھا۔

''یار اگر یہ وہی لڑکی ہے جس کے لیے ممی پاپا مجھے یہاں لے کر آئے ہیں تو سمجھو میں تو مارا گیا۔'' انیقہ ٹھٹک کر وہیں رک گئی۔ ''نہ رنگ ہے اور نہ روپ ہے۔ بس یوں سمجھ لو کہ ایک بار دیکھا ہے اور پھر نہ دیکھنے کی چاہ ہے۔'' کتنے سفاک الفاظ تھے وہ جنہوں نے انیقہ کے دل کو کرچی کرچی کر دیا تھا...... پھر کچھ اور اس سے سنا ہی نہ گیا۔

وہ لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے اپنے کمرے میں چلی گئی اور چپ چاپ ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے جا کر کھڑی ہوگئی۔ آئینے میں ایک دبلی پتلی، سانولی سی، عام سے نقوش والی لڑکی کھڑی اسے بڑے طنزیہ انداز میں دیکھ رہی تھی۔ لانبے گھنے بالوں کی خوبصورتی کو بھی اس نے کس کر باندھی گئی چوٹی میں چھپا دیا تھا۔ کچھ بھی تو نہیں تھا اس لڑکی میں، پھر وہ کیسے اتنے خوبصورت خواب اپنی آنکھوں میں سجا بیٹھی تھی۔ کسی کے چند سفاک جملوں نے اس سے اس کی شوخیاں، مسکراہٹیں، اس کی کھلکھلاہٹیں سب کچھ چھین کر اسے تہی دامن کر دیا تھا۔

شام کو سمیرا کے آنے پر انیقہ نے نعمان کی آنکھوں میں جو خوشی کی جوت چمکتے دیکھی تھی اس نے اسے مزید توڑ کر رکھ دیا تھا۔ سیاہ چوڑی دار پاجامہ اور گلابی کرتے پر سیاہ دوپٹا اوڑھے وہ حسن کا ایک ایسا مکمل شاہکار نظر آ رہی تھی جس پر سے نعمان کی نگاہ ہٹ ہی نہیں رہی تھی۔ ممی نے جب اسے بتایا کہ یہ لوگ سمیرا کے رشتے کے سلسلے میں آئے ہیں تو وہ بس ہونٹ کچل کر رہ گئی۔

''ممی پلیز، نعمان میرا خواب ہے۔ اس خواب کی تعبیر پر سمیرا کا کوئی حق نہیں۔ وہ لاکھ ستم گر سہی لیکن پھر بھی میں اس کی داسی بن کر، اس کے قدموں میں پوری زندگی گزارنا چاہتی ہوں۔'' وہ خاموش نظروں سے اپنی ماں کو اپنے دل کا حال بتا رہی تھی لیکن ممی

اپنی خوشیوں میں کچھ ایسی مگن تھیں کہ بیٹی کے چہرے پر بکھرا ملال نہ دیکھ سکیں اور نہ سمجھ سکیں۔ سمیرا جو اس کے بن کہے اس کی ہر بات، ہر خواہش جان جاتی تھی اسے بھی نعمان کی محبت کی جھلملاہٹ میں اس کا اترا ہوا چہرہ نظر نہیں آ رہا تھا اور وہ جو سمیرا سے بھلا جھجک اس کا پسندیدہ ڈریس، جیولری یا میک اپ مانگ لیا کرتی تھی۔ آج اس کی زندگی کی سب سے بڑی خوشی کو بھی اس سے مانگنا چاہ رہی تھی۔ پتا نہیں کیوں اسے یقین تھا کہ سمیرا یہ خوشی، یہ قربانی بھی دے دے گی لیکن پھر نعمان کے جملوں کی بازگشت اسے کچھ بھی کہنے سے روک دیتی تھی۔ سمیرا کے لیے اس کی چاہت، پسندیدگی، وارفتگی کچھ بھی تو انیقہ کی نظروں سے چھپی نہ تھی لیکن آج اسی نعمان کی آنکھوں میں بسی سمیرا کی تصویر پتا نہیں کیسے دھندلی ہوتی جا رہی تھی اور وہ آہستہ آہستہ انیقہ کی شخصیت کے سحر میں جکڑتا جا رہا تھا۔ اس کی آنکھوں کی چمک میں ڈوبتا جا رہا تھا۔ اس کی گھنی زلفوں کے سائے میں بیٹھنے کو بے قرار رہنے لگا تھا۔ اس کی مزے دار باتیں اور دلچسپ کمپنی میں گویا وہ کچھ دیر کے لیے ساری دنیا کو بھلا بیٹھتا تھا۔ انیقہ کی کھلکھلاتی ہنسی میں کھو کر سمیرا کی آنکھوں کی اداسی اسے نظر ہی نہیں آ رہی تھی۔ کیا یہ وہی نعمان ہے۔ جس نے کچھ عرصہ قبل اسے قابل اعتنا نہ سمجھا تھا۔ انیقہ سوچتی اور اس کا ایمان اپنی محبت کی سچائی اور طلب پر مزید پختہ ہونے لگتا۔ یہ سوچے بنا کہ وہ اپنی ماں جیسی بہن کا گھر اور دل توڑ کر کتنے بڑے گناہ کی مرتکب ہو جائے گی۔ اپنی بے حد چاہنے والی بہن کی بے لوث چاہتوں اور قربانیوں کو اپنی خود غرض محبت کی بھینٹ چڑھاتے ہوئے اسے ذرا بھی رحم نہیں آ رہا تھا۔

سمیرا کی شادی شدہ خوبصورت زندگی انیقہ کے عشق کے شعلوں کی زد میں آ کر جل کر راکھ ہو رہی تھی اور وہ بے بسی کی تصویر بنی اس ناقابل برداشت دھچکے کو کسی صورت برداشت نہیں کر پا رہی تھی۔ اس کے سارے واہم حقیقت کا روپ دھار کر اس کے دل، اس کی روح پر ایسے گھاؤ لگا رہے تھے کہ اس کی اذیت سہی نہیں جاتی تھی۔ رو رو کر اس کی آنکھیں سوج گئی تھیں۔ ممی، ڈیڈی کو تڑپ تڑپ کر پکارا تھا اس نے۔

اف کیسا دکھ تھا جس نے اسے اندر سے کچل کر رکھ دیا تھا۔ انیقہ کی صورت دیکھنے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔ اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ انیقہ کے روپ میں ایک ناگن اس کی خوشیوں کو ڈسنے کے لیے اس کے گھر میں آ گئی ہے۔

☆☆

نعمان جب شام کو گھر لوٹا تو ایک عجیب سا سناٹا پورے گھر میں پھیلا ہوا تھا۔ انیقہ نے حسب معمول ٹی وی لاؤنج میں مسکراتے ہوئے کسی شوخ سے جملے کے ساتھ اس کا استقبال نہیں کیا۔ اپنی بڑی بڑی آنکھوں میں چھپے خوب صورت جذبوں کو ایک ادا کے ساتھ عیاں نہیں کیا۔ پتا نہیں کیا نشہ تھا ان حسین آنکھوں میں کہ وہ خود بخود ان میں ڈوبنے لگتا تھا۔

نعمان کو کبھی کبھی خود پر حیرت ہوتی کہ جس لڑکی کو وہ ایک نگاہ بھر کر دیکھنے کا روادار نہیں ہوتا تھا، اسی لڑکی کو اب ہر پل اپنے دل کے قریب، اپنی نظروں کے سامنے رکھنا چاہتا تھا۔ وقت اور حالات نے جب ان دونوں کو نزدیک کیا تب نعمان نے جانا کہ سمیرا کی محبت تو شاید نئی نئی شادی کا ایک خمار تھی، روح کی گہرائیوں میں اتر کر محبت کیسے کی جاتی ہے۔ یہ حقیقت اسے انیقہ کے عشق نے بتائی تھی۔ اس کی زندگی کی اصل خوشی تو انیقہ کے وجود میں چھپی ہوئی تھی۔ اس کی دلچسپ باتیں، اس کی کھنکتی ہنسی، اس کی حسین آنکھوں کا فسوں، اس کی دل رُبا ادائیں، اسے

ایک ایسی دنیا میں لے جاتے تھے جہاں سے واپس لوٹنے کا اس کا دل ہی نہیں چاہتا۔ سمیرا سے زیادہ تو وہ اس کے دل میں جھانک کر اس کے موڈ کو اس کے مزاج کو سمجھنے لگی تھی۔

وہ انجانے میں اس کے وجود کا اتنا عادی ہوتا جا رہا تھا کہ اگر گھر میں کچھ دیر کو وہ نظر نہ آتی تو وہ بے قرار سا ہو جاتا۔

''سمیرا گھر میں انیقہ کے بغیر بڑا سناٹا سا محسوس ہونے لگتا ہے۔ آخر کون سی شاپنگ پر گئی ہے وہ جو لوٹنے کا نام ہی نہیں لے رہی؟'' وہ اکثر اس کے کہیں باہر جانے پر اسی طرح کے جملے بولا کرتا۔ یہ احساس کیے بغیر کہ سمیرا کے چہرے پر کتنی ناگواری سی بکھر گئی ہے۔ آنکھوں میں ملال کے رنگ اتر آئے ہیں، کبھی کبھی تو ایسے تنہائی کے لمحات میسر آتے تھے جب وہ دونوں تنہا بیٹھ کر چائے پیتے تھے لیکن نعمان کے ہر انداز سے بیزاری اور اکتاہٹ کو محسوس کرتے ہوئے سمیرا کا دل بجھ سا جاتا اور آج بھی کچھ ایسا ہی ہوا تھا۔ نعمان نے سمیرا کی متورم آنکھوں اور اترے ہوئے چہرے کو نوٹس میں لائے بغیر کمرے میں آتے ہی جب انیقہ کے بارے میں پوچھا تو جیسے وہ پھٹ ہی پڑی۔

''نعمان بس بہت ہو چکا۔ میں یہ سب برداشت کرتے کرتے تھک چکی ہوں۔ انیقہ گئی جہنم میں۔ پہلے آپ مجھ سے تو میرے آنسوؤں کی وجہ پوچھیے۔ میں ٹوٹ رہی ہوں نعمان۔ میں بکھر رہی ہوں، خدارا مجھے سمیٹ لیجیے۔'' اس کا قہر آلود انداز آخری جملے تک آ کر آنسوؤں میں ڈوب گیا۔ وہ روتے ہوئے بے اختیار نعمان کے سینے سے آ لگی جو ایک شاکڈ کی سی کیفیت میں کھڑا اسے حیرانی سے دیکھ رہا تھا۔ اس نے سمیرا کو اپنے بازوؤں میں سمیٹنے کی بجائے اسے آہستگی سے اپنے آپ سے الگ کیا۔

''کیا بات ہے سمیرا! سب خیریت تو ہے نا؟ کیا انیقہ سے کوئی جھگڑا ہو گیا ہے۔ کہاں ہے وہ؟'' اس وقت بھی وہ سمیرا کے آنسوؤں سے بے نیاز صرف انیقہ کے لیے فکر مند نظر آ رہا تھا۔

''انیقہ...... انیقہ...... انیقہ...... آپ صرف اسی نام کی گردان کیے جا رہے ہیں، میرے آنسو، میرا غم، میری تکلیف کچھ بھی نظر نہیں آ رہا آپ کو؟'' اس نے چیختے ہوئے بے اختیار اس کا گریبان تھام لیا۔ غصہ اب غم پر حاوی ہو رہا تھا۔

''تم اس وقت اپنے حواسوں میں نہیں ہو۔'' نعمان نے یہ کہتے ہوئے اسے ایک جھٹکے سے اپنے آپ سے الگ کیا اور تیزی سے کمرے سے باہر چلا گیا۔ وہ وہیں قالین پر بیٹھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اس وقت کوئی بھی، اس کا اپنا اس کے نزدیک نہیں تھا جس کی گود میں منہ چھپا کر وہ اپنا غم شیئر کر سکتی۔ نمرہ ہزاروں کوس دور تھی، چاہنے والے ساس سسر بھی پاس نہ تھے۔ یہاں تک کہ اس کی غم گسار بوا بھی کچھ دنوں کی چھٹیوں پر اپنے بیٹے کے پاس گئی ہوئی تھیں۔ اسے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ نعمان کی محبت نے اس کی زندگی میں جتنی رعنائیاں اور رنگ بھر دیے تھے اب اسی محبت نے زندگی کو ایک صحرا کی مانند کر دیا تھا۔

☆☆

اسے گنوا کے میں زندہ ہوں محسن
کہ جیسے تیز ہوا میں جلتا چراغ

اچانک ہی ایک خیال کے آتے ہی وہ تڑپ کر کھڑی ہو گئی۔ لرزتے ہوئے قدموں سے وہ انیقہ کے کمرے تک پہنچی۔ اس کا رواں رواں سراپا دعا تھا کہ نعمان وہاں موجود نہ ہو لیکن سامنے کا منظر تو اسے حواس سے بیگانہ کر گیا۔ نعمان کے بازوؤں کے

حصار میں انیقہ اس کے سینے میں منہ چھپائے زاروقطار رو رہی تھی۔ اس کی سیاہ زلفیں نعمان کے شانوں پر بکھری ہوئی تھیں اور وہ اس کے بالوں میں منہ چھپائے اسے تسلیاں دیے جا رہا تھا۔

"نعمان!" وہ اتنی ازور سے چیخی کہ انیقہ گھبرا کر نعمان سے علیحدہ ہوگئی۔ نعمان نے پلٹ کر اسے بڑی سرد نگاہوں سے دیکھا جن میں ندامت کا کوئی شائبہ نہیں تھا۔ وہ غصے کی شدت سے بے حال تیزی سے انیقہ کے قریب آئی۔ تڑاخ...... ایک زوردار تھپڑ انیقہ کے گال پر پڑا تھا۔

"تم اتنی نیچ اور ذلیل ثابت ہوگی میں نے کبھی سوچا بھی نہ تھا۔ تم جتنی کم صورت ہو، اس سے بھی زیادہ کم ذات ہو۔ ارے میں ایک ناگن کو اپنے گھر میں دودھ پلاتی رہی۔ نکل جاؤ، میرے گھر سے۔ آج تو میرے ڈیڈی ممی کی روح بھی تم سے نفرت کر رہی ہوگی۔" وہ اس کے بال پکڑ کر ایک دیوانگی کے عالم میں چیختے ہوئے کہہ رہی تھی لیکن انیقہ ہر احساس سے بے نیاز صرف نعمان کو دیکھے جا رہی تھی تب ہی نعمان جو ایک سکتے کی سی کیفیت میں کھڑا یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ چونک کر آگے بڑھا اور انیقہ کو کھینچ کر اپنے بازوؤں کی پناہ میں لے لیا۔

"خبردار سمیرا، جو تم نے اس کو ہاتھ بھی لگایا ورنہ مجھ سے بُرا کوئی نہیں ہوگا!" اس کی آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے۔ سمیرا شدید صدمے سے چور ایک لمحے کو تو اس کو دیکھتی رہ گئی اگر کوئی کند چھری سے اس کو ذبح کرتا تب بھی اس کو اتنی تکلیف نہ ہوتی جتنی اس وقت نعمان کی اس حرکت سے ہوئی تھی۔

"نعمان! تم تو میرے ہو، میرے پاس آؤ نا مجھے یوں بے آسرا نہ کرو۔ میری محبت کی ایسے توہین تو نہ کرو۔" وہ یہ سب کہنا چاہ رہی تھی لیکن اس کے صرف لب ہل رہے تھے۔ آواز نہ جانے کہاں جا کھوئی تھی۔ دوسرے ہی لمحے وہ لڑکھڑائی اور پھر قالین پر گر پڑی اور اس کا ذہن تاریکیوں میں ڈوبتا چلا گیا۔

☆☆

اک عمر کی رفاقت پل بھر میں ختم کر دی
اے دوست حرج کیا تھا کچھ دیر سوچنے میں

جب اسے ہوش آیا تو وہ اسپتال کے ایک کمرے میں تھی۔ اس کے بیڈ کے پاس اکرام صاحب اور ان کی بیگم کافی پریشان سے کھڑے تھے۔ اس کو آنکھیں کھولتے ہوئے دیکھ کر وہ دونوں بے قراری سے اس پر جھک گئے۔

"کیسی ہو میری بچی! کیا ہوگیا تھا تمہیں؟" مسز اکرام نے بھرائی ہوئی آواز میں اس سے پوچھا تو سمیرا کی آنکھوں سے آنسو ٹوٹ کر بہنے لگے۔ کچھ کہنے کو رہ ہی کیا گیا تھا اس کے پاس۔ کیا بتاتی اپنی ساس کو کہ جس بہن کو اس نے دنیا بھر کی خوشیاں دینے کے لیے اپنے آپ کو مٹا دیا۔ اسی نے صلے میں اس کی ساری خوشیاں اجاڑ دیں، اس کی محبت کا تاج اپنے سر پر پہن لیا۔

کیسے بتاتی انہیں کہ اس کا نعمان اس کی محبت، اس کا پیار، سب کچھ اس سے چھن گیا ہے...... وہ تہی دامن رہ گئی ہے۔

"نعمان کو بتا دو کہ سمیرا کو ہوش آگیا ہے۔ کافی پریشان ہے وہ۔" اکرام صاحب نے اپنی بیوی سے کہا تو سمیرا کے بجھے ہوئے دل میں آس کے ننھے ننھے سے دیپ جگمگا اٹھے۔

"شاید نعمان میری اس حالت پر پشیمان ہو رہا ہوگا...... اس نے تو ٹوٹ کر چاہا ہے مجھے، پھر بھلا وہ کیسے مجھ سے منہ موڑ سکتا ہے؟" آنسو اور شدت سے رخساروں پر بہنے لگے۔

"وہ ابھی ابھی گھر گیا ہے۔ انیقہ کا فون آیا تھا۔

بے چاری کی اپنی طبیعت بھی کافی خراب ہے۔ شاید بہن کی وجہ سے کچھ زیادہ ہی گھبرا گئی ہے۔'' مسز اکرام بہت آہستگی سے اکرام صاحب کو بتانے لگیں لیکن سمیرا کا تو رواں رواں سماعت بنا ہوا تھا۔ یہ جملہ ایک سیسے کی مانند اس کے کانوں میں اترا، دل ڈوب سا گیا۔

''ماما پلیز مجھے گھر جانا ہے۔ خدا کے لیے مجھے واپس لے چلیں۔'' اس نے بے تاب ہو کر ان کے ہاتھ تھام لیے تب ہی دو ڈاکٹر تیزی سے اس کے نزدیک آئے وہ پھر سے ہسٹریکل ہو رہی تھی۔ اسے فوری انجکشن لگا دیا گیا اور پھر آہستہ آہستہ اس کا ذہن دوبارہ غنودگی میں چلا گیا۔

☆☆

نہ جانے کون سی دیوار کھینچ دی کس نے رہا تو گھر میں ہی لیکن بچھڑ گیا وہ شخص

اسپتال میں نعمان اس کو دیکھنے آتا رہا تھا لیکن سمیرا کو اس کی آنکھوں میں نہ وہ پیار نظر آیا تھا اور نہ ہی وہ اپنا پن جس کو کھو دینے کا کرب ہی اس کی اس حالت کا موجب بنا تھا۔ اس کا اکھڑا اکھڑا سا رویہ سمیرا کے لیے مزید اذیت کا سبب بن رہا تھا۔ انیقہ تو ایک بار بھی اس کو دیکھنے نہیں آئی تھی۔ وہ تو شاید اس کی بنائی ہوئی جنت کی مکین بن بیٹھی تھی۔ یہ خیال سمیرا کو کسی پل چین نہیں لینے دیتا تھا اور اس کی طبیعت پھر سے بگڑنے لگتی تھی۔ تب ہی تو اس کو صحت یاب ہونے میں اتنا وقت لگا تھا۔ اکرام صاحب تو تیسرے دن اپنے کام کے سلسلے کی وجہ سے واپس لوٹ گئے تھے لیکن مسز اکرام جب بھی جانے کا سوچتیں سمیرا رو رو کر بے حال ہو جاتی۔

''ماما مجھے چھوڑ کر نہ جائیں۔ جب تک میں گھر واپس نہیں لوٹتی، پلیز آپ میرے گھر میں رہیے، اسے اجڑنے نہ دیجیے۔'' ہر بار وہ ہاتھ جوڑ جوڑ کر اسی قسم کے جملے بولتی۔ مسز اکرام اس کی اس کیفیت پر بہت پریشان ہو جاتیں۔ جہاندیدہ نظریں کچھ محسوس بھی کرنے لگی تھیں۔ اپنی چہیتی بہو کی بیماری کا سبب بھی کچھ کچھ سمجھ میں آنے لگا تھا۔ اب وہ اسپتال سے زیادہ گھر میں رہنے کو ترجیح دینے لگی تھیں۔ انیقہ کا اداس اور پریشان روپ بھی انہیں ایک ڈھونگ سے زیادہ کچھ نہیں لگ رہا تھا۔ نعمان کو انیقہ کے لیے پریشان ہوتا دیکھ کر وہ الجھ سی جاتیں۔ انیقہ کی نگاہوں کا مرکز تو جیسے صرف نعمان ہی تھا۔

اس دن وہ کسی کام سے ٹی وی لاؤنج میں آئیں تو انیقہ کسی سے فون پر بات کر رہی تھی۔

''نہیں راحیلہ، محبت ہر قانون اور قاعدے سے بالاتر ہوتی ہے بلکہ محبت تو نام ہی قواعد و ضوابط توڑنے کا ہے۔'' اس کے لہجے میں کیسا جنون تھا۔ مسز اکرام جیسے سُن سی ہو گئیں۔ تب ہی انیقہ کی نظر ان پر پڑی اور اس نے کچھ رسمی سی بات کر کے جلدی سے ریسیور کریڈل پر رکھ دیا۔ وہ بدستور چپ چاپ کھڑی اس کو گھورتی رہیں۔

''کیا بات ہے آنٹی! آپ ٹھیک تو ہیں نا؟'' وہ تشویش سے کہتے ہوئے ان کے نزدیک آ گئی۔

''میں تو ٹھیک ہوں لیکن تمہارا دماغ خراب ہو چکا ہے۔ تمہیں شرم نہیں آ رہی؟ اپنی اتنی چاہنے والی بہن کو زندہ درگور کر کے رکھ دیا ہے تم نے۔ وہ موت کی سرحد کو چھو کر لوٹی ہے لیکن تم کتنی بے رحم بن ہو کہ تمہیں اس پر ذرا بھی ترس نہیں آ رہا۔'' وہ غصے سے تھر تھر کانپ رہی تھیں۔ انیقہ سر جھکائے خاموش کھڑی رہی۔ ایک لفظ بھی اپنی صفائی میں کچھ نہیں کہا۔

''اور یہ تم کس محبت کی بات کر رہی تھیں۔ قواعد اور ضوابط توڑنے کی بھی ایک حد مقرر ہوتی ہے محبت میں۔ ارے کتنی ظالم اور بے رحم محبت ہے تمہاری جو

ایک معصوم اور مظلوم بہن کی زندگی، اس کا گھر اور خوشیوں کی بھینٹ لے کر پروان چڑھ رہی ہے۔" انہوں نے بے اختیار اسے جھنجھوڑ ڈالا۔ تب انیقہ نے آنسوؤں سے بوجھل آنکھیں اٹھا کر انہیں دیکھا۔

"آنٹی، میں نے نعمان کو دنیا کی ہر شے سے بڑھ کر چاہا ہے۔ ہر رشتے سے بڑھ کر وہ مجھے عزیز ہے۔ یہ سچ ہے کہ اس کی محبت نے مجھے بہت خود غرض، ظالم اور سفاک بنا دیا ہے۔ اسی لیے مجھے کسی پر رحم نہیں آرہا۔ میرے لیے سب رشتے ختم ہو چکے ہیں میری زندگی میں سوائے نعمان کے اب اور کوئی بھی نہیں۔" اس کے لہجے میں ایک عجیب سا جنون تھا، ایسی دیوانگی تھی کہ مسز اکرام دنگ رہ گئیں۔ زبان جیسے گنگ رہ گئی۔ وہ بڑے پُر اعتماد قدم اٹھاتی لاؤنج سے باہر نکل گئی۔ مسز اکرام کچھ دیر تو سر پکڑے صوفے پر بیٹھی رہیں۔

سمیرا کل اسپتال سے ڈسچارج ہو کر گھر واپس آرہی تھی اور انہیں اس کے آنے سے پہلے کوئی اہم قدم اٹھانا تھا۔ انہیں اپنی یہ بے حد پیاری اور معصوم سی بہو بے حد عزیز تھی۔ انہیں نعمان پر بھی جی بھر کر غصہ آرہا تھا، تب ہی نعمان کی کار کے ہارن پر وہ چونک گئیں۔ انہوں نے انیقہ کو تیزی سے مین دروازے کی جانب جاتے دیکھا تو وہیں سے تیز آواز میں اسے پکارا۔

"تم کو اسے ریسیو کرنے کی کوئی ضرورت نہیں انیقہ، چلو واپس اپنے کمرے میں جاؤ۔" ان کا لہجہ اتنا سخت تھا کہ وہ ٹھٹک کر رک گئی۔ وہ اٹھ کر اس کے نزدیک آگئیں لیکن وہ بدستور وہیں کھڑی رہی۔

"انیقہ تم نے سنا نہیں میں کہہ رہی ہوں کہ یہاں سے فوراً چلی جاؤ۔" انہوں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے گھسیٹنا چاہا لیکن وہ انیقہ کو ہلا بھی نہ سکیں۔ تب ہی نعمان دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا تو ماں قہر آلود چہرے کے ساتھ اسے انیقہ کے نزدیک کھڑی نظر آئیں۔ کتنی سخت گرفت تھی ان کی انیقہ کے ہاتھوں پر۔ وہ گھبرا کر ان لوگوں کے نزدیک چلا گیا۔

"نعمان، اب میں یہ تماشا اس گھر میں مزید نہیں دیکھ سکتی۔ ہم لوگ کل شام ہی واپس اسلام آباد جارہے ہیں سمجھے تم؟" وہ کھولتے ہوئے لہجے میں بولیں تو انیقہ نے بے اختیار ان کی گرفت سے اپنا ہاتھ چھڑا کر تڑپ کر نعمان کی جانب دیکھا جوان کے غصے سے ذرا بھی خائف نہیں نظر آرہا تھا۔

"میں کہیں نہیں جارہا ماما! پلیز آپ صرف اپنا اور سمیرا کا پروگرام بنالیں تو بہتر ہوگا۔" نعمان نے کافی سرد لہجے میں جواب دیا۔

"تمہارے نہ جانے کی وجہ یہی فتنہ ہے نا؟" انہوں نے انتہائی نفرت سے انیقہ کی طرف اشارہ کیا۔ "لیکن میں ایسا ہرگز نہیں ہونے دوں گی۔ میں ابھی نمرہ کو فون کرتی ہوں کہ تمہاری معصوم بہن تمہاری دوسری چڑیل بہن کے ہاتھوں تباہ ہو رہی ہے، مر رہی ہے، اسے آکر بچالو۔" وہ بے اختیار رونے لگیں۔

"ماما آپ صرف انیقہ کو کیوں کوس رہی ہیں، قصوروار تو میں بھی ہوں۔ اِن فیکٹ میں نہیں رہ سکتا انیقہ کے بغیر۔ سمجھ رہی ہیں نا آپ ماما کہ انیقہ اب میری زندگی بن چکی ہے۔ میں انیقہ کا ساتھ چاہتا ہوں۔ سمیرا اب میری زندگی میں کہیں بھی نہیں ہے۔" نعمان نے بے حد جذباتی ہو کر انیقہ کا ہاتھ مضبوطی سے تھام لیا۔ مسز اکرام دل تھام کر زمین پر بیٹھتی چلی گئیں۔ انہیں اپنے بیٹے سے اتنی دیدہ دلیری کی امید نہیں تھی۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھیں کہ وہ بھی کوئی ایسا وقت بھی دیکھیں گی لیکن وقت تو ہے ہی بڑی ظالم چیز، اپنے ایسے ایسے روپ دکھاتا ہے کہ مرتا ہوا انسان جی اٹھتا ہے اور کبھی زندگی کو جیتا ہوا

انسان بے موت مر جاتا ہے۔ اس وقت مسز اکرام کو بھی یہی محسوس ہو رہا تھا۔ وہ نہیں جانتی تھیں کہ نعمان کے دل میں پنپنے والا انیقہ کی چاہت کا پودا سمیرا کے اسپتال میں رہنے کے دوران ایک تناور درخت بن چکا ہے۔

نعمان کو یوں محسوس ہونے لگا تھا کہ وہ اب انیقہ کے بغیر شاید سانس بھی نہیں لے سکے گا اور اس وقت اس کے یہی احساسات اور جذبات زبان بن کر ماں کا لحاظ کرنا بھی بھول گئے تھے۔

''نعمان تم ابھی اسی وقت میری نظروں سے دور ہو جاؤ۔ تمہارے پاپا اور تمہارا بھائی بھی تمہارا یہ روپ دیکھنے کے بعد تمہاری شکل بھی دیکھنا گوارا نہیں کریں گے۔'' وہ دونوں ہاتھوں سے سر کو تھامتے ہوئے بہت ضبط کے ساتھ آہستہ آہستہ بول رہی تھیں۔ تب انیقہ نے بے اختیار ان کے قریب بیٹھتے ہوئے ان کے پیر تھام لیے۔

''آنٹی، نعمان کو اللہ نے میرے لیے بنایا تھا۔ آپ سب نے مل کر اسے سمیرا کی جھولی میں ڈال دیا۔ آنٹی مجھے نعمان بخش دیں، وہ میرا ہے...... پلیز آنٹی مجھ پر رحم کریں، سمیرا کے پاس کس چیز کی کمی ہے، اسے نعمان سے زیادہ اچھا جیون ساتھی مل سکتا ہے لیکن ماما......'' انیقہ کی بات مسز اکرام کے بھرپور تھپڑ نے ادھوری رہنے دی۔ نعمان نے تڑپ کر انیقہ کو ان کے پاس سے ہٹانے کی کوشش کی لیکن وہ بدستور مضبوطی سے ان کے پیر پکڑے ان سے نعمان کی محبت کی بھیک مانگتی رہی۔ مسز اکرام اب اسے دیوانوں کی طرح مار رہی تھیں۔ کوسنے اور بددعائیں دے رہی تھیں اور وہ ان کی مار ایسے کھا رہی تھی گویا وہ اس پر پھول برسا رہی ہوں۔

''انیقہ ہوش میں آؤ!'' نعمان نے بُری طرح سے اسے اپنی طرف گھسیٹا اور اسے اپنی بانہوں کے حصار میں لے کر ماں کی دسترس سے دور کر دیا۔

''ماما میں جلدی ہی سمیرا کو طلاق بھجوا دوں گا۔ اب ہم ایک منٹ بھی اس گھر میں نہیں رہیں گے۔'' نعمان کی آنکھیں ضبط کرنے کی کوشش میں سرخ ہو رہی تھیں۔

''جاؤ نعمان ہم نے تمہیں اپنی محبت، اپنی زندگی، اپنی جائیداد، اپنے بزنس سب سے عاق کیا۔'' مسز اکرام نے چیختے ہوئے کہا۔

''مجھے نہ کسی کی محبتوں کی ضرورت ہے اور نہ کسی جائیداد کی۔ میں انیقہ کی محبت پر ایسی ہزاروں محبتیں قربان کر سکتا ہوں۔'' نعمان کے جواب نے جیسے مسز اکرام کو بالکل ہی توڑ دیا۔ انہیں ایسا لگا جیسے ان کے جسم میں جان ہی نہ رہی ہو۔ انہوں نے دور جاتے ہوئے نعمان اور انیقہ کو دیکھا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔

☆☆

اسے گنوا کے میں زندہ ہوں محسن
کہ جیسے تیز ہوا میں جلتا چراغ

کمرے میں بچھی سفید چاندنی پر خواتین بیٹھی ہوئیں سپارے پڑھنے میں مصروف تھیں۔ اگربتی کی مخصوص خوشبو پورے کمرے میں پھیلی ہوئی تھی۔ فضا میں عجیب سی سوگواری رچی ہوئی تھی۔ نمرہ کی آنکھیں سپارہ پڑھتے ہوئے مسلسل برس رہی تھیں۔ دل کو جیسے کوئی آری سے کاٹ رہا تھا۔ اس نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ اس کے جانے کے بعد یہاں اتنے بڑے بڑے حادثے گزر جائیں گے۔ وہ کل ہی امریکا سے یہاں پہنچی تھی اور ابھی تک اس کا دل کسی صورت قابو میں نہیں آ رہا تھا۔ سپارہ ختم کر کے اس نے بھیگی آنکھوں کے ساتھ اس کو بند کیا اور دیوار سے ٹیک لگا کر آنکھیں بند کر لیں تب یہ مسز اکرام اس کے نزدیک آ کر بیٹھ گئیں۔

''نمرہ بیٹا اپنے آپ کو سنبھالو۔ اس وقت اگر تم اپنے آپ کو مضبوط نہیں رکھو گی تو پھر سمیرا کو کون سنبھالے گا۔'' انہوں نے اس کا سر اپنے سینے سے لگاتے ہوئے کہا تو وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ مسز اکرام کی متورم آنکھوں سے بھی آنسو بہنا شروع ہو گئے تھے۔ نمرہ کو دلاسا دیتے ہوئے وہ خود اتنی شدت سے رونے لگیں کہ ان کو سنبھالنا مشکل ہو گیا۔

تین دن پہلے اخبار میں ایک چھوٹی سی خبر چھپی تھی کہ ''اپنی بیمار بیوی کو اسپتال دیکھنے جانے والا شخص اپنی سالی سمیت کار کے حادثے میں ہلاک۔'' اس خبر کو ہزاروں لوگوں نے پڑھا ہو گا، افسوس بھی کیا ہو گا لیکن وہ چھوٹی سی خبر اپنے اندر کتنے اندوہ ناک حقائق چھپائے ہوئے تھی یہ کسی کو بھی نہ پتا چلا تھا۔ حتیٰ کہ اکرام صاحب کو بھی نہیں، ارسلان کو بھی نہیں۔ مسز اکرام نے اپنے بیٹے کا بھرم رکھا تھا۔ اس کی موت کو تماشا نہیں بننے دیا تھا۔ اس کی عزت کو سب کے سامنے قائم رکھا تھا۔ وہ تو ان کی ممتا کو، ان کی بے لوث محبت کو، بڑی بے دردی سے ٹھکرا کر اپنے پیروں تلے روند کر انیقہ کو لے کر ان کی دنیا سے دور اپنی نئی دنیا بسانے جا رہا تھا لیکن موت نے اپنے پر پھیلا کر اسے مزید زیادتیاں کرنے سے روک دیا۔ مسز اکرام نے اصل حقیقت صرف نمرہ کو بتائی تھی اور اس سے عہد لیا تھا کہ وہ اپنی بہن اور ان کے بیٹے کی عزت زمانے کی نگاہوں میں کبھی دھندلی نہیں ہونے دے گی۔ پورا خاندان اس غم سے نڈھال تھا لیکن مسز اکرام تو دوہرا غم سہہ رہی تھیں۔ ایک جوان بیٹے کی موت کا غم اور دوسرا وہ ستم، وہ زخم جو وہ جاتے جاتے انہیں دے گیا تھا۔ سمیرا کا حال کسی سے دیکھا نہیں جا رہا تھا۔ وہ اس بے قراری سے روتی کہ کلیجا شق ہو جاتا۔ اسے سکون آور انجکشن کے ذریعے سلایا جا رہا تھا لیکن کبھی کبھی وہ انجکشن بھی اس پر اثر نہیں کرتے تھے۔ اس وقت بھی سب عورتوں کے جانے کے بعد وہ نمرہ کے زانو پر سر رکھے خاموش لیٹی نہ جانے کن سوچوں میں گم تھی جبکہ نمرہ دھیرے دھیرے اس کے بالوں میں ہاتھ پھیر رہی تھی۔ تب سمیرا نے اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔

''نمرہ میں نے انیقہ کو بہن کی طرح نہیں بلکہ ایک بیٹی کی طرح چاہا تھا ہے نا......؟''

''ہاں......!'' نمرہ کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

''اور میں نے نعمان کے نام اپنی زندگی کر دی تھی۔ نمرہ میں نے اسے اتنا چاہا تھا کہ پوری دنیا کی محبتیں ایک طرف ہو جاتیں پھر بھی میری محبت کا مقابلہ نہ کر سکتیں۔'' سمیرا کی آواز صدمے سے بوجھل ہو رہی تھی۔

''میں جانتی ہوں سمیرا، میری معصوم بہن۔'' نمرہ نے روتے ہوئے اس کے ماتھے کو چوم لیا۔

''لیکن تم یہ نہیں جانتی ہو نمرہ کہ میں کس لیے اتنا رو رہی ہوں۔'' سمیرا نے بے حد عجیب لہجے میں کہا تو نمرہ نے چونک کر اسے دیکھا۔ ''میں اس لیے نہیں رو رہی کہ وہ لوگ میری آہ لے کر اس دنیا سے گئے ہیں بلکہ......'' وہ ایک لمحے کو چپ ہوئی۔ نمرہ بالکل خاموشی سے اسے دیکھتی رہی۔ ''میں اس لیے رو رہی ہوں نمرہ کہ انیقہ نے زندگی میں بھی نعمان کو مجھ سے چھین لیا اور پھر اپنے ساتھ بھی اسے لے کر اس دنیا سے گئی۔ نعمان نے میرے ساتھ زندہ رہنے کے بجائے اس کے ساتھ مرجانے کو ترجیح دی۔ وہ دونوں ہی صورتوں میں مجھ سے جیت گئی اور میں ہار گئی۔ نمرہ میں اس سے ہار گئی......!'' وہ چیخ چیخ کر رو رہی تھی اور نمرہ کے پاس کچھ کہنے کو الفاظ ہی نہیں تھے۔

☆☆☆

مکمل ناول

صدف آصف
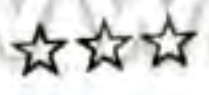
گیٹ وے آف لو

''آفرین ہے تم پر! میں نے تمہاری جیسی میکہ پرست عورت نہیں دیکھی، تم ابھی بھی ان ہی لوگوں کے بارے میں سوچ رہی ہو۔ جنہوں نے ہمیشہ تم سے فائدہ اٹھایا، کبھی تمہارے فائدے کا نہیں سوچا۔ اگر رعنا! مائرہ کی خالہ بن کر سوچتی تو......

محبتوں سے گندھے اُن لوگوں کی کتھا، جو صرف محبت کرنا جانتے ہیں

''یہ دیکھو! یہ حال ہے آج کل کی لڑکیوں کا یہاں بوڑھی دادی بھوک سے بلک رہی ہے اور ان کا آرام ہی ختم ہونے میں نہیں آرہا۔'' زبیدہ بیگم کمر پر ہاتھ رکھ کر تیز تیز بولتی ہوئی، اپنے کمرے سے نکلیں۔ دادی کی پاٹ دار آواز نے ماہا کی نیند بھگادی۔ وہ جوخوابوں کی ڈور میں الجھی ہوئی تھی جھٹکے سے توڑ بیٹھی۔

''ماہا اری او یوسی آج کیا ناشتا نہیں ملے گا۔'' باہر سے زبیدہ بیگم کی گولہ باری جاری تھی۔

ماہا نے گھبرا کر بستر سے چھلانگ لگائی جلدی جلدی منہ دھو کر برش کیا اور کچن کی طرف دوڑ لگادی۔ جانتی تھی کہ اگر ناشتے میں مزید دیر ہوئی تو دادی کا غصہ سوا نیزے پر پہنچ جائے گا۔

''ارے، سردرد سے پھٹا جا رہا ہے، مگر کسی کو خیال بھی آیا کہ مجھ بڑھیا کو بھی کہ ایک کپ چائے پلادے۔'' انہوں نے سر پر ہاتھ رکھ کر دہائی دی۔

''دادی لا رہی ہوں۔ رات طبیعت ٹھیک نہیں تھی، اس لیے آنکھ وقت پر نہیں کھلی''۔ ماہا نے جلدی سے گلاس میں پانی بھر کر انہیں پیش کیا۔

جانتی تھی کہ وہ اپنی صحت کا کتنا دھیان رکھتی ہیں۔ جب سے انہیں پتا چلا تھا، کہ نہار منہ پانی پینا کتنا فائدہ مند ہے، وہ ناشتے سے قبل ایک گلاس پانی ضرور پیتی تھیں۔ یہ ذمہ داری بھی انہوں نے ماہی کے سر ڈال دی تھی، کہ وہ روز صبح سب سے پہلے انہیں پانی کا ایک گلاس پلائے، جس دن وہ ان کے حکم پر عمل کرنا بھول جاتی، بس اس کی شامت آجاتی۔

''ہاں بھئی...... آج کل جوانوں کا تو ماٹھا ڈھیلا ہے، ایک ہم تھے، نور کے تڑکے اٹھتے اور اس وقت تک تو منوں آٹے کے پراٹھے بنا چکے ہوتے، مجال ہے، جو کبھی طبیعت خرابی کا بہانہ کیا ہو۔'' دادی گرم ہوتے ہوئے وہ باتیں بتارہی تھیں، جو شاید کبھی وقوع پذیر بھی نہ ہوئی ہوں، ان کی گولہ باری صرف ماہا کے ہاتھ پاؤں پھلا رہی تھی، ورنہ سارا گھر مزے سے اپنے روزمرہ کے معمولات میں مصروف تھا۔ سب

روز روز کے ایسے ڈراموں کے عادی ہو چکے تھے۔

''دادی بس دو منٹ، آ رہی ہوں''، ماہا نے کچن سے ہی آواز لگائی۔

''یہاں سب کو پتا بھی ہے کہ ہم ایک ناشتا ہی وقت پر کرتے ہیں، پھر بھلے پورے دن ہمارے منہ میں کھیل اڑ کے نہ جائے، خاموشی سے پڑے رہتے ہیں۔ مگر ہماری پروا کسے ہے؟ اب کوئی اتنا بھی نہ کر سکے، اور چاہیں کہ ہماری زبان بند رہے...... نہ بھائی ممکن نہیں۔'' وہ زیادہ بولنے کی عادی تھیں، ہر بات کی تفصیلات میں چلی جاتیں، اور مبالغہ آرائی کی حد کر دیتی تھیں، ورنہ پورے گھر میں وہ جتنا اپنا کھانے پینے اور کپڑے لتے کا خیال رکھتی تھیں، شاید ہی کوئی دوسرا رکھتا ہو، انہیں پھر بھی یہ ہی شکوہ رہتا تھا کہ ہم کچھ کھاتے ہی نہیں، اچھا پہنتے نہیں ہیں، کسی کو ہمارا خیال ہی نہیں ہے۔'' ہر ایک ان کی عادتوں کو اچھی طرح سے جانتا تھا مگر کچھ عمر اور رشتہ کا لحاظ اور کچھ ان کی خفگی کا ڈر تھا۔ اسی لیے سب کان دبا کر سنتے رہتے تھے سوائے ان کی بڑی بہو ساجدہ کہ وہ ایسی تھی جو ان کی ہر کمزوری سے واقف تھی۔ اسی کا بھرپور فائدہ اٹھاتے ہوئے انہیں زچ کرنے پر تلی رہتی۔

''ہم کل سے خود ہی صبح اٹھ کر اپنا ناشتا بنا لیں گے۔'' ماہی نے جلدی سے ایک کپ گرم چائے کا بنا کر ان کے قریب رکھا تو انہوں نے منہ پھلا کر کہا۔ مگر ماہی کے پاس اتنا ٹائم بھی نہیں تھا کہ وہ اپنی صفائی پیش کر پاتی۔ اس نے ابھی سب کا من پسند ناشتا بھی بنانا تھا۔ اس لیے واپس کچن کی طرف بھاگی۔ اس کے دیر سے اٹھنے کی وجہ سے سارا روٹین ڈسٹرب ہو گیا تھا۔ اب اسے ہاتھ تیز تیز چلانے تھے، تاکہ سب کو وقت پر ناشتا مل سکے۔ جانے کیوں اسے آج کل پھر وہ خواب تنگ کر رہا تھا، پراٹھا بیلتے بیلتے وہ دوبارہ سوچنے لگی۔

''یہ کیسا خواب ہے جو بچپن سے مجھے ستا رہا ہے؟'' ماہا نہ چاہتے ہوئے وہ منظر یاد کرنے لگی جو اتنے تواتر سے اس نے بچپن سے دیکھا تھا کہ اب اسے ازبر ہو گیا تھا۔

مظلوم عورت روتے ہوئے ان دونوں خواتین کے ہاتھ پاؤں جوڑ رہی تھی، جو اسے گھر سے نکالنے پر تلی ہوئی تھیں۔ چھوٹی سی بچی کھڑکی سے چھپ کر یہ منظر دیکھتے ہوئے روئے جا رہی تھی۔ اسے بہت ڈر لگ رہا تھا۔

''ارے وہ میرا بیٹا ہے، تم اس کو مجھ سے الگ نہیں کر سکتی ہو۔ بڑا ہو کر تمہاری محبت کا دم بھرنے لگا ہے۔'' کچھ دھیمی آوازیں، اس کے کانوں میں پڑ رہی تھیں۔ دو سائے اس مظلوم عورت کی پرچھائیں پر حاوی ہو رہے تھے۔

ایک سائے نے اس روتی دھوتی پرچھائیں کو دھکا دیا، وہ گرتے گرتے بچی۔ رات کا ایسا کالا اندھیرا چھایا تھا، کہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ مدھم روشنی میں کچھ سمجھ میں آ رہا تھا کچھ نہیں۔ بچی حیران و پریشان چھپی کھڑی، وہ منظر چھپ کر دیکھے جا رہی تھی، خوف کے مارے منہ سے آواز نہیں نکل رہی تھی۔

''چل جادوگرنی اب نکل اس گھر سے تیرا بہت تماشا دیکھ لیا۔'' ایک کرخت آواز کانوں میں گونجی، کچھ جانی کچھ انجانی سی۔

روتی ہوئی پرچھائیں کو دروازے سے دھکیل کر باہر نکال دیا گیا۔

''تمہیں اللہ کا واسطہ، میں اپنا گھر چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤں گی۔ میرے شوہر سے میری بات کرا دو، ارے اس کے آنے کا تو انتظار کر لو......'' بین ڈالتی شور مچاتی آوازیں، بچی کے ارد گرد چکرانے لگیں۔

''یہ میرے شوہر کا گھر ہے۔ بڑی آئی اپنا گھر

کہنے والی ہونہہ! اب جا یہاں سے ہماری زندگی عذاب بنادی ہے۔'' دو سایوں نے روتی ہوئی پرچھائیں کو باہر نکال کر فاتحانہ انداز میں کہا۔

بچی نے ہاتھ پھیلا کر اب ایک زوردار چیخ مارنی چاہی، کہ کسی نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

''یا اللہ یہ خواب مجھے اتنا کیوں پریشان کرتا ہے۔ جانے کیوں یہ منظر جانے پہچانے سے لگتے ہیں۔ایسا لگتا ہے اس مظلوم عورت سے میرا دل کا رشتہ ہو۔'' ماہا یہ خواب دیکھ کر ہمیشہ چونک کر اٹھ بیٹھتی۔

☆......☆......☆

کچن میں جاتے ہی ، ماہا نے جلدی جلدی سارے چولہے جلا کر ایک پر توا رکھا تا کہ پراٹھے بنا سکے، ایک پر فرائنگ پین میں رات کا بچا قیمہ گرم ہونے کے لیے رکھا، تیسرے پر چائے رکھ دی۔

''اماں یہ انڈے والی پیاز کاٹ دیں پلیز۔'' بوا اماں جو بڑھاپے کی وجہ سے صرف کاٹنے پیٹنے یا اوپر کا کام کر لیتی تھیں، انہیں آملیٹ کے لیے پیاز کاٹنے کو دی۔ وہ صبح بس منہ دھو کر کچن میں آ گئی تھی۔ جلدی میں بال بنانے کا بھی ٹائم نہیں ملا تھا، اسی لیے اب اس نے اپنے لمبے ریشمیں بالوں کو سمیٹ کر کیچر لگایا اور ہاتھ دھو کر روزانہ کی مشقت میں جت گئی۔

یہ نہیں تھا کہ اس گھر میں اور خواتین موجود نہیں تھیں، اور یہ بھی نہیں تھا کہ سب ماہا سے زور زبردستی کام کرواتے تھے مگر تائی اماں کی بدسلیقگی کی وجہ سے ہر کام بے ڈھنگے طریقے سے ہوتا تھا۔ ہوش سنبھالتے ہی ماہا کی نفیس طبیعت پر یہ بار گراں گزرتا، اس لیے اس نے آہستہ آہستہ کھانا پکانے کی ذمہ داری اپنے کاندھوں پر اٹھالی۔ بوا اماں مقدور بھر مدد کر دیتی تھیں، اب تو سارا گھر ماہا کے ہاتھوں کے ذائقے کا ایسا عادی ہو گیا کہ کسی اور کے ہاتھ کا پکا پسند نہ آتا، پھر ایک وجہ یہ بھی تھی کہ خواتین ایک دوسرے کی حرص میں کام کو ہاتھ نہ لگاتی تھیں۔

'سارہ، مائرہ آپی کے کتنے مزے ہیں، کچھ تو تائی اماں ان سے کام نہیں کرواتیں، کچھ یہ خود پھوپو کی حرص میں کام نہیں کرتیں کہ وہ بھی تو اس گھر کے کام کو ہاتھ نہیں لگاتی ہیں۔ایک ہی گھر میں رہ کر ہر بات پر مقابلہ کرنا کتنا غلط ہے۔'' ٹی وی کے آگے بیٹھ کر مارننگ شو دیکھنے والی تایازاد بہنوں کو دکھ سے دیکھ کر ماہا نے خود کلامی کی۔ چائے ابلنے لگی چھن چھن کی آواز اسے ہوش کی دنیا میں واپس لے آئی۔

''ماہی بیٹا یہ لو پورج کا پیکٹ ہے، رات سے میری طبیعت کچھ بھاری ہو رہی تھی ، اس لیے میں بس یہ ہی کھاؤں گا۔ اسے دودھ میں ڈال کر پانچ منٹ پکاؤ ، فوراً تیار ہو جائے گا'' ماموں نے اسے شاپنگ بیگ پکڑایا تو اس کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ تھیلی میں جھانک کر دیکھا تو اس میں انسٹنٹ پورج کا پیکٹ تھا۔

'چھوٹے چاچو کتنے اچھے ہیں۔ میری ہر چھوٹی بڑی بات کا خیال رکھتے ہیں۔' اس نے محبت سے ماموں کو دیکھا جو کالی پینٹ ، آسمانی شرٹ پہنے آفس جانے کے لیے تیار کھڑا بڑا ہینڈسم لگ رہا تھا۔

''ماہی جو کا دلیہ بھگو دو، صبح دودھ میں پکا کر ماموں کو بنا کر دینا، اس کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔'' رات ہی دادی نے حکم صادر کیا تھا۔ وہ کاموں کی زیادتی کی وجہ سے دلیہ بھگونا بالکل بھول گئی تھی۔ اب یہ کام کرنے بیٹھتی تو بہت دیر لگ جاتی۔ 'چاچو کو میری ہر مشکل کی خبر ہو جاتی ہے، اسی لیے بازار سے بنا بنایا دلیہ لے آئے۔ وہ اس گھر میں میری ڈھال ہیں، ورنہ پاپا تو لگتا ہے، اب مجھے بھولتے جا رہے ہیں، ہاں جب ہی تو کبھی پاکستان نہیں آتے۔ ویسے بھی اب ان کی دبئی میں الگ دنیا ہے۔' اس نے نم ہوتی آنکھوں کو پونچھا اور پورج کا پیکٹ کھولنے لگی، وہ

ویسے بھی بہت حساس تھی۔ ہر چھوٹی سی بات پر اس کے نین کٹورے بھر آتے تھے۔

مامون جب بھی سب کے سامنے ماہا کی حمایت کرتا، ساجدہ جلبلا کر رہ جاتیں مگر دادی ان کو خاموش کرا دیتی تھیں۔ وہ ایک بیٹا کھونے کے بعد دوسرے بیٹے کو ہاتھ سے جانے کی ہمت نہ رکھتی تھیں، اس لیے دل میں بیٹے سے بعض باتوں پر اختلاف رکھنے کے باوجود خاموشی اختیار کر لیتیں۔ وہ بھی ماں کے دل کا حال جان کر شیر ہو گیا تھا، اسی لیے ان کی کمزوریوں سے فائدہ اٹھاتا تھا۔ خصوصاً ماہا کے سلسلے میں کسی کی ایک نہ چلنے دیتا۔ مامون کی حمایت پر چڑ کر ساجدہ ماہا کی دشمن بنی رہتی۔ اور ان کا چھوٹا بیٹا عثمان ماہا سے دوستی کرنے کے لیے بے قرار رہتا، وہ ماہا کے معاملے میں گھر والوں کی زیادتیوں سے آگاہ تھا، اسے ہر دکھ سے آزاد دیکھنے کا خواہش مند بھی تھا، مگر عملی طور پر اس کے لیے لڑنے کا وقت ابھی آیا نہ تھا۔

☆......☆......☆

''اسلام علیکم دادی اماں'' عثمان نے انسٹیٹیوٹ جانے سے قبل حاضری دی۔

''کہاں جا رہے ہو تم صبح صبح؟'' انہوں نے تفتیشی انداز میں پوچھا۔

''کہاں جاتا ہوں میں اس وقت؟'' وہ بھی ساجدہ کی اولاد تھا، بے پروائی سے ان کے کمرے میں لگے، نئے آئینے کے سامنے بال بناتے ہوئے سوال پر سوال کیا تو وہ گڑبڑا گئیں۔ لگیں عثمان کا منہ تکنے، یہ ساجدہ کی اولاد تھی۔ اپنا حساب وقت پر بے باق کرنے والی ان کے بڑے بیٹے کی بیوی اور ان کی عزیز بھتیجی، کہتے ہیں پھوپی، بھتیجی ایک ذات مگر ساجدہ تو ان سے بھی دو ہاتھ آگے چلی گئی تھی۔

''او اچھا پڑھانے جا رہے ہو۔ سیدھی طرح جواب نہیں دے سکتے۔'' بے عزتی کا احساس ہوا تو انہوں نے عثمان کو ایک ہاتھ جڑا، ابھی اچھی جاب نہ ملنے کی وجہ سے وہ ایک انسٹیٹیوٹ میں کمپیوٹر ٹیچر کے طور پر کام کر رہا تھا،

''اچھا...... ایسا کرنا واپسی میں انار لیتے آنا، ویسے تو میں کچھ کھاتی نہیں ہوں، مگر اس دن ڈاکٹر ٹی وی پر بتا رہا تھا کہ انار کھانے سے خون بنتا ہے۔ آج کل پتا نہیں کیوں اتنی کمزوری محسوس ہو رہی ہے۔ لگتا ہے میرا بھی خون نہیں بن رہا۔'' انہوں نے کمزور آواز بنا کے کہا تو عثمان نے انہیں مسکرا کر ترچھی نگاہوں سے گھورا، وہ گڑبڑا گئیں۔

''یاد رہا تو لے آؤں گا۔'' عثمان نے گاڑی کی چابی اٹھا کر باہر نکلتے ہوئے کہا، اس نے ایک بہت اچھی جاب کے لیے اپلائی کیا ہوا تھا۔ وہ سافٹ ویئر انجینئر تھا، اسے امید تھی کہ جلد ہی اسے اس کمپنی میں رکھ لیا جائے گا۔

''اچھا اس کمبخت ماہی کو بھیجنا، کمرہ صاف کروانا تھا، دیر سے سو کر اٹھے گی، تو سارے کام لیٹ ہی ہوں گے'' انہوں نے اپنے کھچڑی بالوں کو کنگھی کرتے ہوئے پیچھے سے آواز لگائی۔ ماہا کے نام پر وہ پلٹا۔

''ویسے دادی کام کے حوالے سے آپ کے بنائے گئے سارے اصول صرف ماہا پر ہی کیوں لاگو ہوتے ہیں؟ سارہ، ماہرہ باجی یا پھوپو پر بھی ان کا اطلاق ہونا چاہیے نا۔'' عثمان کے مذاق اڑانے والے انداز پر وہ چڑ سی گئیں۔

''ہاں بھئی اپنی بہنوں کا تو تم نے ویسے ہی نام لے لیا، ورنہ اصل میں میری غریب بیٹی کا آرام سب کو ناگوار گزرتا ہے۔ ارے وہ اپنے باپ کے گھر میں رہتی ہے۔ کسی کو حق حاصل نہیں کہ اس پر بات بنا سکے، میں دیکھ رہی ہوں کہ جب سے وہ بیچاری میکے میں آ کر پڑی ہے سب اس کے ہر ایک کام پر نظر رکھتے ہیں۔'' بیٹی کے نام پر زبیدہ بیگم آپے سے باہر

ہوگئیں۔ مبالغہ آرائی کی حد کرتے ہوئے زور شور سے جو شروع ہوئیں، تو عثمان کے چھکے چھڑا دیے۔ وہ تو سچ بول کے پچھتایا تھا، اس نے انگلیاں ڈال کر کان بند کر لیے۔

''میں سب سمجھتی ہوں۔ تمہیں وہ گھنی ہی یہ سبق پڑھاتی ہے۔ پوری کی پوری اپنی ماں پر گئی ہے۔ وہ بھی معصوم بن کر لوگوں کی حمایت حاصل کرتی تھی۔''

ساجدہ بھی کمرے سے نکل کر میدان میں کود پڑیں ساس کے ساتھ آواز سے آواز ملا کر فضیحتہ شروع کر دیا۔

زبیدہ بیگم ساجدہ کی کمک سے خوش ہوگئیں۔ ویسے بھی بیٹی کی حیثیت میکے میں مضبوط کرنے کے لیے انہیں دس پندرہ دن میں یہ ہنگامہ کھڑا کرنا ہوتا تھا۔ آج عثمان نے موقع دے دیا تھا۔ ایسے ہنگاموں کے بعد پورا گھر مجرم بنا ان کی بیٹی کے آگے پیچھے پھرنے لگتا تھا۔

''معاف کر دیں دادی مجھ سے کسی نے کچھ نہیں کہا، آپ اور امی ماہا کے بارے میں ہمیشہ غلط ہی سوچتی ہیں'' وہ افسردگی سے سر ہلاتا ہوا گھر سے باہر نکل گیا۔ اس جھگڑے میں ماہا کا نام بلاوجہ آنے پر اسے بہت دکھ ہوا۔ ماہا اس کی بچپن کی منگ تھی، مگر ان دونوں کے درمیان رسمی سی بات چیت بھی نہیں تھی۔ ساجدہ بیگم عثمان پر عقاب کی طرح نظر رکھتی تھیں کہ وہ کہیں ماہا سے حد سے زیادہ فری نہ ہو جائے۔ ماہا ان کے مشکوک رویے سے چڑ جاتی اور عثمان سے دور ہی رہنا پسند کرتی۔ دادا ابا نے دونوں کی شادی ماہا کی پیدائش پر طے کر دی تھی۔ عثمان اس سے دو سال بڑا تھا۔ مگر عثمان کو لگتا تھا کہ اب سب یہ بات بھول چکے ہیں شاید ماہا بھی۔ مگر وہ نہیں بھولا تھا، اسے لگتا تھا کہ ماہا اس کے روم روم میں سمائی ہوئی ہے۔ اور اس کے بغیر عثمان کی زندگی حسرت ناتمام بن کے رہ جائے گی۔ مگر وہ ابھی مجبور تھا۔ اس کی ماں بہنیں ماہا کا نام سننے کی روادار نہ تھیں۔ اسی لیے وہ اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کا انتظار کر رہا تھا تاکہ بہ بانگ دہل ماہا کے سلسلے میں گھر میں بات اٹھا سکے۔

دادی اور تائی کی آواز ماہا کے کانوں تک پہنچ رہی تھی۔ باہر نکلتے ہوئے اس نے کچن میں جا کر پانی پینے کے بہانے ایک نظر ماہا پر ڈالی، اس کی سرخ ناک اور گلابی آنکھیں اس بات کی غماز تھیں کہ ساری باتیں، اس کے کانوں سے ہوتی ہوئی دل پر جا لگی ہیں۔

☆......☆......☆

اوپر والے پورشن میں ماں کی باتوں سے بے نیاز مہوش ایک دن پہلے بوتیک سے لایا ہوا بیش قیمت جوڑا زیب تن کیے، گیلے بالوں کو ڈرائر سے سکھا رہی تھی۔ آفس جانے سے قبل وہ پوری طرح نک سک سے تیار ہوتی تھی۔ کم عمر نظر آنے کی خواہش کے تحت اس نے ایک ہفتہ قبل ہی ایک بڑے اور مہنگے پارلر سے بالوں کی کٹنگ کروائی تھی۔ تیار ہوتے ہوئے آئینے میں جو اس کی نظر پڑی تو وہ تھم سی گئی۔ برش ہاتھوں میں ہی رہ گیا، کچھ تو چہرے پر بڑھتی عمر کے اثرات ظاہر ہونے لگے تھے، اس پر جسم اتنا پھیل چکا تھا کہ اچھے سے اچھا لباس جچتا ہی نہیں تھا۔ مہوش کو اپنے وجود سے وحشت ہونے لگی، مڑ کے بیڈ پر سوئے ہوئے شوہر کو دیکھا، کم عمر، فریش اور تر و تازہ چہرہ، ورزشی جسم، والا، عزیر سوتے ہوئے بہت معصوم لگ رہا تھا۔

''کیا یہ ہمیشہ میرا بن کر رہ سکے گا؟ مجھے چھوڑ کر اپنے ماں باپ کے پاس تو نہیں چلا جائے گا؟'' آج کل یہ سوال بارہا اس کے ذہن میں کلبلانے لگا تھا۔

وہ دن بہ دن ایک عجیب سے احساس کمتری اور عدم تحفظ کا شکار ہوتی جا رہی تھی۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ عزیر بھی تو بدلتا جا رہا تھا۔ کل تک جو باس سمجھ کر اس کے تلوے چاٹا کرتا تھا، آج شوہر بننے

کے بعد اس کا حکمران بننا چاہتا تھا۔
''مجھ پر کوئی حکم چلائے ناممکن......'' مہوش نے غصے میں برش کھینچ کر ڈریسنگ ٹیبل پر مارا، شور سے عزیر گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔

☆......☆......☆

''اماں کیا ہوا، ماہی بتا رہی تھی آپ نے جوس نہیں پیا؟'' چھوٹے چاچو نے ماں کے پاؤں دباتے ہوئے پوچھا۔
''آ گیا میرا خیال! صبح سے بلا رہی ہوں، مگر یہاں ماں سے کس کو محبت ہے؟ اپنے کاموں میں لگے ہوں گے۔ ایک لاڈلی بھتیجی ہی ہے، جس کے ہر دکھ درد پر چاچو بے چین ہو جاتے ہیں، بس ان کے سینے میں ماں کا درد نہیں اٹھتا۔'' انہوں نے جھٹکے سے پاؤں چھڑایا اور غصے سے بولیں۔
''اُفوہ اماں آپ بھی نا، کیا باتیں لے کر بیٹھ جاتی ہیں۔ جوس پی لیں ورنہ بی پی لو ہو جائے گا۔'' مامون نے ماں کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھا، تو وہ راضی ہو گئیں۔ ویسے بھی انہیں بیمار ہونے سے بہت ڈر لگتا تھا۔ ''ماہی جاؤ اماں کا جوس لے کر آؤ۔'' انہوں نے آنکھ سے اشارہ کیا تو وہ کچن کی طرف بھاگی۔ اس نے ابھی گاجر کا تازہ جوس نکالا تھا، جلدی جلدی ٹرے میں گلاس رکھنے لگی۔
''اماں بولتے ہوئے یہ تو سوچا کریں کہ ماہی سن رہی ہے، وہ کیا سوچے گی؟، میں تو آج آفس کے اسائنمنٹ بنانے میں مصروف تھا، وہ ہی بیچاری آپ کے لیے پریشان ہو رہی تھی، آ کر مجھ سے کہنے لگی چاچو دادی اماں نے جوس نہیں پیا ہے، ڈاکٹر نے سختی سے انہیں ایک گلاس روزانہ فریش جوس پینے کا کہا ہے۔ اب آپ ہی چل کر انہیں منائیں، وہ آپ کی ہی بات سنیں گی'' مامون نے ماں کو پیار سے بتاتے ہوئے گلاس ان کے ہونٹوں سے لگایا تو وہ شرمندہ ہو گئیں۔

''واقعی میں ماہی کے ساتھ کبھی کبھی بہت زیادتی کر جاتی ہوں۔ پورے گھر میں ایک وہ ہی تو ہے جو میرا اتنا خیال رکھتی ہے، ورنہ تو یہاں کا آوے کا آوا بگڑا ہوا ہے۔'' تھوڑی دیر کو ہی صحیح زبیدہ بیگم دل ہی دل میں شرمندہ ہو گئیں۔
''ایک چاچو ہی ہیں جو دادی اماں کو سمجھا سکتے ہیں یا ان سے بحث کر لیتے ہیں ورنہ تو کون اپنا دماغ ان کے ساتھ کھپائے۔ ہر وقت تو وہ کسی نہ کسی بیماری میں مبتلا رہتی ہیں۔'' مائرہ نے سارہ کے کان میں گھس کر کہا۔
ویسے بھی دادی اماں نے دن باندھے ہوئے ہیں۔ ہفتے کو سر میں درد، اتوار کو کمر میں، پیر کو ٹانگوں میں...... اس طرح پورا ہفتہ کچھ نہ کچھ ایکٹیوٹی رہتی ہے، بیماریاں ختم ہونے لگتی ہیں تو دوسرا ہفتہ شروع ہو جاتا ہے، اور بیماری Repeat ہونے لگتی ہیں۔'' ماہرہ نے سارہ کے ہاتھ پر تالی مار کر قہقہہ لگایا۔
ہاں مگر پھوپو کو بھی سو خون معاف ہیں۔ وہ تو جھنجھلا کر جواب بھی دیں گی، تو دادی مسکراتی رہیں گی۔ کپڑے دیکھو بوتیک سے لڑکیوں والے خرید کر لاتی ہیں، مگر ان کے بھدے جسم پر کچھ اچھا نہیں لگتا۔ سارہ نے جل کر ماہرہ سے کہا اور ٹی وی پر آتے مارننگ شو کی طرف متوجہ ہو گئی جہاں ایک موٹی سی میزبان انارکلی فراک پہنے بہت بھدی نظر آ رہی تھی۔
''ادھر آؤ تم دونوں کچھ گھر کے کام وام میں بھی دلچسپی لیا کرو، سارا دن یا تو باتیں بگھارتی رہتی ہو یا ٹی وی کے آگے بجی رہتی ہو؟ مائرہ تم کالج کیوں نہیں گئیں؟ کبھی پڑھ بھی لیا کرو۔'' مامون نے انہیں کھسر پھسر کرتے دیکھا تو ایک ساتھ دونوں کی کلاس لے ڈالی۔
''وہ چاچو پڑھتے تو ہیں، آج کل چھٹیاں ہیں نا۔'' مائرہ نے صفائی پیش کی، سارہ نے چپ رہنے

میں عافیت سمجھی اور ریموٹ سے ٹی وی آف کر دیا ،مامون سے دونوں کی جان جاتی تھی۔

''جانتا ہوں کتنا پڑھتی ہو؟، جب ہی تو ہر سال ایک پیپر رکا ہوا ہوتا ہے، کچھ نہیں تو ماہا سے سبق لو۔تم دونوں سے اتنی چھوٹی ہے مگر ماشااللہ پڑھائی کے ساتھ سارے کام بھی کرتی ہے۔'' انہوں نے پیار سے ماہا کو دیکھا اور اس کے لائے، ہوئے چائے کے کپ کی طرف متوجہ ہو گئے۔ وہ دونوں اپنی عزت افزائی پر برے برے منہ بنانے لگیں۔

''واہ بھیا واہ! خوب انصاف سے کام لیا، ایک میری معصوم بیٹیاں ہی سب کی آنکھوں میں کھٹکتی ہیں۔ چاپلوسی نہیں کر سکتیں نا، انہیں اوروں کی طرح چکنی چپڑی باتوں سے کسی کو اپنا بنانا جو نہیں آتا۔'' ساجدہ بیگم نے تیکھی نظروں سے ماہا کو گھورا۔ مامون کی بھاری مردانہ آواز سن کر وہ کمر پر ہاتھ رکھ کر چھوٹے دیور کی طرف متوجہ ہو چکی تھیں۔

مامون نے ان سے الجھنا بے کار سمجھا خاموشی سے سر جھکا کر چائے پینے لگے، وہ اور شیر ہو گئیں۔

''ہاہا!! میری بچیاں۔ مجھ پہ ہی گئی ہیں نا، ساری زندگی میں نے بھی اسی لیے اس گھر میں جوتے کھائے؟ مکروفریب جو نہیں آتا، وہ اچھی رہیں، جو ذمہ داریاں نہ نبھا سکی، ان کو تو بس بجنا سنورنا آتا تھا۔ ان کے بوئے کو بھی ہم نے ہی سمیٹا۔'' مبالغہ آرائی کی حد کرتے ہوئے انہوں نے پہلے ٹھنڈی آہ بھری جب دیکھا کہ کوئی متوجہ نہیں ہوا تو دوپٹہ منہ پر رکھ کر جھوٹ موٹ رونا شروع ہو گئیں۔

''ارے تمہاری قربانیوں کے ہم گواہ ہیں نا، تم روتی کیوں ہو۔'' زبیدہ بیگم گھبرا کر جلدی سے اٹھیں اور لگیں، بہو کو مسکا لگانے۔ وہ ساجدہ سے دبتی تھیں، اپنے دوپٹے سے آنسو پونچھنے لگیں، ماہی کو پانی لانے کا اشارہ کیا۔ ماہرہ، سارہ ماں کے ایسے ڈراموں کی عادی تھیں، مزے سے دیکھتی رہیں۔

''کیا مجھے پتا نہیں ہے کہ یہ آگ کون لگاتا ہے، پرے کرو پانی؟'' ماہی نے جیسے ہی پانی کا گلاس تائی کے منہ سے لگایا، انہوں ہاتھ جھٹکا اور گلاس دور جا گرا۔''ویسے تو ماں کی طرح مظلوم بنی رہتی ہو، مگر، میری بیٹیوں کے خلاف سب کے کان بھرتی رہتی ہو۔'' ڈھونگی کہیں کی، اب آئی ہے میری ہمدرد بن کر، چل اپنا کام کر۔ گھنی نہ ہو تو۔'' غصہ سے ان کا منہ لال ہو رہا تھا۔ ہاتھ اٹھا اٹھا کر ماہا برا بھلا کہہ رہی تھیں۔ ماہی خاموشی سے ٹوٹے گلاس کی کرچیاں چننے لگی۔ وہ مر کر بھی تائی اماں کی بدگمانی دور نہیں کر سکتی تھی۔ آنسو اس کی آنکھوں سے ٹپک رہے تھے۔

''مرے ہوؤں کو تو بخش دیں۔'' مامون نے ناگواری سے بھاوج کو دیکھا اور زور سے پیالی ٹیبل پر پٹخی۔

''اماں ان کو آپ خود سمجھالیں تو اچھا ہوگا۔ اب میں ماہین بھابی کے خلاف اس گھر میں ایک لفظ نہیں سنوں گا۔'' مامون ناشتا چھوڑ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ ساجدہ نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا مگر زبیدہ بیگم نے جلدی سے اس کا ہاتھ دبا کر خاموش رہنے کا اشارہ دیا۔

''چاچو پلیز چپ ہو جائیں۔'' ماہی نے پانی کا گلاس آگے بڑھایا، ورنہ ایک اور بڑا معرکہ شروع ہو جاتا۔ مامون نے غصے کو پانی پی کر ٹھنڈا کیا، فائلیں اٹھائیں، اور گھر سے باہر نکل گیا۔

''ساجدہ تمہیں بھی مصلحت سے کام لینا نہیں آتا، اب دیکھو اسے ناراض کر دیا۔'' لاڈلے بیٹے کو یوں گھر کی دہلیز پار کرتا دیکھا تو زبیدہ بیگم کے دل کو دھچکہ لگا۔

''ہونہہ! میری بلا سے۔'' ساجدہ نے نخوت سے سر جھٹکا۔

''اگر تمہاری زبان ایسے ہی چلتی رہی تو کر لی اس

نے تمہاری بہن سے شادی...... وہ تمہارے گھر والوں
سے چڑتا ہی رہے گا۔ ایسے تیور ہیں تمہارے، وہ
خاک، نئی رشتے داریاں جوڑے گا۔" انہوں نے
ساجدہ کے نزدیک بیٹھ کر دھیرے سے سمجھایا۔ یہ ہی وہ
کمزوری تھی جس سے ساجدہ کو کنٹرول کیا جا سکتا تھا۔

"تمہیں کتنا بھی سمجھا لو، تم سدھرنے والی
نہیں۔" آخر میں ساجدہ کو غصے سے لتاڑا تو وہ
خاموش ہوگئیں۔

مامون کی خوبصورتی اور وکالت کے شعبے میں
کامیابی سے متاثر ہو کر ہی تو ساجدہ نے اپنی چھوٹی
بہن ناجیہ کے لیے زبیدہ بیگم سے بارہا بات کی تھی۔
زبیدہ بیگم ساجدہ کی منہ زوری سے پہلے ہی پریشان
تھی۔ اس نے میٹرک پاس ناجیہ کے رنگ ڈھنگ
بھی دیکھ رکھے تھے، بھائی کی بچی تھی تو کیا ہوا،
آنکھوں دیکھی مکھی کون نگلتا۔ وہ کسی بھی صورت
ناجیہ کو اس گھر میں بہو بنا کر لانے پر رضامند نہ تھیں،
مگر ساجدہ کو بہن کی شادی کا لارا لپا دے کر ہی قابو
میں کیا ہوا تھا۔ وہ بہن کے اچھے مستقبل کی آس میں
ساس کی تھوڑی بہت سن بھی لیتی تھیں، اور مہوش کی
خوشنودی میں بھی لگی رہتیں۔

'اللہ نہ کرے جو چاچو کی شادی ناجیہ پھوپو سے
ہو۔ کہاں میرے ہینڈسم چاچو کہاں وہ موٹی فٹ
بال، جو اپنے آپ کو ڈرامے کی ہیروئن سے کم نہیں
سمجھتی' ماہا نے دل سے دعا کی اور مویٰ کے کمرے کی
طرف ناشتا دینے چل دی۔ یہ بات ماہا کے لیے
بہت حیران کن تھی کہ اس کے تایا ابا اپنی بیوی کے
ساتھ نہیں بلکہ ایک الگ کمرے میں رہتے تھے۔ اس
نے ان دونوں میاں بیوی کے درمیان وہ ہم آہنگی
بھی نہیں دیکھی تھی جو عموماً میاں بیوی کے درمیان
پائی جاتی ہے۔ تایا تو تائی اماں کو مخاطب بھی بہت کم
کرتے تھے۔ اسے تو سارہ، مائرہ پر افسوس ہوتا تھا
، جو تائی اماں کی شہہ پر باپ کو خاطر میں ہی نہیں لاتی
تھیں، ہاں عثمان اپنے باپ کا بہت خیال رکھتا تھا۔
دادی اماں نے اس معاملے میں بہو کو بارہا سمجھایا، مگر
وہ اس بارے میں کسی کی نہیں سنتی تھیں۔

☆......☆......☆

"میں تمہیں اب مزید ایک روپیہ بھی نہیں دوں
گی۔ خود کماؤ اور عیاشی کرو۔ میرے پاس تمہیں دینے
کے لیے ایک ٹکا بھی نہیں۔" مہوش نے شاپنگ پر
جانے سے قبل شوہر کو جھڑکا اور غصے سے تیز تیز بالوں
میں برش چلانے لگی۔ وہ عزیر کے ہر وقت کے
پیسوں کے مطالبے سے کبھی جھنجھلا اٹھتی تھی۔

"یار سمجھا کرو نہ...... عیاشی نہیں کرنی، اماں کی
طبیعت ٹھیک نہیں ہے، انہیں دواؤں کے لیے پیسے
دینے ہیں۔ جیسے ہی نوکری ملے گی تمہاری ساری رقم
سود سمیت واپس کردوں گا۔" اس نے پرانا وعدہ
دہرایا، اور جلدی سے ڈریسنگ ٹیبل سے پرفیوم کی
بوتل اٹھا کر مہوش پر ہلکے سے اسپرے کیا۔ عزیر کا اپنا
مطلب تھا اس لیے مہوش کو منانا ضروری تھا۔ مگر وہ
بھی کچی گولیاں نہیں کھیلی تھی جو فوراً پیسے پکڑا دیتی،
شوہر کے سارے بہانوں کو سمجھتی تھی۔

"شمسی صاحب کے یہاں کام کرنے میں کیا
برائی تھی؟ اچھی بھلی نوکری، بہترین تنخواہ۔ تمہیں بھلا
اور کیا چاہیے؟" مہوش نے مڑ کر اسے دیکھا۔ عزیر
اپنی جادو بھری مسکراہٹ سے بیوی کو لبھانے کی
کوششوں میں مصروف ہوگیا۔

"یہ سب میرے تعلقات ہیں، جو تمہیں مزے
سے نوکریاں مل جاتی ہیں۔ باہر نکل کر دیکھو کتنی بے
روزگاری ہے۔ مگر تمہیں تو کام ہی نہیں کرنا، ہر جگہ
ایک نئی پرابلم شروع ہو جاتی ہے۔" مہوش شوہر کو
دوبارہ سمجھانے لگی تو وہ بے زار ہوگیا۔

مہوش اس کی نوکری نہ کرنے کی عادت سے

بہت الجھتی تھی، جبکہ عزیر کو ہر وقت پیسوں کی ضرورت رہتی تھی۔

''وہاں مجھ سے کام کم لیا جاتا تھا تمہاری تعریفیں زیادہ سنائی جاتی تھیں۔'' اس نے جل کر ہاتھ میں پکڑی پرفیوم کی بوتل ڈریسنگ ٹیبل پر رکھ دی۔

''میرے کیے ہوئے ہر کام کا موازنہ تمہارے کاموں سے کیا جاتا تھا۔''

''آپ نے یہ کیسی فنانشل اسٹیٹمنٹ بنائی ہے؟ جب یہاں مہوش تھی تو وہ ساری ایڈجسٹمنٹ بناتی تھی۔ آپ نے اس میں یہ کمی چھوڑ دی ہے۔ وہ کام ٹھیک نہیں کیا۔'' عزیر نے جل کر ان کی نقل اتاری۔

اس کے انداز پر مہوش کی ہنسی چھوٹ گئی۔

''یہ بھی کوئی بات ہے۔ ہر ایک کا اپنا طریقہ کار ہوتا ہے، مگر یہ بات ان بے وقوفوں کو کون سمجھائے۔'' عزیر نے جلے دل کے پھپھولے پھوڑے۔ مہوش نے عافیت اسی میں جانی کہ اس کو کچھ پیسے دے دیے جائیں۔ اسے پتا تھا کہ عزیر پیسے لیے بغیر اس کی جان نہیں چھوڑے گا۔ پرس میں ہاتھ ڈال کر اس نے خاموشی سے پیسے نکال کر عزیر کے ہاتھ پر رکھ دیے، وہ مزید ایک لفظ بھی اس پر ضائع کرنا نہیں چاہتی تھی، اس کی عادت بات سے بات نکالنے کی تھی، اس کی بے پر کی باتوں پر مہوش اسے ٹوکتی تو بدمزگی پیدا ہو جاتی۔

''سارہ...... سارہ جلدی چلو دیر ہو رہی ہے۔'' مہوش سارہ کو آواز دیتی نیچے اتر گئی، اسی کے ساتھ آج شاپنگ کا پروگرام بنا تھا۔ ویسے بھی آج کل جانے کیوں عزیر کا رویہ بدلا بدلا سا لگنے لگا تھا۔ وہ اپنی ہر بات منوانے کی کوشش کرتا تھا۔ مہوش اب پہلے کے مقابلے میں محتاط ہو گئی تھی، بحث سے اجتناب ہی برتتی۔ دل سے چڑنے کے باوجود، اس پر ظاہر نہ ہونے دیتی۔ وہ عزیر کو بہت چاہتی تھی، اس کی لاپروائیوں سے بیزار ہونے کے باوجود اسے کھونا نہیں چاہتی تھی، تھا تو اس کا سہاگ ہی نا۔

☆......☆......☆

دروازے کی بیل بہت دیر سے بج رہی تھی، مگر سب مست ملنگ تھے، کسی سے اتنا نہیں ہو رہا تھا، کہ دروازہ ہی کھول دے۔

اتنی سردی میں کون کمرے سے باہر نکلتا، بوا اماں بھی سودا لینے گئی ہوئی تھیں، مجبوراً ماہا کو کپڑے چھوڑ کر دروازہ کھولنے جانا پڑا۔

''اسلام علیکم! ماموں بھائی گھر پر ہیں۔'' دروازہ کھولنے پر بھاری مردانہ آواز نے سلامتی بھیجی۔

''اف یہ گھورو پھر آ گیا۔'' ماہا نے دل میں سوچا، فرید حسن کو دیکھ کر ماہا کا منہ بن گیا، وہ فوراً سائیڈ میں ہو گئی۔

''جی چاچو تو نہیں ہیں، آج تھوڑی دیر سے آئیں گے۔ صبح بتا کر گئے تھے۔ ماہا نے جلدی جلدی بتایا۔

آج اس نے ہفتہ وار مشین لگائی تھی، مردوں کے کپڑے تو دھوبی کے یہاں جاتے تھے، مگر خواتین اپنے کپڑے خود دھوتی تھیں۔ پہلے تو سب نے اپنے کپڑوں کی ذمہ داری بھی ماہا پر ڈال دی تھی، لیکن ایک دن ماموں نے دیکھ لیا کہ اس نے صبح سے جو مشین لگائی تو شام تک سارے کپڑے دھو کر فارغ ہوئی۔ وہ سب پر خوب گرجا برسا۔ اب اس کی ذمہ داری صرف اپنے اور دادی کے کپڑوں تک محدود ہو گئی تھی۔ پھر بھی اس کی وہ ہی مروتیں...... جب بھی مشین لگاتی، تائی اماں کے کپڑے لینے پہنچ جاتی۔

''رہنے دو بھئی پھر ماموں غصہ ہوگا کہ ہم تم پر ظلم کرتے ہیں، کام کرواتے ہیں''، وہ بھی احسان جتا جتا کر اسے کپڑوں کا گٹھڑ پکڑا دیتیں۔

فرید کے ایک ٹک دیکھنے پر ماہا کو الجھن ہونے لگی، وہ جب بھی ماہا کو دیکھتا، دیکھے چلا جاتا، اکثر ماہا کا دل چاہتا تھا کہ چاچو سے شکایت لگادے مگر پھر شرم مانع آجاتی تھی۔

ماہا کے گھورنے اور منہ بنانے پر فرید حسن کو بھی شرمندگی ہوتی تھی، مگر ماہا کو دیکھ کر اس کا دل یوں ہی ہاتھوں سے نکلا جاتا تھا۔

''اوکے میں ان سے موبائل پر بات کرلوں گا''۔ ماہا کو دیکھ لیا تھا، اب رکنے کا جواز ختم ہوگیا تھا۔ دل باغ باغ ہوگیا تھا اس کی مراد جو پوری ہوگئی تھی، وہ اپنی گاڑی کی طرف بڑھ گیا۔

''کیا شاندار جی ایل آئی ہے؟'' ماہا نے ستائش بھری نظروں سے گاڑی کی طرف دیکھا۔

''خود بھی کالا ہے اور گاڑی بھی کالی پسند کرتا ہے'' ماہا نے دروازہ بند کرتے ہوئے سوچا۔

''اللہ توبہ میں بھی بلاوجہ بیچارے کا مذاق اڑا رہی ہوں۔ اچھا بھلا تو ہے،'' اس نے اپنے آپ کی سرزنش کی اور فرید حسن کے لمبے قد اور متناسب سراپے پر ایک نظر ڈال کر مسکرادی۔

فرید حسن جو ماہا کو دروازہ بند کرتے دیکھ رہا تھا، اس کی مسکراہٹ پر سرشار ہوگیا۔ تیزی سے گنگناتا ہوا اپنے راستے پر ہولیا۔ آج دل جھوم رہا تھا، دیدار یار جو ہوگیا تھا۔

☆......☆......☆

''بوا اماں آپ تو یہاں شروع سے ہیں۔ میری مما کو آپ نے دیکھا ہوگا نا، بتائیے نا وہ کیسی تھیں؟'' آج بڑے دنوں بعد وہ فارغ بیٹھی تو صحن کے تخت پر لیٹ کر اِدھر اُدھر کی باتوں کے دوران اسے ایک دم اپنی مرحومہ ماں کی یاد ستائی، بوا اماں جو شام کی ہنڈیا کے لیے سبزی کاٹ رہی تھیں، چونک تھیں۔ چور نظروں سے زبیدہ بیگم خاتون کے کمرے کے بند دروازے کی جانب دیکھا جو دوپہر کے کھانے کے بعد قیلولہ فرما رہی تھیں۔ ماہا کے ذہن میں اکثر اس سوال کی بازگشت گونجتی تھی خصوصاً جب ساجدہ بیا تنگ دہل ماہین کو برا بھلا کہتی، ساجدہ بھی بیٹیوں سمیت اپنے میکے سدھاری ہوئی تھی، اس لیے کام کا بکھیڑا بھی کم تھا۔

''بس بیٹا وہ تو جنتی عورت تھی۔ اللہ اسے جنت جنت کروٹ نصیب کرے۔ بہت ہی نیک اور سلجھی ہوئی بچی تھی۔ میں نے ہی تو اسے آخری دفعہ......'' وہ کچھ بولتے بولتے رک گئیں، جیسے کچھ چھپانا مقصود ہو۔

''آخری دفعہ...... کیا اماں؟'' ماہا نے بے قراری سے پوچھا۔ اسے لگا ایسا موقع دوبارہ نہیں ملے گا، کہ وہ اپنی ماں کے بارے میں معلومات حاصل کرلے، ورنہ جانے کیا بات تھی کہ جب بھی وہ اپنی امی کے حوالے سے کوئی سوال جواب کرتی ، سب اس کا دھیان بٹانے میں لگ جاتے۔

'ارے کچھ نہیں جانے دو'، بس ایسے ہی زبان پھسل گئی، شاید میرے ساتھ یہ بھی بوڑھی ہوگئی ہے۔'' وہ افسردہ ہوگئیں، اور اسے ٹالنے لگیں۔ ماہا معصومیت سے ان کا منہ دیکھنے لگی۔ اسے بوا اماں کے منہ سے ماں کی تعریف سننا بہت ہی اچھا لگ رہا تھا۔

''اماں! پلیز کچھ تو بتائیں۔'' ماہا نے لجاجت سے ان کا جھریوں بھرا ہاتھ تھام لیا۔

''چھوڑ نہ بچی! تُو بھی کن باتوں میں لگ گئی، چل شام ہو رہی ہے، چھت سے جا کر کپڑے اٹھالے۔ اڑ کر پیچھے چلے گئے تو تیری تائی چیخے گی۔'' بوا نے جھرجھری لی اور ماہا کا دھیان بٹانے کے لیے اسے ایک کام بتادیا۔ تائی کا نام سن کر وہ چونک اٹھی۔ یاد آیا کہ ان کے کپڑے بھی چھت پر پڑے ہیں اگر ایک کپڑا بھی تیز ہوا سے اڑ کر اِدھر اُدھر ہوا تو وہ ماہا

کی جان نکال لیں گی، مگر ماں کے بارے میں جاننے کا تجسس وہ بھی انسانی فطرت کے آگے مجبور ہوگئی۔

''اچھا کچھ تو بتائیے، یہ ہی بتادیں کہ میری ماں کی شادی پاپا سے کیسے ہوئی؟'' ماہا ایسے سنہرے موقع کو کھونا نہیں چاہتی تھی اس لیے لاڈ سے بولی، بوا بھی ماہا سے بہت پیار کرتی تھیں۔ اس کی ماں کے گزرنے کے بعد بوا اماں نے ہی اس چھوٹی سی بچی کو پالا تھا۔ اس وقت ماہا کو ٹالنا ان کے لیے بہت مشکل ثابت ہورہا تھا، وہ جائے رفتن نہ پائے رفتن کی کیفیت سے دوچار ہوگئیں۔

''پلیز میں اپنی ماں کے بارے میں کچھ جانا چاہتی ہوں۔'' وہ سسک سسک کر رو دی۔ بوا اماں خاموش رہیں۔ وہ نہیں چاہتی تھیں کہ ماضی کے راز ماہا پر عیاں کرکے اسے اور تکلیف میں مبتلا کریں۔

''اماں میں نے تو جب سنی، اپنی ماں کی برائی ہی سنی۔ آپ بتائیے نا کیا وہ واقعی بری تھیں؟ مگر میرا دل کہتا ہے کہ وہ بہت اچھی ہوں گی۔'' اس نے بوا کے آگے ہاتھ جوڑ دیے۔ آنسو قطار در قطار اس کی آنکھوں سے ٹپکے جارہے تھے۔ اس کے دکھ پر بوا بھی رودیں اور نہ چاہتے ہوئے بھی انہوں نے ماضی کے اوراق ماہی کے آگے کھول کر رکھ دیے۔

☆......☆......☆

زبیدہ بیگم اور امتیاز احمد دریا کے دو کنارے جیسے تھے، ساتھ ساتھ بہتے رہتے، مگر آپس میں ملتے نہ تھے۔ زبیدہ بیگم تعلیم میں کوری مگر حسن میں یکتا جبکہ امتیاز احمد کی نظر میں علم سے ہی شخصیت کی خوبصورتی تھی۔ زبیدہ بیگم اپنے زمانے کی حسینہ عالم مانی جاتی تھی۔ اس کا ہمیشہ ستائش سے واسطہ پڑا، مگر یہاں ایسے بے درد سے پالا پڑا جو چوڑی کی کھنک، مہندی کی خوشبو سے نا آشنا تھا۔ شادی کے حوالے سے بڑے ارمان دل میں بسائے زبیدہ بیگم نے جب پیا کی دہلیز پار کی، تو اس کی خوش فہمیاں انتہاؤں کو پہنچی ہوئی تھیں۔ وہ سمجھتی تھی کہ اپنے حسن کے زور پر شوہر کو انگلیوں پر نچائے گی۔ امتیاز احمد وکھری ٹائپ مرد ثابت ہوئے، وہ مزاجاً خاصے خشک اور خاموش طبع شخصیت کے مالک تھے۔ بہن بھائیوں میں سب سے بڑے ہونے کی وجہ سے مزاج میں قدرتی طور پر سنجیدگی رچ بس گئی تھی۔ ذمہ داریوں کے بوجھ تلے دبے ہوئے امتیاز احمد پڑھنے کے شوقین اور بہت ذہین تھے۔ میٹرک کرتے ہی زندگی کی گاڑی کھینچنے کی تگ ودو میں باپ کا ہاتھ بٹانے نکل پڑے۔ زیادہ تعلیم نہ حاصل کرنے کا قلق انہیں بے چین رکھتا، مگر باپ کے آگے مجبور تھے۔ والد بزرگوار کی نظر میں اتنی تعلیم کافی تھی جس کی وجہ سے وہ دکان پر حساب کتاب کرسکیں۔

ان لوگوں کی شہر کی ہول سیل مارکیٹ میں چائے کی پتی اور خشک دودھ کی خاصی چلتی ہوئی دکان تھی، باپ نے امتیاز احمد کو کام کی تھوڑی سمجھ بوجھ دینے کے بعد گلے پر بٹھا دیا۔ بچپن باپ کی دکان پر حساب کتاب کرتے گزرا۔ پتا ہی نہیں چلا کہ کب جوانی آگئی۔ زندگی کا محور تو بس گھر اور دکان کے گرد گھومتا تھا۔

امتیاز احمد کے دل میں دکان کا پہلا پہلا عشق ایسا سمایا کہ پھر کوئی دوسرا وہاں اپنی جگہ بنا ہی نہیں سکا۔ وہ رات کو بیٹھ کر جب گلے کا حساب کتاب کرتے اور دکان کی آمدنی میں روز بروز اضافہ پاتے تو دل عجیب سی خوشی کے احساس سے معمور ہوجاتا۔ وہ پکے کاروباری بن چکے تھے، دکان کے علاوہ ان کی دلچسپی اگر قائم تھی تو وہ کتابوں سے، جب بھی فرصت بھرے لمحات میسر ہوتے کتابوں کی دنیا میں کھو جاتے، اتنی کتابیں جمع کرلی تھیں کہ ان کے کمرے کا ایک کونا چھوٹی سی لائبریری میں تبدیل ہوچکا تھا۔

شادی ان کے لیے ایک فرض کی ادائیگی تھی۔
زبیدہ بیگم ان کے والدین کی پسند تھیں انہوں نے بغیر آنا کانی کیے سب کی مرضی کے آگے سر جھکا دیا۔ گوکہ ایک تعلیم یافتہ ساتھی کی خواہش ان کے دل میں پنپ رہی تھی، مگر وہ خود کون سا اس کسوٹی پر پورے اترتے تھے۔ اس لیے خاموشی سے زبیدہ بیگم کو بیاہ کر لے آئے،

''میں آپ کو کیسی لگی۔ ویسے تو میری دوستیں بتا رہی تھیں کہ آج میں بہت خوبصورت لگ رہی ہوں، مگر آپ جب تک میری تعریف نہیں کریں گے مجھے کیسے پتا چلے گا کہ میں آپ کو کتنی پیاری لگ رہی ہوں'؟' امتیاز احمد کے کمرے میں داخل ہوتے ہی، دلہن نے گھونگھٹ الٹ کر پٹ پٹ آنکھوں سے دلہا کو دیکھنا شروع کر دیا۔ بہت دیر تک ان کی خاموشی برداشت کرنے کے بعد خود ہی بے باکی سے اپنے حسن کی تعریف شروع کر دی۔ امتیاز احمد جو دل ہی دل میں بات شروع کرنے کے لیے موزوں الفاظ ڈھونڈتے رہ گئے نئی نویلی دلہن کی جسارت پر حق دق رہ گئے، زبیدہ بیگم کا انداز گفتگو ان کے سنجیدہ مزاج پر کڑا گزرا۔ انہیں احساس ہوا شادی جسے جوا بھی کہا جاتا ہے، مات ان کا مقدر ٹھہری ہے۔

شادی کی پہلی رات زبیدہ بیگم کی بچکانہ اور خود پسندی بھری باتوں اور نت نئے سوالوں سے وہ شدید کوفت میں مبتلا ہو چکے تھے۔ انہیں کہاں اتنی لچھے دار مصنوعی باتوں کی عادت تھی، مگر نئی دلہن کا لحاظ کر گئے۔ حقوق اور فرائض کی ادائیگی سے فارغ ہو کر نہا دھو کر صبح ہی دکان کے لیے گھر سے نکل گئے۔

زبیدہ بیگم الگ میاں جی کے رویے پر حیران و پریشان تھی۔ اس کی سہیلیوں کی کہی ہوئی ایک بات بھی درست ثابت نہ ہوئی، انہوں نے دلہن بنی زبیدہ بیگم کو دیکھ کر اس کے بڑے قصیدے پڑھے تھے۔

''اف تُو...... کتنی حسین لگ رہی ہے، دلہا بھائی تو آج رات تو تیرے پاؤں دھو دھو کر پئیں گے۔'' اس کی پڑوسن اور بچپن کی سہیلی چھنو نے اس کے چٹکی کاٹ کر اسے چھیڑا تو وہ لجا کر رہ گئی مگر یہاں تو امتیاز احمد نے زبیدہ بیگم کے اشتیاق بھرے سوالوں کا ہوں ہاں میں جواب دینا ہی گوارا کیا مجال ہے جو، منہ سے تعریف کا ایک لفظ بھی نکالا ہو

''بیڑہ غرق ہو تیرا منّی! بڑا بڑھ چڑھ کر بول رہی تھی کہ ایسا ماڈل میک اپ کروں گی کہ دلہا دیکھتے ہی چاروں شانے چت ہو جائے گا، بلاوجہ میں نے اس کو اتنے زیادہ پیسے دیے۔' زبیدہ بیگم کی آنکھوں میں اپنی ناقدری پر شبنم اتر آئی، کسی اور پر بس نہیں چلا تو پارلر والی کو دل ہی دل میں کوسنے لگی۔

☆......☆......☆

زبیدہ بیگم کے آجانے سے امتیاز احمد کی زندگی میں کوئی بہت زیادہ فرق نہیں پڑا، وہ ہم سفر تو بن گئی مگر غم گسار نہ بن سکی۔ اسی لیے امتیاز اپنے پرانے روٹین پر قائم تھے۔ ولیمہ کے بعد سے ہی صبح اٹھ کر دکان چلے جاتے، تاہم باپ کے زبردستی کرنے پر شام کو تھوڑا جلد لوٹ جاتے، تب بھی ان دونوں کو اکیلا بیٹھنے کا موقع نہ ملتا۔ اس مقام پر آکر زبیدہ بیگم گھریلو سیاست کا شکار ہو گئی، ساس بیگم بیٹے کے دکان سے لوٹنے کے وقت دروازے سے چپک کر بیٹھ جاتیں، منہ دیکھتے ہی لاڈ اٹھانے لگتیں۔ زبیدہ بیگم کمرے میں کلستی رہتی، مگر اپنی انا کا پرچم سرنگوں نہ کرتی۔ امتیاز کی ماں بہنیں بھی یہ ہی چاہتی تھی کہ میاں بیوی آپس میں زیادہ گھل مل نہ سکیں۔ آخر کماؤ بیٹا تھا، یونہی ہاتھ سے کیسے جانے دیتیں۔ بہو کے تیور پہلے دن سے ہی دیکھ رہی تھیں، مزاج کی تیزی سے بھی خوف زدہ ہو گئیں۔ اسی لیے خود ہی حکمت عملی وضع کر بیٹھیں، ہمارے گھروں کی خواتین

اگر سیاست کرنے پر اتر آئیں، تو ملک کے سیاسی رہنما ان کے آگے طفل مکتب دکھائی دیں۔

قسمت سے دن کے وقت اگر وہ میاں بیوی اکیلے بیٹھے پائے جاتے تو ماں کے اشارے پر، کوئی نہ کوئی بہن یا بھائی خلوت کو جلوت میں بدل دیتا۔ بڑے بھائی کے ساتھ ایسا جڑ کر بیٹھ جاتا کہ زبیدہ بیگم دانت کچکچا کر رہ جاتیں، ان کی دل کی باتیں ان کہی رہ جاتیں۔ کبھی جو وہ بے شرم بن کر ان لوگوں کے سامنے ہی شوہر سے پیار جتانے لگتی، تو امتیاز احمد چھوٹے بھائی بہنوں کے لحاظ میں جھٹ باہر نکل جاتے اور زبیدہ بیگم کلس کر رہ جاتیں۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ گھر میں ایک کھنچاؤ کی کیفیت پیدا ہوگئی۔

''زبیدہ بیگم کو تو صرف اپنے ہار سنگھار سے مطلب ہے، گھر کا کام میں اور میری بیٹیاں ہی کریں'' گھر آتے تو ماں بہو کی شکایتیں لے کر بیٹھ جاتیں، وہ خاموشی سے سنتے۔

''تمہاری ماں، بہنیں کیا مجھے نوکرانی سمجھتی ہیں۔ سارے گھر کا کام کروں، پھر بھی خوش نہیں ہوتیں؟'' کمرے میں جاتے تو بیوی اپنا دکھڑا روتی، کبھی اس کو سمجھاتے، کبھی آنکھ پر ہاتھ رکھ کر سوتے بن جاتے۔

یوں ہی روتے گاتے زبیدہ بیگم تین بیٹوں اور ایک بیٹی کی ماں بن گئی، مگر میاں پر مکمل قبضہ نہ جما سکیں، نہ ہی وہ محبت حاصل کرسکیں۔ جس کی آرزو لیے وہ امتیاز کی زندگی میں شامل ہوئی تھی۔

وقت کی دھارا کا کام بہنا ہے، سو وہ بہتا چلا گیا۔ جوان ہوتے بچوں کے ساتھ ہی زبیدہ بیگم کی پوزیشن گھر میں خاصی مستحکم ہوگئی۔ امتیاز احمد کے والدین کا انتقال ہو چکا تھا۔ دونوں بھائی مہتاب اور آفتاب شادی کے بعد بھابی کی بدمزاجی کے باعث خود ہی بیویوں کو لے کر الگ شفٹ ہوگئے۔ تو زبیدہ بیگم نے سکون بھرا سانس لیا۔ دونوں نندیں ساس، سسر کی زندگی میں ہی بیاہ دی گئیں تھیں۔ شاہینہ بیاہ کر فیصل آباد چلی گئی تھی، دوسری آسیہ کا میاں الیکٹریشن تھا اسے بھی دبئی میں اچھی جاب مل گئی، بعد میں اس نے اپنی فیملی کو بھی وہیں بلالیا۔ یوں زبیدہ بیگم کی راہ کے سارے کانٹے دھیرے دھیرے نکل گئے، وہ اب گھر کی مختار کل تھی۔

☆......☆......☆

پرانے دنوں کی یادگار میں سے زبیدہ بیگم نے نہیں بدلا تو وہ تھی بوا اماں کی ذات، جو زبیدہ بیگم کی شادی سے قبل اس گھر میں اوپر کے کاموں کے لیے رکھی گئی تھیں اور اب امتیاز احمد کی خاندانی ملازمہ کی حیثیت اختیار کر گئیں۔ اپنے کام سے کام رکھنے کی عادت اور ان کی پھرتی اور چابک دستی زبیدہ بیگم جیسی سست عورت کو بڑا آرام دیتی۔ یوں زبیدہ بیگم نے ان سے کوئی پرخاش نہ رکھی اور زیتون بوا کا بھی کوئی اور ٹھور ٹھکانا تھا، وہ یہیں رچ بس گئیں۔ زیتون بوا بھی زبیدہ بیگم کی مزاج آشنا بن گئیں، جانتی تھی مالکن کی مٹھی چاپی کرنے سے ہی ان کی نوکری کو استحکام حاصل ہوگا، اسی لیے انہوں نے کاموں کا بوجھ بار اپنے ناتواں کاندھوں پر اٹھا لیا، اسے خوب آرام دیا، ورنہ زبیدہ بیگم اتنے آرام سے کسی سے خوش ہونے والی نہ تھی۔

امتیاز احمد نے والدین کے گزر جانے کے بعد شریعت کے مطابق باپ کی جائیداد میں سے بھائیوں کے حصوں کی ادائیگی کردی۔ وہ لوگ کیوں کہ اپنی الگ جاب کر رہے تھے۔ اس لیے انہوں نے دکان اور مکان میں شراکت کی جگہ پیسہ لینے کو ترجیح دی۔ بہنیں پہلے ہی بھائیوں کے حق میں دستبردار ہو چکی تھیں۔ اس طرح اب وہ اس دکان

کے اکیلے مالک تھے۔ مگران معاملات کو سدھارنے میں ان پر کافی قرضہ ہوگیا۔ اس کی ادائیگی اور اپنے بچوں کا مستقبل محفوظ کرنے کے لیے وہ دن رات کام میں جت گئے۔ ایسے میں ان کے پاس کہاں وقت رہ جاتا تھا، کہ وہ زبیدہ بیگم کے پاس بیٹھ کر ان کا حال دل سنتے۔ تاہم اپنے بچوں کے حوالے سے انہوں نے جو خواب دیکھے تھے، وہ اس سے دستبردار ہونے کو تیار نہ تھے۔ بچوں کو اعلیٰ تعلیم دلوانے کی خواہش اب جنون کی شکل اختیار کرگئی تھی۔ یہ ان کے بچپن کا وہ خواب تھا جس کی تعبیر وہ اپنے بچوں کے ذریعے حاصل کرنا چاہتے تھے۔

زبیدہ بیگم اس معاملے میں بھی میاں کی طرف دار نہ بنیں۔ تعلیم کی اہمیت سے ناآشنا، بچوں پر پڑھائی کے لیے کی جانے والی سختی انہیں بے جا نظر آتی، ان کی غلط حمایت میں امتیاز احمد سے لڑ بیٹھتیں۔ اسی کھینچا تانی میں بڑا بیٹا جو ماں کا، لاڈلا بھی تھا، تعلیم کی طرف مائل نہ ہوسکا، امتیاز احمد کا دل ٹوٹ گیا۔

بڑھتی ہوئی گرانی سے لڑنے کے لیے انہوں نے زیادہ سے زیادہ پیسہ کمانے کو اپنا شعار بنالیا، بچوں کے اچھے مستقبل کے لیے کچھ جوڑنا بھی تھا، بیوی کو تو صرف خرچ کرنے کا پتا تھا، شوہر کتنی محنت کرتا ہے، اس سے انہیں کوئی سروکار نہ تھا۔ مجبوراً دکان کی آمدنی بڑھانے کے لیے نت نئے تکڑم لڑاتے۔ گزرتے وقت کے ساتھ بڑھاپا اور تکان ان پر حاوی ہونے لگی مگر اپنے بچوں کو انہوں نے ایک آرام دہ اور کامیاب زندگی فراہم کردی تھی البتہ موسیٰ کو مارے باندھے بی اے کروانے کے بعد امتیاز نے ایک نیا سپر اسٹور کھلوادیا۔ دوسرا بیٹا ہارون بہت خوبرو اور ذہین تھا۔ اس نے انجینئرنگ کی تعلیم حاصل کی۔ جلد ہی اسے دبئی کی ایک کمپنی میں بہت اچھی جاب مل گئی۔ اس کے بعد ان کی اکلوتی بیٹی مہوش تھی جو اے سی ایم اے کر رہی تھی۔ چھوٹے بیٹے مامون کو وکیل بننے کا شوق تھا۔ وہ وکالت کی تعلیم حاصل کررہا تھا۔ بڑے بیٹے کی شادی امتیاز احمد اپنے خاندان میں کرنا چاہتے تھے اُن کے چھوٹے بھائی مہتاب احمد کی بیٹی سندس سے انہیں بہت پیار تھا۔ وہ پڑھی لکھی لڑکی، خوبصورت اور خوب سیرت سیدھی سادھی سی لڑکی تھی، موسیٰ بھی اسے دل ہی دل میں پسند کرتا تھا، مگر زبیدہ بیگم کو بھلا یہ بات کہاں منظور تھی وہ بیٹے کا جھکاؤ بھی دیکھ رہی تھیں، مگر سسرال والوں کو نیچا دکھانے کی خواہش کے تحت جلدی سے اپنی کم تعلیم یافتہ بھتیجی ساجدہ کو بیاہ لائی۔ موسیٰ نے ماں سے دل کی بات بتائی، مگر وہ اسے خاطر میں نہ لائیں۔ امتیاز احمد نے مخالفت بھی کی، مگر جب موسیٰ ہی ماں کے دودھ نہ بخشنے کی دھمکیوں سے ڈر گیا تو وہ بھی خاموش ہوگئے۔

ساجدہ نے گھر میں داخل ہوتے ہی حالات کو پرکھ لیا۔ وہ بھی موقع پرست لڑکی تھی، جلد ہی سمجھ گئی کہ اگر یہاں رہنا ہے تو پھوپو سے بنا کر رکھنا بہت ضروری ہے۔ اسے یہ بھی اندازہ تھا کہ مستحکم سسرال کے ذریعے وہ اپنے میکے کی غربت دور کرسکتی ہے۔ اب ایک نہ شد دو شد والی مثل سچ ثابت ہوئی۔ ساجدہ نے آتے ہی گھر کا ماحول ہی بدل کر رکھ دیا۔ دونوں پھوپی بھتیجی، زور زور سے بولتیں، خوب حلق پھاڑ کر قہقہے مارتیں، یا رشتہ داروں کی غیبت میں لگی رہتیں۔ ساجدہ، ساس کو پلکوں پر بٹھا کر رکھتی اور اپنی ہر جائز و ناجائز بات اس کے ذریعے منواتی۔

زبیدہ بیگم نے ایک دن شیخی میں آکر یا بھتیجی کو احسان مند کرنے کے لیے اسے سندس کے لیے موسیٰ کے جذبات کے بارے میں بڑھا چڑھا کر بتادیا، تو، سسر کے گھر والوں کے لیے بہو کی نفرت ساس کے مقابلے میں دو چند ہوگئی۔ ان دونوں کے رویوں

سے امتیاز احمد کے گھر والوں کا آنا جانا بالکل ہی بند ہوگیا۔ گھر کا ماحول دیکھ کر، امتیاز احمد کو لگتا اس کی دی جانے والی تمام قربانیاں رائیگاں گئیں۔ انہوں نے دل میں تہیہ کرلیا کہ وہ ہارون کی دلہن تو تعلیم یافتہ لائیں گے تاکہ گھر کا ماحول بدلے، اس کے لیے چاہے، انہیں زبیدہ بیگم کے خلاف بھی جانا پڑے، مگر ان کی یہ مشکل ہارون نے خود حل کردی۔ وہ خود بھی گھر کے اس ماحول سے گھبرایا ہوا تھا، اب گھر میں اپنی بیوی کے ذریعے اچھی تبدیلی کا خواہاں تھا۔

☆......☆......☆

دبئی میں جاب کے دوران اس کا آنا جانا اکثر اپنی پھوپو کے گھر لگا رہتا تھا، وہیں ان کی بڑی بیٹی ماہین اس کو پسند آگئی۔ ایم کام کرنے کے بعد آج کل، وہ ماں سے گھرداری کے سارے رموز سیکھ رہی تھی۔ جب کہ چھوٹی بیٹی شازمین ابھی اسکول میں پڑھ رہی تھی۔ دونوں بہنوں کے درمیان عمروں میں خاصہ تفاوت تھا۔ سلجھے ذہن کی سادہ سی ماہین اسے اتنی بھا گئی کہ اس نے پاکستان فون کرکے اپنے باپ سے اس کے ساتھ شادی کرنے کی خواہش کا اظہار کردیا۔ جانتا تھا کہ ماں کو تو سسرال والوں سے کانٹے کا بیر ہے، وہ تو فوراً ہی منع کردیں گی۔ اس کی توقع کے عین مطابق باپ تو خوش ہوگئے، مگر زبیدہ بیگم ہتھے سے اکھڑ گئیں۔ امتیاز احمد کی اس شادی کی صورت میں دو خواہشات کی تکمیل ہو رہی تھی۔ ایک تعلیم یافتہ بہو دوسرا اپنوں میں بیٹے کا رشتہ ہونا، جو زبیدہ بیگم کو کسی صورت منظور نہ تھا۔

ساجدہ نے بھی ایسے میں ماہین کی مخالفت میں پھوپھی کا بھرپور ساتھ دیا، وہ اپنی نیچ والی بہن رعنا سے ہارون کی شادی کی خواہش مند تھی۔ دونوں نے مل کر امتیاز احمد کے سامنے دلائل کا ایک انبار لگا دیا، مگر وہ اب کی دفعہ کچھ سننے کے موڈ میں نہ تھے۔ موسیٰ کی اتری صورت دیکھ کر ان کے دل پر پچھتاوے کا ناگ ڈنک مارتا کہ اس وقت بیوی کے آگے کیوں پسپائی اختیار کی تھی۔

شوہر سے مایوس ہوکر ماں نے بیٹے کو فون کھڑکھڑایا، دودھ نہ بخشنے کا ڈراوہ دیا، مگر ہارون نے دوسرے ملک میں رہنے کا فائدہ اٹھایا اور اپنی پسند پر جما رہا۔

''ہارون بہت اچھا لڑکا ہے اور کوئی بھی ماں ایسے داماد کے لیے انکار کرتے ہوئے دس بار سوچے گی، مگر بھائی میری طرف سے معذرت ہے'' امتیاز احمد اس وقت شاک کی حالت میں رہ گئے جب بہن آسیہ نے نہ چاہتے ہوئے بھی بھائی سے بیٹی کا رشتہ دینے پر معذرت کرلی ان کے فون پر انکار کردیا۔

''میں جب بھی پاکستان آتی ہوں، بھابی پرانے قصے لے کر بیٹھ جاتی ہیں، جو گزر گیا سو گزر گیا، اب کیا دلوں میں رنجش لے کر بیٹھ جائیں،، وہ تو ہماری...... مری ہوئی ماں کو بھی معاف کرنے کو تیار نہیں، پھر ایسے میں وہ میری بیٹی کو دل سے کیسے قبول کریں گی''۔ بھائی نے اصرار سے انکار کی وجہ پوچھی تو وہ روتے ہوئے بولی،، بہن کے رونے پر امتیاز کی آنکھیں بھی بھر آئیں، مگر وہ حق بجانب تھی۔

زبیدہ بیگم ماضی کی کوتاہیوں کو بھلانے والی عورت نہیں تھی، امتیاز احمد اچھی طرح سے یہ بات جانتے تھے کہ بہنیں جب بھی میکے کا مان لیے ان کے گھر آئیں، ہمیشہ بھابی کی تلخ کلامی پر افسردہ ہوکر واپس گئیں۔ ایسے میں آسیہ اپنی لاڈلی اور معصوم بیٹی کو کسی امتحان میں ڈالنا نہیں چاہتی تھی۔ ان حالات میں امتیاز احمد کو مجبوراً خاموش ہونا پڑا۔

انکار کی بات سن کر زبیدہ بیگم اور ساجدہ کی تو بن آئی۔ دونوں نے خوشیاں منائیں اور سکھ کا سانس

لیا۔ مگر وہ کہتے ہیں نہ کہ جوڑے تو آسمانوں پر بنتے ہیں، زمین پر تو ان کا صرف ملن ہوتا ہے۔ ان دونوں کی قسمت کا کنکشن بھی آپس میں جڑا ہوا تھا۔ ہارون نے پھوپھو کو منا کر ہی دم لیا، آسیہ نے بھی بیٹی کی آنکھوں میں خوشی کی جو جوت جلتی دیکھی وہ اسے بجھانے کی ہمت نہ کر پائیں اور وہ ہی ہوا، جو ہارون نے سوچا تھا۔ مسلسل چار پانچ مہینوں کی کوششوں کے بعد آسیہ ہار گئیں اور بھائی سے اقرار کر بیٹھی، وہ تو جیسے جی اٹھے۔ قدرت کے فیصلے کے آگے زبیدہ بیگم اور ساجدہ کی ایک نہ چل سکی اور شادی کی تیاریاں زور و شور سے شروع ہوگئیں۔

☆......☆......☆

آسیہ بیٹی کی شادی وطن میں کرنا چاہتی تھی۔ اس لیے اپنی فیملی کے ساتھ شادی سے ایک ہفتہ قبل پاکستان آگئیں، ہارون بھی دو مہینے کی چھٹیاں لے کر واپس آگیا۔ ویسے بھی اس نے اپنی کمپنی میں درخواست دے کر ٹرانسفر یہاں کی برانچ میں کروالیا تھا۔ یوں ماہین بہار بن کر اس کی زندگی میں چلی آئی۔ وہ قدرت کی فیاضیوں پر بہت خوش تھا، کہ محبت نے اس کا ہاتھ تھام لیا تھا۔

دلہن بنی ماہین کو دیکھ کر سارے حیران رہ گئے۔ عام سے نین نقش والی سانولی سی ماہین میں آخر ایسی کیا بات تھی؟ جو ہارون جیسا خوبرو اور برسر روزگار لڑکا اس پر فریفتہ ہوگیا۔ ساجدہ اور زبیدہ بیگم کے چہرے پر طنز بھری مسکراہٹیں تھی، زبیدہ بیگم نے تو ماہین کو کافی سال قبل دیکھا تھا، مگر ساجدہ کا خوشی کے مارے برا حال تھا کہ دیورانی اس کے مقابلے میں ایویں سی ہے۔

وہ دیور کے دل کی کیا جانے، ہارون نے جو اپنے گھر میں ہونے والے روز کے تماشوں سے بیزار تھا۔ حسین ماں سے باپ کی بیزاریت دیکھی تھی۔ پھر خوبصورت بھابی کی زبان کی تیز دھار نے بھائی کی زندگی کیسے اجیرن کی تھی وہ بھی اس کی یادداشت میں تھا۔ اب اسے اپنے گھر میں زندگی کو سلیقہ بخشنے والی شریک حیات کی ضرورت تھی، شیشے کی گڑیا کی نہیں جسے وہ سجا کر رکھ دے۔

اسے یہ ساری صلاحیتیں ماہین میں نظر آئیں، اس کا گمان کچھ ایسا غلط بھی ثابت نہ ہوا، اس کے آتے ہی گھر کے ماحول میں خوش گوار تبدیلی پیدا ہوگئی۔ تاہم زبیدہ بیگم اور ساجدہ برملا کہتی پھرتی کہ ہارون پھوپو کے گھر جا کر رہتا، کھاتا پیتا تھا۔ یقیناً اس پر جادو کا اثر ہے۔ دونوں ماں بیٹیوں نے بڑا زبردست عمل کروایا ہے، پڑھی ہوئی چینی کھلائی ہوگی۔ تب ہی تو اسے ماہین کے آگے ماں بھی نظر نہیں آئی۔ اگر امتیاز احمد کے کانوں میں یہ باتیں پڑ جاتی تو وہ ان دونوں کو ڈانٹ دیتے مگر وہ کہاں کسی کی ماننے والی تھیں، تاہم ماہین ان باتوں کو ایک کان سے سن کر دوسرے سے نکال دیتی۔ اس گھر میں لانے سے قبل ہی ہارون نے ماہین کو ہر طرح کے حالات سے نمٹنے کے لیے تیار کردیا تھا۔ وہ بھی اپنے ماموں کے گھر میں خوشگوار تبدیلی کی خواہاں تھی۔

☆......☆......☆

ہارون آفس سے آتے ہی ماہین کے اردگرد پروانوں کی طرح گھومنے لگتا تھا۔ یہ بات زبیدہ بیگم کے لیے ناقابل برداشت تھی، کچھ اور نہ بن پڑا تو اس نے سارے گھر کا کام اس اکیلی نئی نویلی دلہن پر لاد دیا۔ اور وہ یہیں مات کھا گئی۔ آہستہ آہستہ پورے گھر پر ماہین کا جادو چل گیا۔ اپنی خوب سیرتی، اور نرم اندازِ گفتگو سے اس نے اپنے جیٹھ، دیور اور نند کو اپنا شیدائی بنالیا، شوہر تو پہلے ہی عاشق تھا۔

ماہین صفائی ستھرائی اور ہر طرح کی گھریلو سجاوٹ میں ماہر تھی۔ اس نے چند دنوں میں ہی گھر کا

نقشہ بدل ڈالا۔ سب اس کے ہاتھ کے ذائقے کے ایسے عادی ہو گئے کہ جس دن اس کی ضد میں ساجدہ کھانا پکاتی، سب کھانے کی میز سے تھوڑا تھوڑا کھا کر اٹھ جاتے اس پر وہ اور جل بھن جاتی۔ ساجدہ کے لیے شوہر کے منہ سے ماہین کی تعریفیں سننا بھی محال تھا۔ موسیٰ پر بس نہ چلتا تو اپنے بچوں کو پیٹنے لگتی۔

☆......☆......☆

گھر کے حالات کا جائزہ لیتے ہوئے یہ بات ماہین کے مشاہدے میں آئی کہ اس کا دیور مامون تو خاصا تمیز دار اور پڑھا کو بچہ ہے مگر نند مہوش جو جوانی کی منازل طے کر رہی تھی ماں کے بے جا لاڈ پیار سے خاصہ بگڑ گئی تھی۔ وہ ذہین تھی مگر پڑھائی کو سنجیدگی سے نہیں لیتی تھی۔ بے جا پیار و محبت نے اسے بدتہذیب بنا دیا تھا، بڑے چھوٹے کی کوئی تمیز نہیں رہی تھی۔

ماں کے سکھائے میں آ کر وہ اکثر ماہین سے بھی بدتمیزی کر بیٹھتی تھی۔ ماہین نے شروع میں تو اس معاملے میں خاموشی اختیار کی وہ جانتی تھی کہ مہوش کم عمر ہے اسی لیے اسے ابھی اچھے برے کی تمیز نہیں ہے، اس نے ہارون سے بھی اس مسئلہ پر تبادلہ خیال کیا۔ تو اس نے بیوی سے درخواست کی کہ وہ بہن کی بھلائی کے لیے جیسے چاہے اقدامات اٹھائے، اس پر پوری توجہ دے، اور ٹائم نکال کر اس کے امتحانات کی تیاری بھی کرائے، ماہین نے شوہر کی بات اپنی گرہ سے باندھ لی۔ اب وہ فارغ اوقات میں مہوش کو پڑھانے لگی شروع میں تو مہوش نے پڑھنے میں بہت نخرے دکھائے۔ مگر ماہین کا صبر و برداشت یہاں بہت کام آیا۔ مہوش کے لیے گھر میں پڑھنا ایک اچھا تجربہ ثابت ہوا، ورنہ اس سے قبل تو اس کے تعلیمی مسائل بڑھتے جا رہے تھے، بڑی کلاس تھی اور اس کی پڑھائی بہت توجہ مانگ رہی تھی، گو کہ امتیاز احمد نے اس کا ایڈمیشن ایک معیاری کوچنگ سینٹر میں کروایا تھا، مگر آئے دن کی چھٹیوں کی وجہ سے وہ صحیح طریقے سے پڑھ نہیں پاتی تھی۔ زبیدہ بیگم پڑھی لکھی نہیں تھی اس لیے وہ بیٹی کو کیا پڑھاتی البتہ نزلہ زکام ہونے پر بھی مہوش کی چھٹی کروا دیتی تھی، اب وہ اپنے مشکل سبجیکٹ بھابی کی مدد سے پڑھ لیتی، کلاس میں اس کی پوزیشن اچھی ہونے لگی، تو اسے بھی ماہین سے پڑھنے میں مزہ آنے لگا۔ وہ بھی دھیرے دھیرے بھابی کی دوست بنتی گئی۔ بھابی نے اس کو آہستہ آہستہ تمیز دار بنانا بھی شروع کر دیا، نرمی سے بات کرنا بے جا ضد نہ کرنا۔ وہ بھابی کے رنگ میں رنگتی گئی۔ اپنی دوستوں سے ہر وقت چھوٹی بھابی کی تعریف کرتی۔ ماہین تھی بھی قابل تعریف ہر ایک سے اس کے رتبے اور عمر کے لحاظ سے بات کرتی۔ اسی لیے بچے بوڑھے سب اس سے خوش رہتے۔ کام کاج میں وہ اتنی پھرتیلی تھی کہ سارے گھر کے امور بھاگ بھاگ کے نمٹاتی اور میاں کے آنے سے پہلے نہا دھو کر سج سنور کر تیار ہو جاتی۔

ہارون جب تھکا ہارا گھر میں داخل ہوتا تو بیوی کی خدمت گزاریاں اس کی ساری تکان دور کر دیتیں۔

خوشبوؤں میں بسی ہوئی بیوی پہلے اس کے ہاتھ میں آرام دہ لباس رکھتی کہ وہ آفس پہن کر جانے والے تکلف زدہ لباس سے نجات حاصل کرے، جب وہ نہا دھو کر فریش ہو کر نکلتا تو موسم کے اعتبار سے کچھ گرم یا ٹھنڈا پیش کرتی۔ کھانے پینے کے دوران اس کی دن بھر کی روداد سنتی، اس طرح اس نے ہارون کو اپنا اتنا عادی بنا لیا تھا کہ جب تک وہ اپنے دن بھر کے مسئلوں پر اس سے تبادلۂ خیال نہ کر لیتا۔ اسے بھی چین نہ ملتا۔ بعض اوقات ماہین کے دیے ہوئے مشورے اس کے آفس کے مسائل حل کرنے میں بہت مدد دیتے تھے۔ ماہین اسے تھوڑا

آرام کرنے کے بعد زبیدہ بیگم کے پاس بھیج دیتی، اور خود رات کے کھانے کی تیاری کرنے کچن میں چلی جاتی۔ ہارون کی محبت میں دن بہ دن شدت آتی جارہی تھی۔ اس کی دیوانگی دیکھ کر زبیدہ بیگم اور ساجدہ کڑھا کرتیں، مگر کچھ کر نہ پاتیں وہ دونوں سب سے بے نیاز خوشیوں کے ہنڈولوں میں جھول رہے تھے۔

☆......☆......☆

''ارے بھئی ہم سے یہ چلتر بازیاں نہیں ہوتیں کہ بازاری عورتوں کی طرح ہار سنگھار کر کے شوہر کو رجھائیں۔'' ساجدہ پلنگ پر پاؤں پسارے دھوپ سینکتے ہوئے ماہین کو نیا جوڑا پہنے دیکھ کر بولی۔ اس کے بجنے سنورنے پران لوگوں کو ہمیشہ اعتراض رہتا۔

''کیوں بھابی، جب ہم شادی شدہ خواتین، سالگراہوں، شادی بیاہ اور خاندان کی ہر تقریب کے لیے نئے کپڑے سلواتی ہیں، خوب میک اپ اور زیورات سے آراستہ ہوتی ہیں، تو پھر اس شوہر کے لیے کیوں نہ صاف ستھرے رہیں، کیوں نہ ہار سنگھار کریں جو ہمارا محرم بنایا گیا ہے۔ جس کا ہم پر پورا حق ہے۔ جسے ہم مجازی خدا کہتے ہیں۔ تو پھر اس کا دل کیوں نہ خوش کریں۔'' ماہین جانتی تھی کہ موسیٰ بھائی ساجدہ کو کس روپ میں دیکھنا چاہتے ہیں، اس لیے سمجھانے بیٹھ گئی۔

'ارے رہنے دو بھائی! ہمیں یہ پٹیاں نہ پڑھاؤ۔ ہم جیسے ہیں ویسے ہی بھلے۔' ساجدہ نے جماہی لے کر ہاتھ کے اشارے سے انکار کیا، مگر اس نے ہمت نہ ہاری۔

''کیوں بھابی! ہم بازار تک جانے کے لیے نکلتے ہیں تو بال بناتے ہیں، لپ اسٹک لگاتے ہیں نا، پھر اپنے شوہر کے لیے یہ سب کرلیں، تو کیا مضائقہ ہے۔ اس کی تو شریعت بھی ہمیں اجازت دیتی ہے۔'' ماہین نے نرمی سے اس کے پاس بیٹھ کر سمجھایا تو ساجدہ کا منہ غصے سے لال ہوگیا۔

''ہاں بھائی اب بڑوں کی تو کوئی عزت ہی نہیں رہی، تم ہمیں سمجھانے چلی ہو، جیٹھانی لگتی ہوں تمہاری۔ ویسے بھی یہ پڑھی لکھی عورتیں جو بڑی بڑی باتیں بناتی ہیں نا ان کی مکاریاں ہوتی ہیں، ہونہہ شوہروں کے ذہن پر ہر وقت سوار رہنے کے بہانے تلاشتی ہیں۔ ارے شرم وحیا بھی کوئی چیز ہے کہ نہیں۔ ان باتوں سے تم ہارون کو ہی الجھا سکتی ہو، ہم تمہارے جال میں پھنسنے والے نہیں'' ۔ ساجدہ نے سرتک لے جا کر دونوں ہاتھ جوڑے اور چیخ کر بولی پھر غصے سے اسے پرے ہٹایا، عثمان کی بہتی ناک اپنی قمیض کے دامن سے پونچھتی ہوئی وہاں سے چل دی۔ ماہین اسے تاسف سے جاتا دیکھتی رہ گئی۔

☆......☆......☆

موسیٰ کی بڑی خواہش تھی کہ ساجدہ بھی اس کے لیے ہر شام تیار ہو۔ اگر ہار سنگھار نہیں کرسکتی تو کم از کم صاف ستھری تو رہے۔ یہ ہی چیز وہ اپنے بچوں میں دیکھنا چاہتا تھا۔ سارہ، مائرہ کے بالوں میں مناسب صفائی نہ ہونے کی وجہ سے جوؤں کی بہتات تھی۔ وہ ہر آئے گئے کے سامنے سر کھجاتی رہتیں۔ ساجدہ عثمان کو سردیوں میں بند ٹوپیاں نہیں پہناتی تھی، نہ ہی اس کے پاؤں میں موزا ہوتا تھا، جس کی وجہ سے وہ مستقل نزلے کا شکار رہتا تھا۔ مگر ساجدہ کی کاہلی اسے کچھ کرنے نہ دیتی تھی۔ موسیٰ کو پہلے تو ان باتوں کا اتنا احساس نہ تھا، مگر جب سے ماہین اس گھر میں آئی تھی، وہ اپنی بیوی کا بھائی کی بیوی سے موازنہ کرنے لگا تھا، تو اس کا دل اداسیوں کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوبتا جارہا تھا۔

بھائی کو خوش باش دیکھ کر وہ بھی اپنی زندگی میں تبدیلیاں لانا چاہتا تھا، مگر ساجدہ جیسی چٹان کو ہلانا

کوئی آسان کھیل نہ تھا۔ وہ ساجدہ کو ماہین کے روپ میں دیکھنا چاہتا تھا۔ اسی لیے اکثر بھاوج کی تعریف کر بیٹھتا، جس کا ساجدہ نے ہمیشہ غلط مطلب نکالا۔ وہ دبے لفظوں میں بیوی کو سمجھانے کی کوشش کرتا مگر ساجدہ کے پتنگے لگ جاتے۔

''مجھے سب پتا ہے کہ اس جادوگرنی نے اس گھر کے ہر فرد پر جادو ٹونے کر دیے ہیں۔ تم اس کی تعریفیں کرنا چھوڑ دو ورنہ مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔ سب کی بہت چاپلوسی کرتی ہے، اس کالی کو تو میں بتاؤں گی۔'' موسیٰ گھبرا کر ساجدہ کے ہاتھ پیر جوڑنے لگتے تھے، وہ نہیں چاہتے تھے کہ اس کی آواز کمرے سے باہر جائے اور کسی کے کانوں میں پڑے۔ وہ ماہین کو اپنی چھوٹی بہن مانتے تھے۔ اس سے ویسے بھی ان کا دہرا رشتہ تھا، بھابی کے علاوہ وہ پھوپی کی بیٹی بھی تھی، مگر ساجدہ کو کون سمجھاتا۔ وہ عقل سے کوری ایک ایسی ناخواندہ عورت تھی۔ جو ہر بات میں منفی پہلو ڈھونڈنے لگتی تھی۔

☆......☆......☆

ماہین کے یہاں ایک پیاری سی بیٹی کی پیدائش نے گھر بھر میں روشنیاں سی بھر دیں۔ ہارون کے پیر تو زمین پر نہیں پڑ رہے تھے۔ اس نے ماہین کو سونے کا کنگن گفٹ کیا۔ مہوش، مامون بھی ہر وقت اس گلابی پری کو گود میں لیے پھرتے تھے۔ دادا نے بڑے پیار سے بچی کا نام ماہا رکھا۔ عقیقہ بڑے دھوم دھام سے کیا گیا۔ ہارون نے بیٹی کی پہلی تقریب پر بہت خرچہ کیا۔ ماہین بھی بہت خوش تھی۔ ساس بھی، پوتی کو لیے اسٹیج پر بیٹھی سب سے مبارک بادیں سمیٹتی رہیں، وہ سب کے سامنے بڑا پیار جتا رہی تھیں۔

''ایسا کون سا کمال کر دیا اس کالی نے، بیٹی ہی تو پیدا کی ہے، پھر کیوں پورا گھر دیوانہ بنا ہوا ہے۔ اتنی خوشی تو میرے بیٹے کی پیدائش پر بھی نہیں منائی گئی تھی۔'' ساجدہ نے عقیقے کا کھانا کھاتے ہوئے موسیٰ کو آڑے ہاتھوں لیا۔ وہ اس وقت بیوی سے الجھنا نہیں چاہتا تھا، اس لیے جلدی سے بریانی کی ڈش لے کر شامیانے کی طرف بڑھ گیا، جہاں مردوں کا کھانا چل رہا تھا۔ وہ بھی بھتیجی کی پیدائش پر بہت خوش تھا۔

تقریب کے اختتام پر امتیاز احمد نے ایک اور بم ساجدہ کے سر پر پھوڑ دیا۔ سارے رشتے داروں کی موجودگی میں انہوں نے دو سالہ عثمان کی منگنی ماہا سے کرنے کا اعلان کر دیا۔ سب لگے مبارک بادیں دینے۔ ہارون اور ماہین بھی ہکا بکا رہ گئے، ایسا تو انہوں نے سوچا بھی نہ تھا۔

''ہارون یہ سب کیا ہے؟ میری بچی ابھی بہت چھوٹی ہے، آنے والے کل کا کیا پتا، میں ایسا کچھ نہیں چاہتی ہوں؟'' اپنی شادی شدہ زندگی کا یہ پہلا شکوہ تھا، جو ماہین نے شوہر سے کیا۔

''ان باتوں کے بارے میں سوچنے کے لیے ابھی بہت وقت پڑا ہے، تم ٹینشن مت لو۔'' باپ کے اس اچانک کیے جانے والے فیصلے پر حیران تو ہارون بھی رہ گیا، مگر بیوی کو تسلی دینے لگا۔ وہ خود بھی اس واقعے سے خوش نہ تھا، مگر باپ کے چمکتے چہرے کو دیکھ کر کچھ بول نہ پایا۔ زبیدہ بیگم کو بھی شوہر کے فیصلے پر ایسا کوئی خاص اعتراض نہ تھا، اس لیے وہ اسٹیج پر بیٹھی ماہا کو گود میں لیے اور عثمان کو برابر میں بٹھا کر مسکرا کر مختلف پوز بنا کر تصویریں کھنچواتی رہیں۔ موسیٰ بھی باپ کے فیصلے پر بہت خوش تھا، البتہ ساجدہ بڑی بے قرار تھی، خاندان والوں کے آگے کوئی تماشا کھڑا نہیں کرنا چاہتی تھی اسی لیے ہونٹوں کو وقتی طور پر زبردستی بند کر لیا۔

''میں کہتی ہوں، پھوپا جی کو یہ کیا سوجھی۔ ہیں ہم سے پوچھے بغیر ہمارے بیٹے کی زندگی کا فیصلہ کیسے کر لیا؟ اور تمہارے منہ سے کچھ نہ نکلا کھڑے

مسکراتے رہے۔'' ساجدہ بند کمرے میں شیرنی کی طرح دھاڑ رہی تھی اور موسیٰ ٹانگ پہ ٹانگ رکھے گنگنا رہا تھا۔

''اب تو جو ہونا تھا ہوگیا ساجدہ بیگم، یوں ٹہل ٹہل کر زمین کیوں گھستی ہو۔ آؤ سو جاؤ۔'' موسیٰ نے پیار سے کہا تو ساجدہ وقتی طور پر چپ ہوگئی۔ جانتی تھی کہ واویلا قبل از مرگ ہے۔

'میں بھی جیتے جی یہ رشتہ ہونے نہ دوں گی، ابھی تو ویسے بھی بہت وقت پڑا ہے۔ سب کو دیکھ لوں گی۔' ساجدہ نے جیسے خود کو دلاسا دیا، اور سونے کے لیے لیٹ گئی۔

☆......☆......☆

وقت گزرنے کے ساتھ بہت سی چیزوں میں تبدیلی آ گئی، مگر نہ بدلی تو ساجدہ اور زبیدہ بیگم کی عادتیں، تم تین سال کی تھی تو ایک دن ان کے مذموم ارادے پورے ہونے کا وقت آ گیا.....''

بوا اماں نے آنکھوں میں آنے والی نمی پونچھی، وہ بہت دور سے ماضی کا سفر کرتی ہوئی اس تکلیف دہ پڑاؤ کی طرف آئی تھیں جہاں پہنچتے ہی ان کے پاؤں کے چھالے سے پھوٹ پڑے، مگر پانی آنکھوں سے جاری تھا۔ ماہا بڑے شوق سے اپنے ددھیال کی ماضی کی داستان سن رہی تھی۔

''تمہارے باپ کی پھوپو شاہینہ کے شوہر کا اچانک انتقال ہوگیا۔ امتیاز احمد بہن کے بیوہ ہونے کے غم سے نڈھال ہو گئے۔ خبر آتے ہی فیصل آباد جانے کی تیاری میں لگ گئے، موسیٰ جانا چاہ رہا تھا، مگر دکان کون سنبھالتا، مامون ابھی چھوٹا تھا۔ ان دنوں ماہین کو شدید قسم کا ٹائیفائڈ ہوا تھا، ہارون اس لیے جانے میں پس و پیش دکھا رہا تھا۔

امتیاز احمد نے اکیلے جانے کی ٹھانی، گو کہ جب سے ان کو دل کا مرض لاحق ہوا تھا، اعصاب قابو میں نہیں رہتے تھے، خصوصاً ان سے غم کی ہر خبر چھپائی جاتی تھی، مگر یہ ایسی خبر نہ تھی جو ان تک نہ پہنچائی جاتی، زبیدہ بیگم نے فوراً بی پی ہائی کا ڈراما رچایا اور جانے سے انکار کر دیا۔

''پتا نہیں کیوں تمہیں چھوڑ کے جانے کا دل نہیں چاہ رہا، تم کتنی کمزور بھی تو ہوگئی ہو، میرے جاتے ہی کچن میں لگ جاؤ گی۔'' میں چائے دینے گئی، تو تمہارا باپ ہارون ماہین سے بڑی فکر مندی سے باتیں کر رہا تھا۔'' منظر زیتون بوا کی آنکھوں میں گھوم رہے تھے۔

''ماہین بٹیا نے مامون کو اس حال میں اکیلے بھیجنا گوارا نہ کیا، ہارون کا بیگ زبردستی تیار کیا، اور آفس فون کروا کے ایک ہفتے کی چھٹی بھی منظور کروالی۔''

''آپ میری فکر چھوڑیں، اس وقت خالہ کے گھر آپ لوگوں کا ہونا ضروری ہے، پھر ماموں کا اس حالت میں وہاں اکیلے جانا مناسب نہیں، لمبا سفر ہے۔ راستے میں طبیعت وغیرہ نہ خراب ہو جائے۔ میں ٹھیک ہوتی تو ضرور آپ کے ساتھ چلتی۔ آپ میری طرف سے خالہ کو پرسا دے دیجیے گا۔'' ماہین نے محبت سے اسے سمجھایا، اور سفری بیگ تھمایا جس میں اس نے مجھ سے ضرورت کی ساری اشیاء رکھوادی تھیں۔

''اوکے! نہ چاہتے ہوئے بھی تمہیں چھوڑ کے جا رہا ہوں۔ تم اپنا اور ماہا کا بہت خیال رکھنا، جب میری واپسی ہو تو تمہاری طبیعت ٹھیک ہونی چاہیے۔'' ہارون نے ماہین کا ہاتھ تھام کر کہا اور سوتی ہوئی ماہا کو خوب پیار کیا باپ کے ساتھ فیصل آباد جانے کے لیے گھر سے نکل گیا۔ کہتے ہیں کہ اچھا وقت بادلوں کی طرح ہوتا ہے جو سورج کی تپش تک کو روک لیتا ہے۔ لیکن برا وقت وہ شفاف آئینہ ہوتا ہے

جس، میں ہر برا چہرہ واضح نظر آتا ہے۔

''میں نے بھی اس دن کچھ ایسا ہی دیکھا۔ یہ دوسرے دن کا واقعہ ہے، تمہیں بھوک لگ رہی تھی۔ تم رونے لگیں، ماہین نے مجھے آواز دی مگر تمہاری دادی سر میں تیل کی مالش کروا رہی تھی، مجھے جانے نہ دیا۔ مجبوراً ماہین اٹھ کر تمہارے لیے کھانا لینے کچن میں گئی تھی۔ کمزوری سے اس کا برا حال تھا، ویسے تو میں اسے پلنگ سے اٹھنے نہیں دے رہی تھی، مگر اس وقت مجھے بھی وہاں پہنچنے میں دیر ہوگئی اور وہ ہوگیا جو نہیں ہونا چاہیے تھا۔'' بوا اماں نے دکھ بھرے لہجے میں کہا۔

''بوا اماں وہاں ایسا کیا ہوا تھا پلیز بتایئے نا؟'' ماہا خاصی پرتجسس تھی، ان کے گھٹنے پر ہاتھ رکھ کر بولی

''بس بیٹا ماہین تمہارا کھانا پلیٹ میں نکال رہی تھی اتفاق سے، موسیٰ بھی وہاں پانی پینے آیا ہوا تھا۔ وہ فریج سے بوتل نکال کر پانی پی ہی رہا تھا کہ اس نے کچھ گرنے کی آواز سنی تو پلٹ کر دیکھا تو کھانے کی پلیٹ ماہین کے ہاتھ سے چھوٹ کر گر گئی تھی۔ کمزوری کی وجہ سے اسے بری طرح سے چکر آرہے تھے اور وہ گرنے لگی، تو انسانی ہمدردی کے تحت موسیٰ نے اسے بڑھ کر تھام لیا، قسمت کی خرابی سے ساجدہ اسی وقت کچن میں داخل ہوئی۔ یہ منظر دیکھ کر وہ اپنے آپے سے باہر ہوگئی، وہ تو ویسے ہی بہت دن سے مواقع ڈھونڈ رہی تھی، پھر کیوں نہ فائدہ اٹھاتی، اس نے شور مچانا شروع کردیا۔ پورا گھر کچن میں جمع ہوگیا،

''ارے میں تو جانتی تھی۔ تُو ہے ہی بدذات! اپنا شوہر تو اپنا ہے، دوسرے کا بھی اپنا بنانا چاہتی ہے۔'' ساجدہ نے ماہین کو دو ہنٹر مارے، موسیٰ ہکا بکا کھڑا دیکھ رہا تھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے؟ ماہین نے اپنی بڑی صفائی پیش کی مگر ساجدہ نے واقعہ کو ایسے رنگ میں رنگ دیا کہ جھوٹ پر سچ کا گمان ہونے لگا۔ اس نے ماہین بیچاری پر ایسے رکیک الزام لگائے کہ مت پوچھو۔'' بوا اماں تکلیف دہ ماضی کی باتیں دہراتے ہوئے خود بھی رنجور تھیں۔

''تایا ابا نے کچھ نہیں کہا؟'' ماہا یہ داستان سن کر کپکپا رہی تھی، اس نے بوا اماں سے جلدی سے پوچھا۔

''ارے اس نے پہلے تو زبان سے ساجدہ کو سمجھایا، مگر وہ کہاں کسی کے قابو میں آنے والی، اس نے تو دونوں پر نت نئے الزام لگانا شروع کردیے۔''

''ارے جب ہی تو تم اپنی بیوی کے ساتھ خوش نہیں ہو، تمہیں گھر میں ہی دوسری دلچسپی جو مل گئی ہے۔ اب مجھے پتا چلا کہ تم آج کل راتوں کو اٹھ کر کمرے سے باہر کیوں جاتے ہو۔'' موسیٰ نے اس کے گھٹیا الزامات لگانے پر پہلے تو اسے روکا، جب اس کی زبان بند نہ کرسکا تو جوتا اتار کر ساجدہ کو مارنا شروع کردیا۔'' بوا اماں ماضی میں کھوئی ہوئی تھیں۔

☆......☆......☆

''ارے جاہل عورت گرمی کی وجہ سے میں آج کل ہمیشہ کی طرح چھت پر سونے چلا جاتا ہوں۔ تم یہ بات جانتی بھی ہو، کتنی بار اوپر آکر تم نے خود دیکھا ہے، پھر ایک پاک دامن عورت پر ایسے الزام لگا کر کیوں اللہ کا عذاب مول رہی ہو۔'' موسیٰ اسے سمجھانے کی حتی المقدور کوشش کر رہا تھا، ماہین شرم سے گڑی جا رہی تھی، باقی سارے لوگ حیران کھڑے یہ تماشا دیکھ رہے تھے۔

''ارے میں کیا ساری رات تم دونوں کی پہرہ چوکی کرتی رہی ہوں۔ اب اس گھر میں یہ چنڈال رہے گی یا میں۔'' اس نے ماہین کو ایک ہاتھ جڑا۔ موسیٰ کی آنکھوں میں خون اتر آیا، اس نے بیوی کو مارنے کے لیے کچن کی سلیب پر پڑی چھری اٹھا لی، ساجدہ جیسی نڈر عورت ان سب باتوں کے لیے

ذہنی طور پر تیار تھی، بھاگ کر صحن میں چلی گئی اور خوب شور مچانے لگی، مامون نے بھائی کو پکڑ کر دوسرے کمرے میں بند کر دیا۔ زبیدہ بیگم نے بڑھ کر ساجدہ کو بٹھایا، پانی پلایا مگر موسیٰ کا چھری اٹھانا ایک اور جرم بن گیا۔ وہ معقول بات سننے پر تیار ہی نہیں تھی۔

''ارے میری نظروں کے سامنے میرے شوہر سے انکھیلیاں کر رہی تھی، اب یا تو اس گھر میں میں رہوں گی یا یہ جادوگرنی' بس چیخ چیخ کر ایک ہی مطالبہ کر رہی تھی۔ زبیدہ بیگم نہیں چاہتی تھی کہ گھر کی بات باہر نکلے اس لیے اسے بار بار منا رہی تھیں، مگر وہ ایسا اچھا موقع کیسے کھوتی۔

''چلو ہم نانی کے گھر جا رہے ہیں۔'' وہ اٹھ کر جلدی سے سامان باندھنے لگی، بچوں کو تیار کرنے لگی،، زبیدہ بیگم اپنے بھائی سے بہت ڈرتی تھی، اسی لیے نہیں چاہتی تھی کہ میکے میں کوئی ان بن ہو گی بہو کے ہاتھ پاؤں جوڑنے، مگر وہ کوئی معقول بات سننے کو تیار ہی نہ تھی۔

''تم یہیں رہو گی کہیں نہیں جاؤ گی۔ ہاں ماہین اب اس گھر میں نہیں رہے گی۔'' مجبوراً ساجدہ کا جلال کم کرنے کے لیے وہ وعدہ کر بیٹھی۔ وہ اس کی تیزی کے آگے دب گئیں، ساتھ دینے پر مجبور تھیں۔ وہ نہیں چاہتی تھیں کہ ساجدہ روٹھ کر میکے جائے، خاندان بھر میں اس کی ناک کٹے، وہ اچھی طرح اپنی بھتیجی کی حرکتیں جانتی تھی۔ اسے پتا تھا کہ ایک دفعہ گھر سے قدم نکالنے کے بعد وہ زمانے بھر میں کیسا ڈھنڈورا پیٹے گی، ویسے بھی موسیٰ کی چھری اٹھانے کی بات کو وہ ایسے پھیلائے گی کہ سارا خاندان اس کا ہمدرد بن جائے گا، پھر ماہین سے پرخاش بھی اس کی حمایت کرنے سے روک رہی تھی۔'' بوا نے روتے ہوئے دوپٹے سے آنسو پونچھے۔ ماں کے حالات سن کر ماہا کی بھی روتے روتے ہچکیاں بندھ گئی تھیں۔

''میں نے ساجدہ کو بہت سمجھانے کی کوشش کی مگر اس پر تو برائی سوار تھی، موسیٰ نے کمرے کا دروازہ کھلوایا اور بیوی کو قہر بھری نظروں سے گھورتا ہوا گھر سے باہر نکل گیا۔ مامون نے ہی چیخ کر بھابی کو خاموش کرایا۔ ماں سے ماہین کے لیے خوب لڑا، ان حالات کا ذمہ دار ماں کو ہی ٹھہرایا، جنہوں نے بڑی بھابی کی بے جا حمایت کر کے گھر کے حالات آج اس نہج پر پہنچا دیے۔

مہوش کی مدد سے بے ہوش ماہین کو کچن سے اٹھا کر اس کے کمرے میں لے جا کر بیڈ پر لٹایا۔ زبیدہ بیگم کو جو ماہین کے لیے تھوڑا بہت افسوس ہو رہا تھا وہ، مامون کی حمایت پر ختم ہو گیا۔ پھر رات کے اندھیرے میں انہوں نے اپنا گھناؤنا کھیل کھیلا۔ ماہین بہت رو رہی تھی اور ان دونوں خواتین کے ہاتھ پاؤں جوڑ رہی تھی۔ وہ اسے سوتے سے اٹھا کر گھر سے باہر نکالنے کے لیے لائیں۔

''پلیز مجھے ہارون سے بات کرنے دیں۔'' اس نے روتے ہوئے زبیدہ بیگم کے سامنے ہاتھ جوڑے۔

''ارے وہ میرا بیٹا ہے۔ میں جب اسے تیرے کرتوت بتاؤں گی، وہ تیرے منہ پر تھوکے گا بھی نہیں۔'' زبیدہ بیگم نے غصے سے کہا۔ ماہین روتے ہوئے بے بسی سے اِدھر اُدھر دیکھ رہی تھی۔

مامون اور مہوش بھی اپنے کمروں میں مدہوش سو چکے تھے، وہ بھلا بھابی کی کیا مدد کرتے۔

''تم اس کو مجھ سے الگ نہیں کر سکتیں، اس نے تمہاری وجہ سے میرا حکم نہ مانا، بڑا تمہاری محبت کا دم بھرنے لگا ہے۔'' زبیدہ بیگم کی زبان مسلسل گھاؤ لگا رہی تھی۔ ساجدہ نے روتی دھوتی ماہین کو دھکا دیا، وہ گرتے گرتے بچی۔

''چل بہت تماشا ہو گیا تیرا۔ جادو گرنی اب نکل اس گھر سے۔'' ساجدہ کے لہجے کی سفاکی پتھروں کے دل بھی ہلا رہی تھی۔ اس نے ماہین کو دروازے سے دھکیل کر باہر نکال دیا۔

''تمہیں اللہ کا واسطہ، میں اپنا گھر چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤں گی۔'' ماہین نے آخری کوشش کے طور پر ان کی منت کی۔ انہوں نے ماہین کی ایک نہ سنی۔

''یہ میرے شوہر کا گھر ہے۔ بڑی آئی اپنے گھر والی ہونہہ!'' زبیدہ بیگم نے اسے جھڑکا۔

''اب جا یہاں سے، ہماری زندگی عذاب بنا دی ہے''۔ ساجدہ نے منہ بنا کر کہا۔

دونوں نے روتی ہوئی ماہین کو گھر سے باہر نکال کر دروازہ بند کر دیا۔ ماہا بکا بکا بیٹھی، یہ واقعہ سن رہی تھی،

''تو وہ بچی میں تھی اور یہ ظلم میری مما پر تائی اماں اور دادی نے توڑا۔'' اس نے روتے ہوئے خود کلامی کی۔ یہ واقعہ اس کے بچپن کا تھا، جو لاشعور میں رہ گیا تھا اور خوابوں کی شکل میں نظر آتا تھا۔

''بٹیا میں تم سے یہ سب اسی لیے چھپاتی تھی، کہ تم سے ماں پر ہونے والا ظلم برداشت نہیں ہوگا۔'' بوا اماں نے اسے پانی لا کر پلایا، وہ رو رو کر ہلکان ہو رہی تھی۔

''بوا اماں آپ نے میری ماں کو ان ظالموں سے کیوں نہیں بچایا۔ وہ اتنی رات کو پھر کہاں گئیں؟'' ماہا نے آنسو پونچھ کر پوچھا۔

بیٹا، ان لوگوں نے سارا کام منصوبہ بندی کے ساتھ کیا تھا۔ میں بھی سونے کے لیے لیٹ چکی تھی، ان لوگوں نے اسٹور کا دروازہ باہر سے بند کر دیا تھا۔ جہاں میری چارپائی ڈلی ہوتی ہے۔ میں نے تو کھڑکی سے سب دیکھا، اپنی نوکری جانے کے خوف سے میں یہ سب خاموشی سے برداشت کر رہی تھی۔ غریب عورت تھی، کوئی ٹھور ٹھکانہ نہیں تھا۔ ساجدہ بیگم کے عتاب سے بچنے کے لیے خاموش تماشائی بنی رہی۔ جس کا مجھے ساری زندگی قلق رہے گا۔ ماہین کو گھر سے نکالنے کے بعد ان لوگوں نے خاموشی سے میرے دروازے کا کھٹکا کھول دیا، اور سونے چلی گئیں۔ میں جلدی سے باہر نکلی، دروازہ کھول کر ماہین کے پیچھے بھاگی، مگر وہ کہیں نظر نہ آئی، میں ایک ایک آدمی سے پوچھ رہی تھی کہ کالی چادر اوڑھے کوئی عورت تو یہاں سے نہیں گزری۔ مگر مجھے ماہین کا سراغ نہیں مل رہا تھا۔ اچانک سڑک کے درمیان بھیڑ لگی دیکھی تو دل کو کچھ ہوا، دوڑ کر وہاں پہنچی تو، ہائے ہائے میری بچی ماہین کا بری طرح سے ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا۔ غموں کی ماری دکھیاری وہ عورت دکھ اور بیماری کی حالت میں چکراتی ہوئی سڑک پر جا رہی تھی، کہ سامنے سے آنے والی گاڑی سے ٹکرا گئی۔ میرے تو ہاتھ پیر پھول گئے۔ میں نے جلدی سے ایک آدمی سے ٹیکسی منگوائی، اسے لوگوں کی مدد سے اس میں لٹایا، اس کا بہت خون بہہ رہا تھا۔

''بوا اماں، آپ میری بچی کا خیال رکھیے گا''، آخری وقت پر بھی اس کی زبان پر تمہارا ہی نام تھا، ہم اسپتال پہنچ گئے، ڈاکٹر اسے اسٹریچر پر ڈال کر ایمرجنسی میں لے گئے، مگر وہ جنت مکانی خون زیادہ بہنے کی وجہ سے دنیا سے جا چکی تھی۔

''ہائے میری بچی مجھے معاف کر دینا میں تیرے لیے کچھ نہیں کر سکی۔'' ماہین سے معافی مانگتی میں وہیں اسپتال کے ٹھنڈے فرش پر گر گئی۔ گھر فون کروا کر اطلاع دی، ماموں فوراً پہنچ گیا۔ ماہین کی موت کی خبر سن کر تمہارے دادا اور پاپا واپس آ گئے، ہارون کی حالت دیکھی نہ جاتی تھی، محبوب بیوی کی میت دیکھ کر وہ بے قابو ہوا جا رہا تھا، تمہارے دادا دل پکڑ کر بیٹھ گئے۔ عزیز بھانجی کی جوان موت اور بیٹے کے ہنستے بستے گھر کا اجڑنا، یہ دکھ ان سے برداشت نہیں ہو

رہا تھا۔ تمہارے ننھیال میں اطلاع کر دی وہ لوگ دوسرے دن ہی آ گئے، ان کا رونا دیکھا نہیں جا رہا تھا، تمہاری دادی کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ ان کے اقدام کی وجہ سے ماہین اس دنیا میں نہیں رہے گی۔ ہارون کو بھی ماں اور بھابی پر شک تھا۔ مگر ابھی وہ اپنے غم سے باہر نہیں آیا تھا کہ کوئی سوال جواب کرتا۔

تمہارے ننھیال والوں نے تمہاری ماں کی تدفین والے دن ان لوگوں سے قطع تعلق کا اعلان کر دیا۔

''یہ میرے بیٹے کا خون ہے کوئی مائی کا لعل لے جا کے تو دکھائے'' ۔تمہارے ننھیال والے تمہیں بھی ساتھ لے جانا چاہتے تھے، مگر یہاں بھی تمہاری دادی تن کے کھڑی ہو گئی۔

☆......☆......☆

''ماہین اتنی رات کو باہر سڑک پر کیا کرنے گئی تھی، کہ اسے اپنی جان سے ہاتھ دھونا پڑا؟'' سوئم کے بعد ہارون نے سب کو جمع کر کے یہ سوال اٹھایا۔ آخر وہ لمحہ آ ہی گیا جس سے تمہاری دادی ڈر رہی تھیں۔ اس نے ہاتھ جوڑ کر مہوش اور مامون کو اس دن کے واقعات دہرانے سے منع کیا تھا۔ وہ دونوں بھابی کے بعد بھائی کو کھونا نہیں چاہتے تھے اس لیے چپ رہے۔ تمہاری دادی کا چہرہ فق ہو گیا۔

''بھیا یہ بات تو ہمیں خود نہیں پتا کہ تمہاری غیر موجودگی میں اتنی رات کو وہ کس سے ملنے باہر گئی تھی؟'' ساجدہ ایک ڈھیٹ عورت تھی فوراً ہی بولی۔

''بھابی زبان سنبھال کر بات کریں۔ میں اپنی بیوی کو اچھی طرح جانتا ہوں کہ وہ کیسی تھی؟ میں نے گھر والوں کو اس کے کردار کی گواہی حاصل کرنے کے لیے آج جمع نہیں کیا، میں تو یہ پوچھ رہا ہوں کہ میرے پیچھے اس کے ساتھ ایسا کیا ہوا تھا کہ وہ رات گئے گھر سے باہر نکلنے پر مجبور ہو گئی۔'' ہارون نے میز پر زور سے مکا مارا اور دھاڑ کر بولا کہ سب ہل کر رہ گئے۔ اس کے غصہ سے ساجدہ بھی خاموش ہو گئی۔

''ساجدہ کیوں شریف عورت پر تہمت لگاتی ہو ڈرو اس دن سے جب تمہاری اللہ کے یہاں پکڑ ہو گی۔'' موسیٰ سے بھی بیوی کی لغو باتیں سنی نہیں گئیں، اسے ملامت کرنے لگا۔

''اماں میں تو اپنی بیوی اور بچی کو آپ کے حوالے کر گیا تھا نا، آپ نے ان کا خیال کیوں نہیں کیا؟ میری بیوی کو اس گھر سے کیا دکھ ملا تھا مجھے بتائیں، ورنہ سوچ سوچ کر میں پاگل ہو جاؤں گا۔'' ہارون نے اپنے بال نوچ ڈالے۔

''بیٹا مجھے خود نہیں پتا کہ ماہین گھر سے رات گئے تک کیوں نکلی تھی؟'' زبیدہ بیگم نے نظریں چرا کر کہا۔ بیٹے کی حالت دیکھی نہیں جا رہی تھی، جو کیا تھا اس پر پشیمان بھی تھی مگر اصل بات بتا کر اب بیٹے کو کھونا نہیں چاہتی تھی، بیٹے کو سینے سے لگا لیا۔ وہ ماں کا ہاتھ ہٹا کر ان سے الگ ہو گیا۔

''میرے بچے اس غم سے اب نکل آ، جانے والی تو چلی گئی ہے، ان باتوں کو دہرانے سے کچھ حاصل نہیں ہوگا'' زبیدہ بیگم نے بیٹے سے منتیں کیں۔

''اماں، آپ کو لگتا ہے کہ میں ماہین کو بھول سکتا ہوں۔ اس واقعے نے میری نیندیں اڑا دی ہیں۔ مجھے لگتا ہے وہ اب بھی میرے ارد گرد موجود ہے اور مجھ سے کوئی فریاد کر رہی ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ ماہین حادثاتی موت نہیں مری بلکہ اس گھر کے لوگ اس کی موت کے ذمہ دار ہیں، ان سب میں آپ بھی شامل ہیں۔''

ہارون نے دکھ اور بے اعتباری سے ماں کی طرف دیکھ کر کہا، زبیدہ بیگم نے سر جھکا لیا۔ ساجدہ خاموشی سے اٹھ کر کمرے سے نکل گئی۔ بوا اماں یہاں تک بتا کر ٹھہر گئیں، ان کو بہت پیاس محسوس ہو

رہی تھی، ماہا نے انہیں ٹھنڈا پانی پلایا۔

☆......☆......☆

''اس نے ایک مہینے کے اندر اندر اپنا ٹرانسفر دبئی برانچ میں کروالیا، گھر میں وہ صرف باپ سے یا ماموں سے بات کرتا، زبیدہ بیگم اسے منا منا کر تھک گئی تھی، مگراس کے دل پر گھر والوں کی طرف سے جو بال آگیا تھا وہ نہ نکل سکا۔ جانے سے ایک ہفتہ قبل اس نے امتیاز احمد سے تمہیں ساتھ لے جانے کی بات کی۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ بیٹا گھر سے کتنا متنفر جا رہا ہے، وہ بہت دکھی اور بیمار رہنے لگے تھے۔

''پہلے وہاں خود سیٹ ہو جاؤ، پھر ماہا کو لے جانا۔ ویسے بھی ابھی وہ بہت چھوٹی ہے۔ اکیلے کیسے رہے گی۔ یہاں سب اس کی دیکھ بھال کرلیں گے۔'' انہوں نے بیٹے سے درخواست کی، اس فیصلے کے پیچھے ان کا مقصد ہارون کا ناتا اس گھر سے جوڑے رکھنا تھا۔ ان کا خیال تھا، اسی بہانے تمہارا باپ یہاں آتا رہے گا۔ وہ مسلسل ٹہل رہے تھے، بیٹا باپ کی بے چینی دیکھ رہا تھا۔

''ابو، میں اپنی بیٹی کو اس گھر میں کیسے چھوڑ دوں جہاں، اس کی ماں کے ساتھ اتنا برا سلوک کیا جاتا تھا۔ سب کو پتا ہے کہ ماہین کو وہ حادثہ کیسے پیش آیا مگر کوئی مجھے بتانے کو تیار نہیں۔'' ہارون نے باپ کو کرسی پر بٹھاتے ہوئے کہا۔

''ماہا تمہاری ماں کا اپنا خون ہے، وہ اس کا خیال رکھے گی۔ پھر بوا اماں بھی ہیں نا جو ماہا کو ہر وقت سینے سے لگائے رکھتی ہیں۔ ماہین کے ساتھ جو ہوا بہت افسوس ناک تھا، مگر اب اس بارے میں جتنا کریدو گے اتنا ہی دکھ پاؤ گے۔ تم ماہا کے معاملے پر سوچ بچار کر کے مجھے جواب دینا۔'' انہوں نے امید بھری نظروں سے بیٹے کو دیکھا۔ ہارون باپ کے آگے خاموش ہو گیا۔

امتیاز احمد اس رات بہت بے چین رہے۔ وہ بیٹے کی بربادی بھلا نہیں پا رہے تھے، ہارون رات گئے تک ان کے پاس بیٹھا رہا تھا۔

''بیٹا، میری دو باتیں مانو گے، ایک ماہا کو یہاں سے لے کر نہیں جانا، دوسرا تم پھر سے گھر بسا لینا، اس بات کو میری آخری خواہش سمجھ کے مت ٹھکرانا، وہ بیٹے کا ہاتھ تھام کر رو دیے۔ ہارون اس رات ان کے پاس ہی لیٹ کر سو گیا، فجر کے وقت ان کی طبیعت خراب ہونے لگی تو گاڑی نکال کر ان کو لے کر وہ لوگ اسپتال بھاگے، راستے میں ان کو دل کا اتنا شدید دورہ پڑا کہ اسپتال پہنچنے سے قبل وہ انتقال کر گئے۔ اس خاندان کے لیے یہ دوسرا بڑا صدمہ تھا، ہارون نے اپنا جانا وقتی طور پر مؤخر کر دیا۔ پورا گھر سوگ میں ڈوب گیا۔

زبیدہ بیگم کا بہت برا حال تھا، اتنے دن تک امتیاز احمد کے سنگ جینے کی عادت جو ہو گئی تھی۔ اب گھر اچانک خالی خالی لگنے لگا تھا۔ لگتا تھا کہ ابھی کہیں سے امتیاز احمد آئیں گے اور ان سے کسی بات پر اختلاف رائے کریں گے۔ مگر اب تو صرف ان کی باتیں ہی رہ گئی تھیں۔

☆......☆......☆

وقت کا کیا ہے گزر ہی جاتا ہے۔ نئے واقعات جنم لیتے ہیں پرانے بھول جاتے ہیں۔ بالآخر وہ دن آگیا جب ہارون کو دبئی جانا تھا۔ اس نے باپ کی آخری وصیت پر عمل کرتے ہوئے دل پر پتھر رکھ کر ماہین کی نشانی کو اس گھر میں چھوڑنے کا فیصلہ کیا۔

''اس کے ایئرپورٹ نکلنے سے قبل تمہاری دادی کو احساس ہوا کہ وہ کیا کھو رہی ہیں، اسی لیے انہوں نے ہاتھ جوڑ کر بیٹے کو روکنے کی کوشش کی۔ وہ مان گیا مگر اس نے اپنی اماں کے آگے ایک شرط رکھ دی۔''

بوا اماں نے اپنے چشمے کو چادر سے صاف کر کے

دوبارہ پہنا۔

''وہ شرط کیا تھی بوا اماں؟'' ماہا نے بے چینی سے پوچھا۔

''مجھے صرف یہ سچائی بتا دیں کہ اس دن کیا ہوا تھا؟ ماہین گھر سے کیوں نکلی تھی؟'' ہارون نے ماں کا ہاتھ تھام کر سوال کیا۔

زبیدہ بیگم اس بات کا کیا جواب دیتی، پتھرائی ہوئی آنکھوں سے بیٹے کو جاتا ہوا دیکھتی رہیں۔

''اچھا اسی لیے پاپا پاکستان واپس نہیں آتے اور میں بھی کتنی پاگل ہوں پاپا کو کتنا غلط سمجھا۔ یہ ہی سوچتی رہی کہ وہ اپنی نئی زندگی میں کتنا کھو گئے ہیں کہ مجھ سے ملنے پاکستان بھی نہیں آتے'' ماہا کے سامنے سے بہت سے پردے ہٹنا شروع ہو گئے تھے۔

''ہارون بھی ضد کا پکا نکلا۔ یہاں کو دوبارہ شکل نہ دکھائی، جب بھی تم سے ملنا چاہتا تمہیں اور مامون کو ٹکٹ بھیج کر بلوا لیتا۔'' بوا اماں نے ٹھنڈی آہ بھری۔

''دونوں بھائیوں میں ہر وقت رابطہ رہتا ہے۔ جب ہی تو تمہارا چاچو تم پر کوئی زیادتی نہیں ہونے دیتا۔ ہارون تمہارے خرچے کے سارے پیسے اسی کے اکاؤنٹ میں بھیجتا ہے۔ اسے اس گھر میں کسی دوسرے پر اعتبار جو نہیں۔ ساجدہ بیگم بھی اس کے آگے ہار جاتی ہیں۔'' بوا اماں نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اس غم کو جھیلنا آسان نہیں تھا۔ آج وہ بھی اس دکھ سے آشنا ہو گئی تھی، جس کے بارے میں سوچ کر اس گھر کے کچھ لوگ ہمیشہ غمگین ہو جاتے تھے۔ ماہا بوا اماں سے لپٹ کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی، اسے لگا جیسے اس کی ماں آج ہی مری ہو۔ مگر جلد ہی اس نے اپنے آنسو پونچھ لیے، اسے اس گھر کے کچھ لوگوں سے اپنی ماں کے خون کا حساب لینا تھا۔

''مما میں تائی اماں سے آپ کے اوپر کیے جانے والے ہر ظلم کا حساب لوں گی۔'' وہ ایک دم کھڑی ہو گئی اور دل ہی دل میں ماں سے عہد کرنے لگی۔

☆......☆......☆

''ہیلو پاپا آپ کیسے ہیں، مما اور محب کا کیا حال ہے؟'' اس نے بڑے آرام سے دبئی کال ملائی، جب سے اسے اپنے باپ پر بیتنے والے غموں کا اندازہ ہوا تھا، ہارون کے لیے اس کی محبت بڑھ گئی تھی۔ ماہا کا فون آنے پر ہارون نے بہت خوشی کا اظہار کیا۔

''اللہ کا شکر ہے آپ کی مما اور آپ کا بھائی محب بھی خیریت سے ہیں۔ میری لاڈلی بیٹی کیسی ہے۔ اسٹڈی کیسی چل رہی ہے؟'' ہارون کی شفقت بھری آواز سے ماہا کے دل پر دکھوں کی بارش ہو گئی، قطرے آنکھوں سے بہہ نکلے۔ وہ تو سمجھتی تھی کہ اس کے پاپا اس سے پیار نہیں کرتے جب ہی ساتھ نہیں لے جاتے مگر وہ تو مجبوریوں کی زنجیر میں جکڑے ہوئے تھے۔ مرے ہوئے باپ سے کیا گیا وعدہ جو نبھانا تھا۔

''ہیلو! ہیلو ماہا جانو کیا ہوا۔ تمہاری آواز نہیں آرہی۔ لائن میں کوئی خرابی ہے تو میں کال بیک کرلوں۔'' اس کی خاموشی پر وہ سمجھے فون میں آواز کا مسئلہ ہو رہا ہے۔

''نہیں، پاپا، اب ٹھیک ہے نا۔ آواز آرہی ہے؟ یہاں سب خیریت ہے، آپ بتایئے کیا ہو رہا تھا؟'' وہ ذہنی طور پر پریشان تھی اس لیے سمجھ میں نہیں آرہا تھا، کہ کیا بات کرے، بس باپ کی آواز سننے سے ہی دل کو تسکین حاصل ہو رہی تھی۔

''بس بیٹا، ابھی آفس سے آیا ہوں، آپ کی مما گروسری لینے اسٹور تک گئی ہیں اور بھائی بھی ان کے ساتھ گیا ہے، میں مزے سے اپنی چندا سے بات کر رہا ہوں۔ آپ کی بہت یاد آرہی ہے۔ چھٹیوں میں ہمارے پاس دبئی آؤ گی نا؟'' ماہا کے فون سے

ان کی طبیعت بشاش ہوگئی تھی، کچھ دیر پہلے جو آفس کی تکان ان پر حاوی ہو رہی تھی وہ اڑن چھو ہو چکی تھی۔ ہارون کا لہجہ بیٹی کی محبت میں چور تھا۔

''پتا نہیں پاپا، دیکھتی ہوں ویسے بھی میں وہاں آکر بور ہو جاتی ہوں۔ یہاں تو سب ہیں نا'' اس کے دل میں باپ کی یاد ایک طوفانی لہر کی طرح اٹھی ،مگر اس نے بہانہ بنایا، اسے ایسے وقت میں یہاں سے کہیں نہیں جانا تھا، جب اس کے مقاصد تکمیل کی راہوں پر گامزن تھے۔ اسے پتا تھا کہ اس کے پاپا کی وہاں ایک اپنی لائف ہے۔ انہوں نے سالوں قبل اپنی ایک کولیگ فیروزہ سے دوسری شادی کر لی تھی۔ وہ اس کے جانے پر خوش تو ہوتے ہیں مگر اس کی دوسری مما کچھ خاموش سی ہو جاتی ہیں۔ وہ شاید ہارون کی محبت کا بٹوارا پسند نہیں کرتی یا ماہا، انہیں اپنی سوکن کی یاد دلاتی تھی۔ جب تک پاپا آفس نہیں جاتے وہ ماہا سے بات چیت بھی کر لیتی مگر ان کے آفس جانے کے بعد وہ اتنی خاموش ہو جاتی کہ ماہا کو ان سے کام کی بات پوچھتے بھی ڈر لگتا، کئی بار انہوں نے باتوں باتوں میں جتایا بھی کہ ہارون تو ابھی بھی لگتا ہے صرف ماہین کے شوہر اور ماہا کے باپ ہیں۔ محب اور ان کی باری تو ہارون کی زندگی میں بہت بعد میں آتی ہے۔'' ماہا ان کی حالت سمجھتی تھی کہ وہ ماہا کی وجہ سے عدم تحفظ کا شکار ہیں۔ اسی لیے اس نے دبئی جانا بھی کم کر دیا تھا۔

ابھی اس نے باپ سے دل بھر کے بات بھی نہیں کی تھی کہ، دادی کمرے سے باہر آگئی۔

انہوں سے اشاروں میں پوچھا کس کا فون ہے؟'' جب اس نے ہارون کا نام لیا تو آگے بڑھ کر فون لے لیا، لگیں بیٹے سے شکوہ شکایت کرنے پہلے، اپنی بیماریوں کی لمبی تفصیل سنائی، پھر ایک دم ناراض ہونے لگیں۔

''سالوں ہو گئے! تم نے صورت نہیں دکھائی۔ اب تو واپس پاکستان آجا۔'' زبیدہ بیگم کے لہجے کا درد بھی ماہا کو متاثر نہیں کر رہا تھا۔

'دادی مکافات عمل اسی کو کہتے ہیں، آپ نے میری ماں چھینی، قدرت نے آپ کا بیٹا چھین لیا'۔ ماہا نے معنی خیز نظروں سے دادی کو دیکھ کر سوچا۔ ہارون نے کیا جواب دیا ہوگا، ماہا کو اچھی طرح پتا تھا۔ دادی نے روتے ہوئے فون کی لائن کاٹ دی، اور دوپٹے کے پلو سے آنسو پونچھتی اپنے کمرے کی طرف چل دیں۔ ماہا برسوں سے یہ ہی دیکھ رہی تھی، جب بھی پاپا کا فون آتا، دادی کا ان سے پاکستان نہ آنے پر خاصم جھگڑا ہوتا۔ پھر وہ پورے دن روتی رہتی تھیں۔ اسے پہلے تو یہ بات بہت عجیب لگتی تھی، کہ جب سے اس نے ہوش سنبھالا ہے اپنے پاپا کو پاکستان آتے نہیں دیکھا تھا، انہیں جب بھی ماہا کی بہت یاد ستاتی یا اس کی چھٹیاں پڑتیں تو وہ اس کو دبئی بلوا لیتے تھے۔ بوا اماں سے سارے واقعات جاننے کے بعد اسے اندازہ ہوا تھا کہ پاپا دادی سے کس قسم کا انتقام لے رہے تھے۔ ایک ماں کے لیے اس سے بڑی تکلیف کیا ہو سکتی ہے کہ وہ اپنی اولاد کی صورت دیکھنے کو ترس جائے۔ ماہا نے فروٹ باسکٹ سے سیب اٹھا کر دانتوں سے کترا، اسے پاپا کی نہ آنے کی ضد آج بہت بھلی لگی تھی۔

☆......☆......☆

''ماہا، تمہیں پتا ہے کہ میرے بس میں ہوتو، میں تمہارے لیے آسمان سے چاند تارے بھی توڑ لاؤں۔'' عثمان کے لہجے میں محبت بول رہی تھی۔

''چھوڑیں نا ان باتوں کو۔ ابھی تائی اماں آجائیں گی تو آپ بھاگ کھڑے ہوں گے۔'' ماہا نے ناک چڑھا کر کہا۔

''ابھی تمہیں میری محبت کی شدت کا اندازہ نہیں

ہے، اسی لیے ایسی باتیں کر رہی ہو۔ ایک بار بول کے دیکھو یہ دنیا چھوڑ دوں گا۔'' عثمان اس کی آنکھوں میں دیکھ کر بولا، نوجوانی کی محبت کے نشے کا خمار اس پر چھایا جا رہا تھا۔ اس کے بے ریا لہجہ پر ماہا کا دل ایک لمحے کے لیے ڈانواڈول ہوا مگر اس نے سختی سے نادان دل کی سرزنش کی۔ مقصد کی تکمیل کے لیے یہ ہی تو صحیح وقت تھا، اس کے لیے اب باقی باتوں کی کوئی اہمیت نہیں رہی تھی۔

''بس بس بہت ڈائیلاگ بول لیے۔ اب ذرا راستہ دیجیے تاکہ میں آپ کو اپنے ہاتھوں کی اچھی سی چائے پلاؤں۔'' ماہا نے مسکرا کر اس کے بال سنوارے اور اٹھ کر جانے لگی۔

''ماہا، میں جلد ہی ابو سے بات کر کے تمہیں ہمیشہ کے لیے اپنا بنا لوں گا۔ تمہیں پتا نہیں ہے کہ ہمیشہ سے تم ہی میری سوچوں کا محور رہی ہو اور میرے دل کو یقین ہے کہ تم میری ہی دلہن بنو گی۔'' اس نے ماہا کا ہاتھ نرمی سے تھام کر اسے کچھ لمحوں کے لیے روکا۔

''بہت یقین ہے آپ کو اپنے دل پر، بس تائی اماں کی ڈانٹ کی ایک خوراک اس دل کے معاملات سدھارنے کے لیے کافی ہوگی'' ماہا نے پھر اسے چند حقیقتوں سے روشناس کرایا، کچھ جتایا، تو اس نے گھور کر ماہا کو دیکھا۔

''یہ سب تم مجھ پر چھوڑ دو۔ میں بھی ان کا ہی بیٹا ہوں، مجھے پتا ہے، ان کو کیسے ہینڈل کرنا ہے۔ مجھے تو یقین نہیں ہو رہا کہ یہ تم ہو، بہر حال ہارون چاچا کے سامنے ہماری محبت کی تکمیل کے لیے تم ہی کھڑی ہو سکتی ہو، باقی معاملات مجھ پر چھوڑ دو۔ اب ہمیں ایک ہونے سے کوئی نہیں روک سکے گا۔'' عثمان نے اپنے ساتھ ماہا کو بھی محبت کی ڈور میں باندھا۔ اس کے لہجے کا اعتماد دیکھ کر ماہا مسکرا دی۔

'یہ اعتماد ہی تو توڑنا ہے۔' تائی اماں کو بھی پتا چلنا چاہیے کہ جب دل پر ٹھیس لگتی ہے تو کیسا محسوس ہوتا ہے؟'' ماہا کو اپنے والدین کے دکھ یاد آ گئے، تو اس کی آنکھوں پر شبنم آ ٹھہری۔

اچھا تو یہاں باتیں چل رہی ہیں اور ہمارا گلا چیخ چیخ کر خشک ہو رہا ہے مگر کسی کو دھیان نہیں کہ آ کر اس بوڑھی کو بھی دیکھ لے کہ زندہ ہے کہ مر گئی۔'' زبیدہ بیگم دونوں کو باتوں میں گم دیکھ کر طنز کرنے لگیں۔

ماہا دل مسوس کے رہ گئی، آج کل اسے دادی اور تائی کی طرف دیکھنا بھی گوارا نہ تھا، مگر اس کی مجبوری تھی، جب تک وہ اس گھر میں ہے، ان لوگوں کو برداشت تو کرنا ہی تھا۔ وہ ابھی کچھ دنوں تک پاکستان میں قیام پذیر رہنا چاہتی تھی، ورنہ ان لوگوں کی شکلیں دیکھنے سے اچھا تھا کہ وہ دبئی جا کر سوتیلی ماں کو برداشت کر لیتی۔

☆......☆......☆

''ارے پھوپا جی! آپ اتنی رات کو کچن میں کیا کر رہے ہیں۔ کہیں پھوپو نے آپ کو اپنے کمرے سے نکال تو نہیں دیا۔'' ماہا نے بظاہر عزیر کو چھیڑا مگر یہ عزیر کی دکھتی رگ تھی۔ گھر داماد ہونا کوئی بہت آسان کام نہ تھا۔

''نہیں بھئی تمہاری پھوپو کا چائے پینے کا دل چاہ رہا تھا اس لیے۔'' انہوں نے پتی کا ڈبہ اور چینی کارنس پر رکھتے ہوئے بڑی بے چارگی سے اسے دیکھا۔

''اوکے آپ جائیں میں گرما گرم چائے لے کر آتی ہوں۔ ویسے آپ دونوں میں شوہر کون ہے، یہ پتا چلتا نہیں ہے۔'' ماہا نے ہنستے ہوئے ایک تیر چلایا، اور کیتلی میں چائے کا پانی بھرنے لگی، عزیر اسے حیرانی سے دیکھنے لگا۔ کچھ تو ہوا ہے ورنہ ماہا اتنی حاضر جواب اسے یقین نہیں آ رہا تھا۔

''ان کی چھوڑو اپنی بتاؤ، کیا بات ہے؟ آج تو تم بھی بڑی بدلی بدلی لگ رہی ہو۔'' اس کا اور عزیر کا

احترام کا رشتہ تھا۔ اس لیے وہ اس سے ہمیشہ بڑی محتاط گفتگو کرتی تھی۔ عزیر کو وہ بہت اچھی لگتی تھی۔ اس گھر میں عزیر کو اپنے علاوہ اس کا وجود مظلوم نظر آتا تھا۔ اسی لیے اکثر وہ اکیلے میں ماہا سے ہمدردی جتاتا تھا، کبھی ہنسی مذاق کرنا چاہا تو، ماہا کی سنجیدہ شکل دیکھ کر خود ہی محتاط ہو گیا تھا۔ آج اسے ماہا بڑی بدلی بدلی لگ رہی تھی، ڈرپوک، دبوسی ماہا کی جگہ یہ کوئی اور ہی لڑکی کھڑی تھی، جو بڑے اعتماد سے بات کر رہی تھی۔ اس کی شخصیت میں بھرے جانے والے نئے رنگوں نے اس کی دلکشی میں اضافہ کیا تھا۔

''پھوپو بھی کبھی کبھی بڑی زیادتی کرتی ہیں، بھلا بتاؤ کوئی اپنے شوہر کے ساتھ بھی ایسا سلوک کرتا ہے؟''

ماہی نے چائے کپوں میں چھانتے ہوئے ہمدردی جتائی، شاید اپنے اوپر سے عزیر کی توجہ بھی ہٹائی۔

''بس یہ ہم ہی ہیں، جو تمہاری پھوپھو جیسی خر دماغ عورت کے ساتھ گزارا کر رہے ہیں، کوئی اور ہوتا تو اب تک چھوڑ کر بھاگ چکا ہوتا۔'' عزیر نے چہرے پر زمانے بھر کی مظلومیت سجا کر کہا۔

''وہ مردوں کی اس قسم سے تعلق رکھتے تھے جو اپنی غلطیوں پر کبھی نظر نہیں رکھتے تھے اور ہر جگہ بیوی کو برا ثابت کر کے لوگوں کی ہمدردی بٹورتے تھے۔

''یہ تو ہے، آپ کا دل گردہ ہے، جو گزارا ہو رہا ہے۔'' ماہا نے مسکہ لگایا۔ کھولتے پانی میں پتی ڈالی، کیتلی میں ابلتی چائے اسے اپنے آپ سے مشابہہ لگی، اس کے دل کی کھولن بھی آخری سروں تک پہنچ چکی تھی۔

''بسکٹ بھی نکال لو تمہاری مہوش پھوپو کے مزاج کا کچھ پتا نہیں ہوتا جانے کب کس بات پر ناراض ہو جائیں کہ بھوک لگ رہی تھی، تم خالی چائے لے آئے۔'' عزیر کو خود بھوک لگ رہی تھی تو بیوی پر رکھ کر کہا اور شان سے اپنے کمرے کی طرف چل دیا، ماہا نے اس کی پشت دیکھی اور ذہن میں ایک ہی لفظ کلبلانے لگا 'بے غیرت' وہ سر جھٹک کر چائے نکالنے لگی۔

ماہا نے ٹرے میں مزید بسکٹ نکالے، چائے سجائی اور ان کے کمرے کا دروازہ بجایا۔

''ارے ماہی آ ؤ نا، میں نے تو ان سے کہا تھا۔ خیر تمہارے ہاتھ کی چائے کی تو بات ہی کچھ اور ہے۔'' خلاف توقع مہوش اچھے موڈ میں تھیں۔ ماہا بھی مسکرادی۔

''پڑھائی کیسی چل رہی ہے؟'' انہوں نے مزے سے چائے کا سپ لیا اور پوچھا۔

''جی ٹھیک ٹھاک، اب تو ایگزامز ہونے والے ہیں۔'' اس نے بسکٹ کا پیکٹ کھول کر انہیں دیا۔

''تم نے ساری اچھی عادتیں ماہین بھابی کی چرائی ہیں۔ تمہارا مزاج ماں پر گیا ہے، اپنی ماں کی طرح محبت کرنے والی سلیقہ مند لڑکی ہو۔ جب کہ تمہاری شکل وصورت بالکل ہارون بھائی کی طرح ہے۔ ویسے ہی گورا رنگ، کھڑا ناک نقشہ، اور پرکشش آنکھیں۔'' ماہا کا بغور جائزہ لیتے ہوئے انہوں نے اپنے میاں، کو مکمل طور پر نظرانداز کیا، شاید اس کے آنے سے قبل دونوں میں کوئی جنگ وجدل ہوئی تھی۔

عزیر صوفے پر لیٹا ٹی وی دیکھ رہا تھا، چائے کی طلب اسے بھی بے چین کیے دے رہی تھی، مگر ماہا کے آگے بے عزتی کا سوچ کر دل مسوس کے چپکا پڑا رہا۔ کن انکھیوں سے مہوش کو چائے پیتا دیکھ رہا تھا۔

عزیر سے اتنی دیر اپنائیت سے باتیں کرنے کے بعد اب ماہا کے لیے یہ ناممکن تھا کہ وہ اس کو چائے نہ پیش کرے۔ اس نے ایک کپ میں گرما گرم چائے نکال کر دی پھر پلیٹ میں تھوڑے بسکٹ رکھ کر پیش

کیے وہ تشکر سے اسے دیکھنے لگے۔ مہوش لاتعلق سی بیٹھی رہی، آج کل نئی جاب چھوڑنے پر اس کا عزیر سے پھر جھگڑا اچل رہا تھا۔

تھوڑی دیر بات چیت کرنے کے بعد وہ اٹھ گئی۔ اسے یہ بات بہت عجیب لگتی تھی کہ سارے زمانے کی مخالفت مول لے کر شادی کرنے والے یہ لو برڈز اب ایک دوسرے کی شکل سے بھی بیزار نظر آتے ہیں۔

☆......☆......☆

مامون کی عادت تھی رات کے کھانے کے بعد ایک کپ چائے ضرور پیتا تھا، بقول اس کے ''اگر رات کو چائے نہ پیوں تو نیند اچھی نہیں آتی۔'' زبیدہ بیگم اس کی اس عادت پر بہت کڑھتی تھی، مگر وہ ایک کان سے سن کر دوسرے سے نکال دیتا تھا۔ اسی لیے ماہا نے کپ میں اس کے لیے بھی چائے نکالی۔

''بس یار تمہاری یاد نے بے چین کر رکھا ہے، مگر تم اتنی ظالم ہو، کہ شادی کے لیے ہاں ہی نہیں کرتیں۔'' مامون نے موبائل پر پیار بھری سرگوشی کی جو کمرے میں داخل ہوتی ہوئی ماہا کے کان سے ٹکرائی۔

''ہاں ماہا بالکل ٹھیک ہے، اور بہت ہی سلیقہ مند ہے۔ مجھے یقین ہے کہ تمہارے ساتھ اس کی دوستی جلد ہی ہو جائے گی پھر تمہارا اس کا پہلے ہی اتنا قریبی رشتہ ہے اور دوسرا بننے جا رہا ہے۔'' بات کرتے کرتے مامون کے چہرے سے جیسے روشنی پھوٹ رہی تھی۔

''چاچو چائے والا! چائے گرم...... وہ موبائل ہاتھ میں لیے ٹہل ٹہل کر بات کر رہا تھا۔ کہ ماہا نے جان بوجھ کر اسے متوجہ کرنے کے لیے شور مچایا، اپنا نام سن کر وہ متجسس ہوئی، مگر چاچو اور اس کے درمیان احترام کی ایسی دبیز چادر تنی ہوئی تھی کہ پوچھنے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔

''کس سے بات کر رہے ہیں؟، جو مجھے بھی جانتی ہے؟'' اس نے الجھن سے مامون کو دیکھا جو موبائل ہاتھ میں تھامے اس کے باہر جانے کا منتظر تھا۔ اس سے قبل بھی اس نے مامون کو رازداری سے کسی سے فون پر گفتگو کرتے دیکھا تھا، مگر جان نہ سکی کہ وہ کس سے بات کرتے ہیں۔

''لگتا ہے چاچو کی کوئی گرل فرینڈ ہے۔ اچھا ہے نا جیہ پھوپو سے جان چھوٹ جائے گی۔'' ماہا نے دل ہی دل میں اندازہ لگایا اور سونے کے لیے چل دی۔

☆......☆......☆

''ماہا ذرا پانی تو پلانا'' دادی نے تخت پر لیٹے لیٹے آواز لگائی۔ ماہا سامنے بیٹھی اپنے لمبے بالوں میں بوا اماں سے تیل لگوا رہی تھی، جلدی میں کھڑی ہوئی تو بوتل لڑھک گئی، سارا تیل گر کر پھیل گیا۔ بوا اماں اس کی صفائی میں لگ گئیں۔

''ہاں بھئی جی بھر کے نقصان کرو۔ تمہاری ماں تو خزانے چھوڑ کر مری ہے نا'' دادی اٹھ کر بیٹھ گئیں اور غصہ سے بولیں۔

''ماں تو نہیں، مگر میرے پاپا...... جو ہر مہینے مامون چاچو کے اکاؤنٹ میں ہزاروں روپے بھیجتے ہیں۔ وہ آپ لوگوں کے لیے کسی خزانے سے کم تو نہیں۔ جب وہ یہ پیسے میرے حوالے کرتے ہیں، تو آپ لوگ بہانے بہانے سے نکلوا لیتے ہیں کہ گم نہ ہو جائیں، چوری نہ ہو جائیں یا پھر یہ کہ اتنے پیسوں کا میں کیا کروں گی؟، جبکہ میرے سارے خرچے اس گھر سے پورے ہو رہے ہیں، اور پاکٹ منی کے نام پر مجھے چند ہزار روپے پکڑا دیے جاتے ہیں۔ بقول تائی اماں کے مہنگائی بہت ہے، گھر کا خرچہ چلانا مشکل ہو رہا ہے۔ ماہا کی شادی کے لیے پیسے بھی جمع کرنے ہیں نا۔ ہونہہ کیا مجھے یہ ساری باتیں پتا

نہیں ہیں کہ وہ اپنے پیسہ چھپا کر رکھتی ہیں اور زیادہ تر خرچہ ان ہی پیسوں سے ہوتا ہے جو میرے پاپا بھیجتے ہیں۔'' وہ غصے سے پھٹ پڑی۔ اتنے دن کا لاوا غلط وقت پر غلط جگہ پھٹا، زبیدہ بیگم جیسے بولنا بھول گئیں، لیکن دادی کو جواب دے کر اس کا دل جیسے مطمئن ہو گیا۔

''تیرے منہ میں بڑی لمبی زبان آگئی ہے، واہ بھئی واہ یہ صلہ دیا ہماری محبتوں کا۔'' ہوش کی دنیا میں واپس آتے ہی زبیدہ بیگم نے واویلا کرنا شروع کر دیا۔

''کیوں...... کیا میں انسان نہیں ہوں۔ آپ لوگ تو چاہتے ہیں میں گونگی بنی رہوں۔'' بوا اماں ہاتھ دبائی رہ گئیں، مگر وہ کمر پر ہاتھ رکھ کر دادی سے سوال جواب پر تل گئی۔ زیتون اسے گھسیٹ کر کمرے میں لے گئیں، آج انہیں اپنی جلد بازی پر غصہ آرہا تھا، نہ وہ ماہا کو ماضی سے آگاہ کرتی نہ جھرنے جیسی شفاف ماہا کے اندر سے یہ منتقم مزاج لڑکی برآمد ہوتی۔

''ماہا۔ بس اب یہ ہی سننا رہ گیا تھا، موسیٰ کے ابا مجھے بھی اپنے پاس بلا لو، اب مجھے نہیں جینا۔ اس گھر کا بچہ بچہ اب میرے منہ لگنے لگا ہے۔'' وہ زور شور سے بولنا شروع ہوئیں، ماہا کو اندر سب آوازیں آرہی تھیں، مگر آج وہ اندر سے مطمئن تھی اس لیے بالکل نہیں ڈری۔ آرام سے ریموٹ اٹھا کر ٹی وی دیکھنے لگی۔

گھر میں داخل ہوتے ہوئے مامون نے سب کچھ دیکھا اور سنا، اس کے لیے ماہا کا لہجہ اور رویہ لمحہ فکریہ تھا۔ اس نے پہلے اماں کو پانی پلایا اور خاموش کرا کے بستر پر لٹایا، پھر ان کے پاس بیٹھ کر ان کے پاؤں دبانے لگا۔ وہ یہ تو جانتا تھا کہ اس گھر میں ماہا کے ساتھ زیادتی ہوتی ہے، جب ماہا کو کپڑے بنانے ہوتے، کالج کی فیس دینی ہوتی یا کتابیں خریدنی ہوتی تو اچانک مہنگائی بڑھ جاتی۔ مانگنے پر ساجدہ بھابی، ضرورت کے مقابلے میں آدھے پیسے دیتیں، مگر جب فرمائش ان کے بچوں کی ہوتی تو معلوم ہوتا کہ سستا زمانہ آگیا ہے۔ بڑے آرام سے ان کے پرس کا منہ کھل جاتا۔ منہ مانگی رقم دی جاتی۔ ماہا کے معاملے میں گھر والوں کے غلط رویے کی انہوں نے ہمیشہ مخالفت کی ہے۔ اسی لیے مامون نے ماہا کا زیادہ تر خرچہ خود ہی اٹھایا، مگر اس کے منہ سے شکوہ شکایت سن کر انہیں حیرت کے ساتھ دکھ ہوا۔ زبیدہ بیگم جیسی بھی سہی اس کی ماں تھیں، وہ کسی کو بھی ان سے بدتمیزی کرنے کی اجازت نہیں دے سکتا تھا۔ پھر معصوم سی ماہا کا یہ روپ اس سے برداشت نہیں ہو رہا تھا، وہ تو اسی روپ میں اچھی لگتی تھی۔ سب سے محبت کرنے والی، نرم گفتار، اسی لیے وہ ماہا کو سمجھانے کے لیے، اس کے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

☆......☆......☆

''ماہا اب تو میری جاب بھی ہو گئی ہے، میں چاہتا ہوں کہ اماں سے تمہارے لیے بات کروں؟''

عثمان نے استری اسٹینڈ پر مامون کے کپڑے استری کرتی ماہا کو مخاطب کیا۔

''آپ، تائی اماں سے...... میرے بارے میں کیا بات کرنا چاہتے ہیں؟'' ماہا نے تجاہل عارفانہ سے کام لیا، حالاں کہ وہ جانتی تھی کہ عثمان اس سے شادی کے حوالے سے بات کر رہا ہے۔ اسے اس مقام تک لا کر وہ اب کنی کترا رہی تھی، آج کل ساجدہ بیٹیوں کی شادی کے مسئلے پر خاصی پریشان تھیں۔ آئے دن وہ بیٹیوں کو سجا سنوار کے رشتے داروں سے ملنے نکل پڑتیں، خصوصاً ایسے گھروں میں ان کے چکر بڑھ گئے تھے جہاں جوان اور ہونہار بیٹے موجود تھے، مگر ان کی دال ابھی تک کہیں گلی نہ تھی۔

ان کے بھائی کا بیٹا بھی بہت ہونہار تھا، مگر انہیں خود سے بیٹی کا رشتہ مانگنے میں لاج آرہی تھی۔ اسی لیے وہ چاہ رہی تھیں، کہ بیٹیوں کا خاندان سے ہی کوئی اچھا رشتہ آجائے تاکہ انہیں بھائی کے آگے جھکنا نہ پڑے۔ زبیدہ بیگم نے بھی انہیں اکسایا تھا کہ وہ ایک بیٹی کا رشتہ تو میکے میں کرے، مگر اس معاملے میں ساجدہ ابھی تک ناشاد تھیں۔

تائی کے مشن امپاسبل پر نکل جانے کا فائدہ ماہا کو ہو رہا تھا۔ وہ پہلے کے مقابلے میں عثمان کی ہر ضرورت کا زیادہ خیال رکھتی۔ آئے دن عثمان کی پسند کی کوئی نہ کوئی ڈش بناتی، آفس سے آتے ہی اسے گرم چائے پکڑاتی، پھر اشاروں کنایوں میں اسے یہ احساس دلاتی کہ یہ سب وہ اس کی خاطر ہی تو کر رہی ہے۔ اس تبدیلی پر عثمان کے پاؤں زمین پر نہیں پڑ رہے تھے، کہیں تو ماہا اس سے سیدھے منہ بات نہیں کرتی تھی کہیں اب اتنی خوش آئند تبدیلی، عثمان کا برسوں کا خواب پورا ہونے جا رہا تھا۔ ورنہ اسے دیکھ کر ماہا جیسے بدکتی تھی، اس کی ساری امیدوں پر پانی پھر جاتا تھا۔

''یار میں اپنی اور تمہاری باقاعدہ منگنی کی بات کر رہا ہوں۔'' عثمان سوچوں کی نگری سے واپس آکر پیار بھرے لہجے میں بولا۔

''دیکھ لیں، تائی اماں کبھی نہیں مانیں گی، بلاوجہ ساری بات مجھ پر ڈال دی جائے گی، ماہا نے قمیض ہینگر میں لٹکاتے ہوئے خدشات کا اظہار کیا۔

''اس کی تم فکر نہ کرو میں نے سب سوچ لیا ہے، پاپا اس معاملے میں میرے ساتھ ہیں۔ ویسے بھی آفس والے مجھے اب ہاؤس الاؤنس دے رہے ہیں، اگر اماں نہیں مانی تو میں تمہیں لے کر الگ ہو جاؤں گا۔'' عثمان جن راہوں پر خواب سجائے چلا جا رہا تھا ان سے لوٹنا اس کے لیے اب بہت دشوار تھا۔ وہ اپنی خوشیوں میں اتنا مگن تھا، کہ اسے ماہا کی معنی خیز مسکراہٹ بھی نظر نہیں آئی۔

''تائی اماں...... اپنے پیاروں سے الگ ہونے کا مزہ آپ بھی تو چکھیں۔'' اس نے آنکھوں میں آئے ہوئے آنسوؤں کو سختی سے رگڑ کر پونچھا۔ اب وہ کمزور نہیں رہی تھی، بلکہ ماں کا غم اس کے اندر سرائیت کر گیا تھا۔ عجیب بات ہے ناکہ دکھ تو انسان کو توڑ پھوڑ ڈالتا ہے، مگر اس غم نے ماہا کو بہت مضبوط بنا دیا تھا۔ برائی کے خلاف لڑنے کی طاقت دی تھی۔ بس ایک عثمان کے معصوم دل کو توڑنے کا سوچ کر ہی اس کا دل ڈول سا جاتا۔

☆......☆......☆

''بوا اماں۔۔ یہ پھوپو اور عزیر پھوپا کا کوئی جوڑ نہیں تھا، پھر ان کی شادی کیسے ہوگئی؟'' مہوش کے کمرے سے عزیر کے چلانے کی آواز کچن تک آرہی تھی، اس کا پھر پیسوں پر بیوی سے جھگڑا ہو رہا تھا۔ سب لوگوں ان باتوں کے اتنے عادی ہو گئے تھے کہ اب ان کے بیچ میں کوئی بولتا بھی نہیں تھا۔ ماہا جو بریانی دم دے رہی تھی، رائتے کے لیے پودینہ کاٹتی بوا اماں سے متجسس لہجے میں پوچھا۔

''ارے بیٹیا کیا پوچھتی ہو۔ مہوش کی شادی کی عمر نکلتی جا رہی تھی۔ شروع میں تو بہت رشتے آئے، مگر زبیدہ بیگم اور ساجدہ کو کوئی بھاتا ہی نہیں تھا، وہ دونوں ہر رشتے میں مین میخ نکالتی رہتیں۔

اگر جاننے والے مہوش کی شادی کی بابت سوال کرتے، تو ان کا یہ ہی جواب ہوتا۔ ''بھئی ہماری اکلوتی بیٹی ہے ایسے ہی راہ چلتوں سے ہاتھ تھوڑی پکڑا دیں گے۔'' ایک وقت تک تو اچھے رشتے آتے رہے، پھر اس سلسلے میں کمی واقع ہونا شروع ہوگئی، بوا اماں نے دہی پھینٹتے ہوئے کہا۔

''دادی کو خیال نہیں تھا کہ، ان کو بیٹی کی شادی

صحیح وقت پر کر دینی چاہیے'' بریانی دم دینے کے بعد اب وہ سلاد کے لیے کھیرا کاٹتے ہوئے بولی۔

''بیٹا جب قسمت خراب ہو تو ایسا ہی ہوتا ہے۔ زبیدہ بیگم کی آنکھوں پر تو جیسے پٹی سی بندھ گئی تھی۔ وہ ساجدہ کی چکنی چپڑی باتوں میں آ کر اپنی بیٹی کا مستقبل تباہ کرنے میں لگ گئی۔ اور یہ ساجدہ حرفوں کی بنی اس نے کبھی کسی کا بھلا نہ چاہا۔ اس کی خواہش ہی نہ تھی کہ مہوش کی شادی ہو، اسے پتا تھا کہ وہ اکلوتی بیٹی ہے، شادی پر لاکھوں کا خرچہ ہوگا۔ ان کی دکان کی حالت اب پہلے جیسی نہیں رہی تھی۔ ساجدہ نے موسیٰ کے منع کرنے کے باوجود اپنے بھائی کو نیا کاروبار شروع کرنے کے لیے قرضے کی مد میں خاصی بڑی رقم دے دی تھی۔ کاروبار سے معقول رقم نکل جانے کی وجہ سے کاروبار پر برا اثر پڑا، اسی لیے اس کی نظریں اب بڑے صاحب کی دکان پر لگی ہوئی تھیں۔ ساجدہ کے بھائی نے بھی بہن کی میکے کے لیے اندھی محبت سے پورا پورا فائدہ اٹھایا، اور دونوں ہاتھوں سے لوٹا، ایسے قرضے لیے جس کی ادائیگی آج تک نہ ہو سکی۔

موسیٰ کی اس بات پر بیوی سے بہت دنوں تک تو تو میں میں بھی ہوئی مگر وہ ساجدہ ہی کیا جس کو عقل کی بات سمجھ میں آ جائے۔ گو کہ مامون نے اس گھر کا خرچہ اچھی طرح سے سنبھال لیا تھا، پھر تمہارے لیے بھیجے جانے والے ہارون کے پیسوں سے بھی ساجدہ اچھی خاصی کٹوتی کر لیتی ہے، مگر جہاں پھوہڑپنے کا راج ہو وہاں تو قارون کا خزانہ بھی کم پڑ جائے۔ ساجدہ کی لالچی طبیعت، مہوش کی شادی پر لاکھوں روپیہ خرچ کرنا اسے محال لگ رہا تھا۔ موسیٰ بڑے بھائی کی حیثیت سے اس مسئلے پر بہت پریشان تھے، اگر وہ کوئی رشتہ ڈھونڈ کر لاتا، بھابی باتوں باتوں میں مہوش کے سامنے اس میں اتنے عیب نکالتی کہ مہوش فوراً انکار کر دیتی۔ وہ اپنے شریک حیات میں ذرا سی کمی بیشی برداشت کرنے کو تیار نہ تھی۔ اگر اس وقت میری ماہین زندہ ہوتی تو اس گھر کو یہ دن نہ دیکھنے پڑتے۔''

بوا اماں نے ٹھنڈی سانس بھر کر رائتہ فریج میں رکھا۔

''دادی کیوں آنکھ بند کر کے بیٹھی تھیں، انہیں بیٹی کی بربادی نظر نہیں آ رہی تھی۔'' ماہا نے سلاد بنانے کے بعد ہاتھ دھوتے ہوئے حیرت سے پوچھا۔

''بس بیٹا جب برائی آنی ہو تو عقل بھی کام کرنا چھوڑ دیتی ہے، ان ہی مسئلوں کی وجہ سے مہوش کی شادی کی عمر نکل گئی، پھر وہ قدرے فربہ بھی ہو گئی تو زبیدہ بیگم نے ہوش کے ناخن لیے۔

مہوش اپنی شادی نہ ہونے کا ذمہ دار ماں کو ٹھہراتی تو اس کی چھوٹے بھائی مامون سے بحث ہو جاتی، وہ ہمیشہ ماں کی سائیڈ لیتا۔

اکڑ ختم ہوئی تو زبیدہ بیگم نے ہر آئے گئے سے اچھا لڑکا ڈھونڈنے کی درخواست شروع کر دی۔ ان حالات میں مہوش کا چڑچڑاپن پورے گھر کو پریشان رکھتا۔ ساجدہ بھی اس کی زبان کی دھار سے پریشان رہنے لگی۔ اکثر چھوٹی چھوٹی باتوں پر دونوں میں جم کر مقابلہ ہوتا۔'' بوا اماں نے مسکرا کر ماضی کا نقشہ کھینچا، تو ماہا بھی ہنس دی۔ وہ سمجھ سکتی تھی کہ جب وہ دونوں لڑتے ہوں گے تو کیسا گھمسان کا رن پڑتا ہوگا۔

''مہوش پھوپو کو یہ ہیرو ٹائپ پھوپا کہاں سے ٹکرا گئے؟'' ماہا نے ہنستے ہوئے پوچھا۔

''عزیر، مہوش کے آفس میں اس کے جونیئر اسسٹنٹ کے طور پر اپائنٹ ہوا، وہ ایک غریب گھر کا لڑکا تھا۔ اس کی اچھی شکل صورت ہی اس کی واحد خوبی تھی اسی لیے اس نے، اپنے سے کہیں بڑی مہوش کو شارٹ کٹ سمجھا۔

مہوش کی تنخواہ اس کے مقابلے چار گنا زیادہ تھی، اپنی گاڑی، اچھے علاقے میں بڑا سا مکان، یہ ساری باتیں عزیر جیسے نکمے کے لیے بڑی پرکشش ثابت ہوئیں۔ اسی لیے اس نے اپنی غریب خالہ کی بیٹی سے منگنی توڑ دی۔ اور مہوش کو اپنی لچھے دار باتوں کے جال میں ایسا پھانسا کہ مت پوچھو، مہوش بھی بڑھتی عمر اور موٹاپے کی وجہ سے مستقبل سے خوف زدہ اپنے معیار سے نیچے آگئی۔

یوں یہ بیل منڈھے چڑھی۔ عزیر کے گھر والوں کی مرضی کے بغیر یہ شادی انجام پائی۔ ان سب نے بڑے پھولے منہ سے بیٹے کی شادی میں شرکت کی۔ زبیدہ بیگم کو بیٹی نے مجبور کر دیا تھا۔ سو انہوں نے خاموش رہنے میں ہی عافیت جانی۔ ساجدہ بھی خوش تھی کہ بلا سر سے اتری، مگر اس کے خواب ادھورے رہ گئے۔'' بوا اماں نے رات کے لیے آٹا گوندھتے ہوئے بتایا۔

''وہ کیسے بوا اماں؟'' ماہا کو مہوش کی کہانی سننے میں بڑا مزا آ رہا تھا۔

مہوش رخصت ہو کر سسرال گئی، مگر اس غریب علاقے کے سہولتوں سے ناپید گھر میں اس کا دل ایک دن نہ لگا۔ وہ کون سا سسرال کی من چاہی بہو تھی۔ انہوں نے بھی دنیا دکھاوے کے لیے، نئی دلہن کے نخرے ایک مہینے تک برداشت کیے، اس کے بعد بیٹے سے کہہ دیا کہ وہ اس بگڑی عورت کو مزید برداشت نہیں کر سکتے۔ اس لئے اپنے لیے الگ گھر کا انتظام کر لو۔ عزیر کی تو دلی مراد پوری ہو گئی وہ دونوں جہیز کا بھاری بھر کم سامان باندھے یہاں لوٹ آئے۔ مہوش کا دل بھی سسرال کے چھوٹے سے گھر میں نہیں لگ رہا تھا، سو لوٹ کے بدھو گھر کو آئے۔'' بوا ماں موڈ میں تھیں، ساتھ ساتھ منظر کشی بھی کرتی جا رہی تھیں، ماہا مزے لے کر سن رہی تھی۔

''تائی اماں نے کیا کہا، وہ تو بڑی پریشان ہوئی ہوں گی'' ماہا نے پلیٹیں صاف کرتے ہوئے پوچھا۔

''بظاہر تو نند کو ہنس کر خوش آمدید کیا، ظاہر ہے، اب اس کو یہیں رہنا تھا بگاڑ پیدا نہیں کر سکتی تھی، لیکن ایک دن وہ اپنی بہن سے بات کر رہی تھی جو اتفاقاً میں نے سن لی اس سے اس کے دلی جذبات کا اندازہ ہوا'' بوا اماں نے آٹا ڈبے میں بند کر کے فریج میں رکھا۔

''کیا بول رہی تھیں؟'' ماہا نے کچن کی صفائی کرتے ہوئے پوچھا، اب سارا کام ختم ہو گیا تھا۔ اس کی عادت تھی وہ کھانا پکا کے کچن صاف کر کے باہر نکلتی تھی۔

''مجھے تو پہلے ہی پتا تھا یہ لڑکی کوئی نیا چاند چڑھائے گی۔ یہ ہم لوگوں کی طرح نہیں جو سسرال میں ہنسی خوشی گزارا کر لے۔

ارے یہ تو پھوپھی کی بگڑی اولاد ہے، دو دن بھی سسرال والوں کے ساتھ گزارا نہ ہو سکا۔ ہم تو ان کے پورے ٹبر کو ساتھ لے کر چلیں۔'' اس نے اپنی بہن رعنا سے دل کا درد رویا۔ جل کے اپنی بہن کو فون پر سسرال کی نئی رپورٹ دیتی رہی۔

''ارے شوہر کتنا بے غیرت ہے، جو دانت نکال کر سسرال میں پڑا ہوا ہے، تیار ہو کر کمرے سے یوں نکلتا ہے جیسے اس کے باپ کا گھر ہو۔'' ساجدہ نے غصے سے دانت کچکچائے، بوا نے اس کے لہجے کی نقل اتاری۔

دل میں کپٹ رکھنے والی ساجدہ، سب کے سامنے مہوش اور عزیر کے واری صدقے جا رہی ہوتی۔ یوں اب مہوش کو یہاں رہتے ہوئے سالوں گزر گئے ہیں، وقت میں تبدیلی آگئی نہیں آئی، تو عزیر میاں، میں ان کی وہ ہی عادتیں ہیں۔ مہوش کی تنخواہ سے مزے اڑاتا، ہر نئی نوکری چھوڑ کے بیٹھ

جانا، صبح دیر تک سونا پھر بن سنور کے دوستوں میں نکل جانا۔ وقت کے ساتھ ساتھ مہوش میں اس کی دلچسپی بھی ختم ہوتی جارہی ہے۔ اب تو وہ جب بھی گھر جاتا ہے، والدین اس سے پوتے، پوتی کا مطالبہ کردیتے ہیں۔ بہو کے خلاف بیٹے کے کان بھرتے ہیں، اسی لیے جب وہ واپس آتا ہے، تو کئی دن تک موڈ آف رکھتا ہے، اکثر مہوش سے تو تو میں میں ہوتی رہتی ہے۔ مجھے تو لگتا ہے کہ اب اسے اپنے اس فیصلے پر بھی افسوس ہونے لگا ہے۔ اسی لیے وہ مہوش سے کترانے لگا ہے، اسے کہیں ساتھ لے کر باہر گھومنے نہیں جاتا۔ اس بات کا ادراک مہوش کو بھی ہو رہا ہے، اسی لیے وہ اپنے مستقبل سے خوف زدہ رہنے لگی ہے'' بو اماں نے اظہار افسوس کرتے ہوئے اپنی عادت کے مطابق وہ باتیں بھی ماہا سے کر بیٹھی، جو انہیں نہیں کرنی چاہیے تھی، ماہا نے منہ سے کچھ نہ بولا، مگر وہ گہری سوچ میں پڑگئی۔

☆......☆......☆

عثمان ابھی ابھی آفس سے آکر ساجدہ کے پاس بیٹھا تھا، ماں بیٹے کے بالوں میں پیار سے ہاتھ پھیر رہی تھیں کہ ماہا چائے کے ساتھ گرم کباب لے کر اندر داخل ہوئی۔ اس نے بڑی بے تکلفی سے عثمان سے حال چال پوچھا اور چائے پیش کی، اصرار سے اس کو کباب کھلایا۔ ساجدہ بیگم کا منہ تو کھلا کا کھلا رہ گیا۔

''ماہا چل جا۔ ہمارے لیے بھی چائے لے آ۔''

ان کے اندر برداشت کا مادہ بہت زیادہ نہیں تھا۔ فوراً ہی اسے جھڑکا۔

''امی پلیز سارہ باجی سے بول دیں ماہا کو دادی کے ساتھ سامنے والوں کے یہاں درس میں جانا ہے۔'' عثمان دوٹوک انداز میں خبر دی۔

''تمہیں کیسے پتا چلا کی یہ لوگ سامنے والوں کے گھر درس میں جارہے ہیں۔ ویسے تو دو دن سے میری طبیعت خراب ہے۔ اس کی تمہیں خبر نہیں، مگر کون کہاں جارہا ہے، تمہیں سب پتا ہے اور تم کہاں چلیں رات کا کھانا کون بنائے گا؟'' نہ چاہتے ہوئے بھی وہ بیٹے کے سامنے تلملا کر بولیں۔

''افوہ امی بات کا بتنگڑ نہ بنائیں، میں اندر آتے ہوئے دادی کے کمرے کے سامنے سے گزرا تو انہوں نے بولا تھا کہ سامنے درس میں جانا ہے، ماہا کو بھیج دوں''۔ عثمان ایک دم ماں پر بگڑ گیا اور بہت غصے سے بولا تو وہ ایک دم خاموش ہوگئیں، بس ماہا کو گھورنے لگیں۔ ان کا بس چلتا تو وہ اسے کچا چبا جاتیں، مگر سامنے بگڑے تیور کے ساتھ بیٹا بیٹھا تھا، ساری دنیا سے لڑنے والی ساجدہ بیٹے کی نظروں میں اپنا امیج خراب نہیں کرنا چاہتی تھیں۔ ویسے بھی جب سے عثمان کی اتنی اچھی جاب لگی تھی، وہ ہواؤں میں اڑنے لگی تھیں۔

رعنا کا میاں کسٹم میں بہت اچھے عہدے پر فائز تھا، اس نے بڑی بہن کو بارہا بہت اچھے جہیز کا لالچ دے کر اپنی بیٹی کی شادی عثمان سے کرنے کی بات کی تھی۔ بیٹے کی کامیابیوں کو اب تو کیش کرانے کا موقع آیا تھا وہ، اسے کھونا نہیں چاہتی تھیں۔ مگر بیٹے کا کیا کرتیں، جس کی نگاہیں تو سوائے ماہا کے کچھ دیکھتی نہیں تھیں۔

''ماہا سے شادی تو میں مر کر بھی نہیں ہونے دوں گی'' انہوں نے دانت کچکچا کے اپنا عہد دہرایا۔

اچھا تائی اماں! میں جارہی ہوں، مائرہ آپی سے بولیے گا رات کی روٹیاں بنالیں، میں نے سالن پکا دیا ہے۔'' ماہا نے مسکرا کر کہا، اور تائیدی نظروں سے عثمان کی طرف دیکھا۔ اس نے آفس سے واپسی پر عثمان کے کان میں درس میں جانے کی بات ڈال دی تھی، اور آنکھوں میں آنسو بھر کے یہ بھی بتادیا تھا

کہ تائی اماں کام کی وجہ سے اسے جانے نہیں دیں گی۔ وہ ہی ہوا، مگر عثمان نے دادی کا بہانہ بنا کر ماں کے سامنے اس کے لیے اسٹینڈ لیا، یہ ماہا کی بڑی کامیابی تھی۔

''تم جاؤ آرام سے یہاں اور لوگ بھی ہیں کام کرنے کے لیے۔ کوئی مسئلہ نہیں ہے۔'' عثمان نے اسے جانے کا اشارہ دیا۔ تو وہ مسکرا کر ساجدہ کو دیکھتی ہوئی، کمرے سے باہر نکل گئی۔

''شاباش ہے بیٹا، کیسے دوسری لڑکی کے لیے ماں بہنوں کے خلاف بول رہا تھا، شرم تو نہیں آتی نا، ساجدہ چیخ کر بولیں۔

بہنوں کے خلاف نہیں، ان کے بھلے کے لیے بول رہا ہوں، آپ کی نظریں صرف ماہا پر ہی رہتی ہیں۔ کبھی ماہرہ، سارہ باجی پر بھی دھیان دیا کریں، آج کل ماہرہ کالج سے کتنا لیٹ آرہی ہے، اگر میں کچھ بولوں تو وہ آپ کی اجازت کا بہانہ بنا کر میرا منہ بند کر دیتی ہے۔ ابو کو وہ لوگ آپ کی شہ پر کچھ سمجھتی نہیں ہیں، سارہ باجی کی شادی کی عمر نکلی جارہی ہے۔ آپ کو کچھ اپنے گھر کی فکر ہے یا صرف دوسروں کے معاملات پر ہی نظر رکھیں گی۔'' عثمان نے ماں کے سامنے جیسے پنڈورا باکس کھول ڈالا، تو وہ بھی سوچ میں پڑ گئیں۔

''ارے اتنا ہی خیال ہے، بہنوں کا تو کوئی رشتہ کیوں نہیں ڈھونڈتے'' بیٹے نے جیسے ان کے دماغ کی گرد جھاڑ دی، پریشانی سے بولیں۔

''ان کی سستی کاہلی اور زبان درازی کی وجہ سے کوئی ان کا رشتہ لے کر نہیں آتا، میں کیا لوگوں سے اپنے منہ سے بولوں، پلیز اب اس گھر میں ایک اور منحوس پھوپو نہیں بننی چاہیے۔ عثمان نے سنجیدگی سے وہ مسئلے اٹھائے، جس کا انہیں ادراک تو تھا مگر بیٹیوں کی برائی نہ سن سکیں۔

''کم بخت! جب تُو خود بہنوں میں اتنے عیب نکالے گا، تو باہر والوں سے کیا شکوہ کریں۔'' انہوں نے عثمان کو جھاڑنا، شروع کیا تو وہ غصے سے باہر نکل گیا۔ اسے تو ڈانٹ کر انہوں نے چپ کرا دیا مگر بعد میں سوچا تو احساس ہوا کہ وہ صحیح بول رہا ہے۔ ان کے میکے میں دونوں بیٹیوں کے جوڑ کے اتنے لڑکے ہیں، مگر کسی نے بھی آج تک ان سے رشتہ کی بات نہیں کی۔ حالاں کہ انہوں نے ہمیشہ اپنے بھائی بہنوں کے ہر برے وقت پر جان و مال سے مدد کی۔ کوئی بھی ان کے احسانات کو جھٹلا نہیں سکتا۔

''بڑے بھیا سے سارہ کے لیے بات کرنا ہی پڑے گی، آخر ان کا بیٹا تو قیر ڈاکٹر بن گیا ہے۔ اس کی پڑھائی کے لیے میں نے کتنی دفعہ بھائی کو پیسے دیے ہیں۔ یہ ہی وقت تو ہے واپسی کا۔'' انہوں نے خود کلامی کی اور پرسکون ہو کر ٹی وی پر ساس بہو کے ڈرامے دیکھنے لگیں، یہ ان کا من پسند مشغلہ تھا۔

☆......☆......☆

''مامون بیٹا، اب تُو بھی شادی کر لے، دیکھ ساجدہ اپنی بہن سے تیری شادی کرنا چاہتی ہے۔ میں نے زندگی کی سب سے بڑی غلطی ساجدہ کو موسیٰ سے بیاہ کر کی ہے، جب سے وہ اس گھر میں آئی میرے بیٹے کے ہونٹوں سے ہنسی غائب ہو گئی۔ اب میں دوسری بہن کو لا کر اپنی غلطی دہرانا نہیں چاہتی۔'' ساجدہ کہیں باہر گئی ہوئی تھی موقع دیکھ کر زبیدہ بیگم نے بات چھیڑی۔ مامون ان کی گود میں سر رکھے لاڈ اٹھوا رہا تھا۔

''کیا!!! بھابی کا دماغ تو ٹھیک ہے؟، انہوں نے ایسا سوچا بھی کیسے؟ میں اس فیشن زدہ لڑکی سے کبھی شادی نہیں کروں گا جسے سوائے مختلف چینل زیر ڈرامے دیکھنے کے دوسرا کوئی کام نہیں۔'' مامون نے چیخ کر کہا۔ اور اٹھ بیٹھا۔

میں بھی تو یہ ہی سمجھا رہی ہوں کہ تو کوئی لڑکی پسند کرلے، ورنہ یہ دونوں بہنیں مل کر میرے سر کے بچے کھچے بال بھی نوچ لیں گی۔'' زبیدہ بیگم نے ہنس کر کہا، اور پاندان گھسیٹ کر پان لگایا، اور کلّے میں دبالیا۔

''جو آپ سے بھابی اپنی، بہن کے لیے بولیں گی، تب آپ ان سے کیا کہیں گی۔'' مامون نے شرارت سے ماں کو چھیڑا۔

''میں سب سے کہہ دوں گی، کہ بھئی میں تو لڑکے کی پسند کے آگے مجبور ہوگئی۔ اب جوان لڑکے پر زور زبردستی تھوڑی تھوپ سکتی ہوں۔ وہ انکار کررہا ہے تو میں کیا کروں؟'' زبیدہ بیگم نے پیار سے اس کے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے سمجھایا۔

''واہ اماں، بیٹے کو بھی چال پیچ سکھا رہی ہیں۔'' مامون ہنسنے لگا، ماں کے پاندان سے سونف کے چند دانے نکال کر منہ میں ڈال لیے۔

''کیا کروں بیٹا، یہ ساجدہ ایسی بلا ہے، جو میرے بچوں کی خوشیاں کھا گئی۔ میں اس کی زبان کے آگے مجبور ہو جاتی ہوں۔ ہارون سے جدائی اب مجھ سے سہی نہیں جاتی، مگر سوچتی ہوں کہ اگر اسے اصل بات پتا چل گئی تو وہ کبھی بھی لوٹ کے نہیں آئے گا۔ ان کے چہرے پر پچھتاوے کی گہری چھا گئی۔

مامون نے ہاتھ تھپتھپا کر انہیں تسلی دی۔ وہ جانتا تھا کہ اس کی ماں زبان کی کڑوی ہے، مگر ساجدہ بھابی کی باتوں میں آکر انہوں نے جو ماہین بھابی کے ساتھ کیا اس جرم کا احساس انہیں راتوں کو رلاتا ہے۔ ماہا کے لیے بھی ان کی سختی دکھاوے کی ہے کیوں کہ وہ جانتی ہیں، جس دن انہوں نے ماہا سے ہمدردی جتائی ،ساجدہ اس کی اور دشمن بن جائے گی۔ ماہین والے واقعہ کے بعد اب وہ اس گھر میں کوئی نیا تماشا نہیں چاہتی تھیں۔

''اچھا اماں فرض کریں، میں جو لڑکی پسند کروں وہ آپ کو پسند نہ آئے تو پھر۔'' مامون نے پیش بندی کی۔

''ارے میرے بچے تیری پسند ہوگی، میں کیسے انکار کروں گی، اللہ تجھے خوشیاں دکھائے۔ بس اپنی زندگی میں ہی تجھے آباد دیکھنا چاہتی ہوں۔'' انہوں نے عثمان کا ماتھا چوم لیا، آنکھیں بھر آئیں تو اپنے دوپٹے کے کنارے سے پونچھ ڈالیں۔

''ٹھیک اماں، شادی میں اپنی پسند سے کروں گا، مگر وعدہ کریں، کہ آپ میری پسند کو خوشی خوشی اپنالیں گی''۔ مامون نے کچھ سوچ کر مسکراتے ہوئے کہا۔ اور ماں کو گدگدی کرنے لگا۔

ارے پگلے اتنی دیر سے میں بھی، تو یہ ہی سمجھا رہی ہوں تجھے'' انہوں نے ہنستے ہوئے وعدہ کیا۔ مامون مطمئن ہوگیا پہلا مرحلہ تو طے پایا۔

☆......☆......☆

''آپی آپ کے لیے چائے لائی ہوں'' وہ کئی مہینوں سے مائرہ کو چپکے چپکے رات گئے فون پر باتیں کرتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔ آج چائے دینے کے بہانے اس کے کمرے میں داخل ہوئی۔

''کس نے مانگی تھی، تم سے اس وقت چائے؟'' مائرہ نے جلدی سے موبائل آف کیا اور غصے سے بولی۔

''ارے سردی ہو رہی تھی میں نے اپنے لیے بنائی، تو سوچا آپ کو بھی پلا دوں کچھ برا کیا گیا، مگر آپ اتنا گھبرائی ہوئی کیوں لگ رہی ہیں۔'' ماہا نے جانچتی ہوئی نظروں سے انہیں دیکھا۔

''کچھ نہیں ہے، میں کیوں گھبراؤں گی، چلو تم جاؤ میں چائے پی لوں گی۔'' اس نے ماہا کو جھاڑ پلائی، اب اس کا اعتماد لوٹ آیا تھا۔

''جاتی ہوں مگر پلیز آپ مجھے چھوٹا سا فیور دے

دیں۔ مجھے اپنی کالج فرینڈ سے نوٹس کے سلسلے میں بات کرنی ہے، پلیز اپنا سیل فون دیجیے گا۔'' ماہا نے اسے بغور دیکھتے ہوئے کہا۔

''نہیں میں تمہیں اپنا فون نہیں دے سکتی، تم لینڈ لائن سے کال ملا لونا۔'' اس نے گھبرا کر سیل فون اپنے پیچھے چھپالیا۔

''کیا ہو گیا ہے، کتنی کنجوس ہیں نا آپ۔ ایک کال نہیں کروا سکتیں۔'' ماہا ہنستے ہوئے اس کے کمرے سے نکل گئی۔

''دوسروں کو بدکردار ثابت کرنے والی، تائی اماں کچھ اپنے گھر کی خبر بھی لے لیں۔'' اس نے بے خبر سوتی ہوئی ساجدہ سے سرگوشی میں کہا، جو صوفے پر ٹی وی دیکھتے دیکھتے سو چکی تھیں۔

☆......☆......☆

''ماہی بیٹا میں نہا کے آتا ہوں۔ ڈرائنگ روم میں فرید حسن بیٹھا ہے، پلیز بوا اماں سے کہہ کر اسے ایک کپ چائے بھجوا دو۔'' مامون نے دھلا ہوا تولیہ اٹھایا اور تیزی سے واش روم میں گھس گیا۔

ماہا نے چائے نکالی اور بوا کو آواز لگائی، پتا چلا کہ وہ سبزی لینے گئی ہیں۔ مجبوراً خود ہی سر پر آنچل ڈال کر چائے دینے ڈرائنگ روم کی طرف بڑھ گئی۔ ماہا کو دیکھ کر فرید کے دل کی کلی کھل اٹھی۔ وہ کتنے دن سے ماہا سے بات کرنا چاہتا تھا۔ آج کل اس کے گھر والے اس پر شادی کے لیے زور لگا رہے تھے۔ وہ اس موقع کو ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا، اس لیے جب ماہا چائے رکھ کر جانے لگی، تو پیچھے سے پکار بیٹھا۔

پلیز اگر آپ برا نہ مانیں تو میری ایک بات سن لیں، فرید حسن صوفے سے اٹھ کھڑا ہوا اور لجاجت سے بولا، ماہا نے نظر اٹھا کر پہلی بار غور سے اسے دیکھا۔ اس کا رنگ سانولا تھا، مگر لمبا قد اور متناسب ناک نقشہ دیکھنے والے کی آنکھوں کو بھلا لگتا تھا، پھر وہ پڑھا لکھا جاگیردار تھا، کوئی بھی اس کی شخصیت سے مرعوب ہو سکتا تھا۔ ماہا چاہتی تھی کہ وہ جلد از جلد اپنا مدعا بیان کر دے، تا کہ وہ باہر جا سکے، کیوں کہ چاچو اسے یہاں کھڑا دیکھ لیتے تو شاید انہیں اچھا نہیں لگتا۔

''جو بھی کہنا ہے جلدی سے بولیں، تا کہ میں باہر جاؤں۔'' فرید کو تذبذب میں دیکھ کر وہ خود ہی بول اٹھی۔

''دراصل میں بہت سالوں سے آپ کو من ہی من میں چاہنے لگا ہوں، بتایا اس لیے نہیں کہ میرے دل میں آپ کا احترام میری محبت سے بڑھ کر ہے، چور راستوں کا میں قائل نہیں۔ سیدھے اور سچے راستے سے آپ تک آنا چاہتا تھا، پھر مجھے مامون بھائی کا احترام بھی ملحوظ تھا۔ اب جبکہ گھر والے میری شادی کرنا چاہتے ہیں، تو میں آپ کا رشتہ بھیجنا چاہتا ہوں۔ اگر آپ کو کوئی اعتراض نہ ہو، اسی لیے پہلے آپ سے اجازت لینا چاہتا تھا۔'' اس نے نظریں جھکا کر اتنے مؤدب انداز میں کہا کہ ماہا کی ہنسی نکل گئی۔ باہر کھٹ پٹ کی آواز آئی۔

''اوکے! مجھے کوئی اعتراض نہیں مگر جب تک میں آپ سے خود رشتہ بھیجنے کا نہیں کہوں اس بات کا ذکر کسی سے نہیں کریئے گا۔ چاچو سے بھی نہیں۔'' اس نے جیسے فرید حسن کو زندگی لوٹا دی،، وہ تو ذہنی طور پر انکار سننے کے لیے تیار تھا، حیران نظروں سے ماہا کو دیکھتا رہ گیا، وہ ہمیشہ کی طرح مسکراتی ہوئی بہت پیاری لگ رہی تھی فرید حسن کا حوصلہ بڑھا۔

''آپ مجھ سے اس نمبر پر رابطہ کر سکتی ہیں'' جلدی سے اپنا کارڈ نکال کر ماہا کو تھمایا، تو ماہا کو اس کی عقلمندی اچھی لگی، واقعی وہ کس طرح سے اس سے رابطہ کرتا۔ ماہا نے کارڈ مضبوطی سے تھام لیا، ٹرے اٹھائی اور تیزی سے باہر نکل گئی۔

''شاید اللہ بھی مجھ پر مہربان ہو گیا ہے، جب ہی میرے راستے بناتا جا رہا ہے'' ماہا نے سر اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھا اور مسکرائی۔ سفید وزیٹنگ کارڈ پر کالی روشنائی سے فرید حسن کا نام اور نمبر چمک رہا تھا۔

☆......☆......☆

ساجدہ بہت دکھی دل کے ساتھ گھر میں داخل ہوئی، آج اس کے میکے کا مان ٹوٹ گیا۔ ان لوگوں نے اس کی بیٹیوں کے لیے ٹکا سا جواب دے دیا، جن کے پیچھے وہ ہمیشہ سایہ دار درخت بن کر کھڑی رہی۔ وہ بڑی امید لے کر بھائی کی چوکھٹ تک گئی تھی مگر وہاں سے انکار لے کر واپس آئی۔ اس نے بھائی کے سامنے دامن پھیلایا کہ وہ اس کی بڑی بیٹی کا رشتہ اپنے ڈاکٹر بیٹے سے قبول کرلیں، مگر اس کا دل اس وقت ٹوٹ گیا جب بھاوج نے بڑی بے مروتی سے بتایا کہ وہ تو اپنے بیٹے کی شادی کسی ڈاکٹر لڑکی سے کرے گی۔ جبکہ اس کی بیٹی تو صرف انٹر پاس ہے۔ اسے دکھ اپنی بھاوج سے زیادہ بھائی کے رویے پر ہوا جس نے بیوی کے آگے ایک لفظ بھی نہیں بولا، یہ وہ ہی بھائی تھا، جس کے کاروبار میں پیسہ لگانے کے لیے اس نے اپنے شوہر کی دکان اجاڑ دی تھی۔ آج وہ ہی منہ پھیر کے بیٹھ گیا۔ اسی لیے وہ بغیر چائے پیے غصہ کا اظہار کرتی ہوئی بھائی کے گھر سے نکل پڑی۔ گاڑی میں بیٹھ کے بہن کے گھر فون کرنے لگی کہ بھابی کی بے مروتی کی داستان سنائے، تو دیکھا موبائل تو بھائی کے گھر رہ گیا ہے۔

''گاڑی جمشید بھائی کے گھر لے چلو'' ڈرائیور کو گاڑی موڑنے کے لیے کہا تاکہ وہاں سے موبائل لے سکے۔ دروازہ کھلا تھا، وہ اندر داخل ہو گئی، بھائی بھابی وہیں بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ جہاں کچھ دیر قبل وہ بھی موجود تھی۔

''آخر ساجدہ باجی اپنی بیٹیوں کو سمجھاتی کیوں نہیں، دوسروں پر باتیں بناتے ہوئے تو ان کی زبان نہیں رکتی۔'' بھائی کے منہ سے اپنا نام سن کر ساجدہ کے اندر کی طرف بڑھتے قدم تھم گئے۔

''چھوڑو نا تم ان کی بچپن سے ایسی ہی عادت ہے، بس سب پر رعب جمائی رہتی ہیں'' بھائی نے پلیٹ سے اٹھا کر نمکو منہ میں ڈالی جو ساجدہ کو چائے کے ساتھ پیش کی گئی تھی۔

''ارے یہ آپ لوگوں کی دی ہوئی شہہ ہے یا ان کے سسرال والوں کی کمزوری جو وہ ہر ایک کے معاملات میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتی ہیں۔ وہ کس منہ سے میرے بیٹے کا نام لیتی ہیں، میں کوئی بھولی تھوڑی ہوں۔ سب جانتی ہوں کہ انہوں نے اپنے سسرال میں کیسی کیسی سازشیں رچائی ہیں۔'' بھابی غصے سے ساجدہ کو برا بھلا کہہ رہی تھی، ساجدہ بے حس و حرکت دروازے پر کھڑی، اپنے پیاروں کے خیالات جان رہی تھیں۔

''چھوڑو نا ناہید تم بھی کیا پرانی باتیں لے بیٹھی ہو۔'' بھائی بور ہونے لگا تو اس نے بیوی کو ٹالا۔

''ارے ایسے کیسے جانے دوں، سارہ تو ماں سے بھی دو ہاتھ آگے ہے، بہو بن کے میرا ہی گھر اجاڑ دے، نہ بھئی ماں نے کوئی سلیقہ، تمیز و تہذیب نہیں سکھائی۔ مجھے تو وہ بچی ماہا بہت پسند ہے کیسی طریقے سلیقے والی کامیدن بچی ہے۔ میں تو توقیر کا رشتہ اس کے لیے دے دیتی مگر آگے سے آپ کی ہٹلر بہن جو ہنگامہ مچائے گی تو اس بچی کا جینا بھی دشوار ہو جائے گا۔'' وہ جوش سے اٹھ کر بیٹھ گئی، ماہا اسے بہت پسند تھی جب بھی نند کے گھر جاتی اسے کام میں جتا دیکھ کر افسردہ ہو جاتی۔

''ارے ایسی بات منہ سے بھی نہ نکالنا، وہ عثمان کی بچپن کی منگ ہے، تم چھوڑو نا یہ باتیں کیا باجی کا پیچھا لے کر بیٹھ گئی ہو'' جمشید نے بیوی کو تنبیہ کی، وہ

بہن کو اچھی طرح جانتا تھا اس لیے سمجھایا۔
''واہ باجی تو بڑی گھنی ہیں کبھی اس بات کی خبر نہ ہونے دی، مجھے چھوڑیں، بھول گئے کہ اس دن آپ کی بہن رعنا کیا بتا رہی تھی کہ اسد نے مائرہ کو کسی لڑکے کے ساتھ اکثر بائیک پر گھومتے دیکھا ہے، مگر باجی سے کون بولے۔ وہ تو کبھی اپنی غلطی مانیں گی نہیں الٹا میرے بیٹے اسد کے پیچھے لگ جائیں گی کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے۔ جب وہ بہن ہو کر ان کو ایسا سمجھتی ہیں تو میں تو پھر بھاوج ہوں جو ہوتی ہی بری ہیں۔'' ناہید میاں کے اور نزدیک بیٹھ کر بڑی نند کے بخیے ادھیڑنے لگی۔ زندگی میں پہلی بار ساجدہ عجیب سے خوف اور بے چینی کا شکار ہوئیں۔ بغیر موبائل لیے، کسی سے بات کیے، وہ جلد از جلد بھائی کے گھر کی دہلیز یوں پار کر گئیں جیسے ان کے پیچھے بھوت لگ گئے ہوں۔

☆......☆......☆

''ساجدہ مجھے تم سے ایک ضروری بات کرنی ہے'' آج موسیٰ بڑے دنوں کے بعد ماہا اور عثمان کی شادی کی بات کرنے بیوی کے کمرے میں آئے تھے۔ ماہین والے واقعے کے بعد سے انہوں نے الگ کمرے میں سونا شروع کر دیا تھا، مگر ساجدہ جیسی گھمنڈی عورت پر اس سزا سے بھی کوئی فرق نہیں پڑا تھا، وہ بڑے ٹھسے سے زندگی گزار رہی تھی۔ شروع میں گھر والوں نے ان کے جھگڑے کو ختم کرانے کی کوشش بھی کی مگر ایک تو موسیٰ کا دل بیوی سے خراب ہو چکا تھا۔ وہ تو بچوں کی وجہ سے موسیٰ نے ساجدہ کو طلاق نہیں دی ورنہ اس کا گناہ قابل معافی نہیں تھا۔ دوسرے ساجدہ بھی اپنی انا کے خول میں بند ہو گئی، اسے شکوہ تھا کہ اس کا شوہر ہمیشہ دوسروں کا مداح رہا۔ اس نے کبھی ساجدہ پر بھرپور توجہ نہ دی۔

موسیٰ کی آواز سن کر پہلی بار ساجدہ تیزی سے اٹھیں، اور گلے لگ کر زار و قطار رونے لگیں۔ آج انہیں شوہر کی اہمیت کا اندازہ ہو رہا تھا۔
''کیا بات ہے سب خیریت تو ہے، کس بات پر اتنا رو رہی ہو۔'' پہلے تو موسیٰ ہکا بکا کھڑے رہ گئے، پھر انہوں نے بیوی کو بیڈ پر بٹھا کر پانی پلایا، اور پوچھا۔
ساجدہ نے رو رو کر بھائی کے گھر ہونے والی ساری باتیں بیان کیں۔
''بچوں کو آپ کی سختی کی ضرورت ہے، خصوصاً مائرہ ہاتھوں سے نکلی جا رہی ہے۔ ورنہ میں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہوں گی، اس نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔ موسیٰ نے قدرت کا انصاف دیکھا، یہ وہ عورت تھی جو کسی کے سمجھانے سے نہ سمجھتی تھی، مگر بات جب اس کے اپنے بچوں کی بربادی کی آئی تو کیسے بلبلا اٹھی۔
''مجھے عثمان نے مائرہ کے معاملے کی پہلے ہی خبر دے دی تھی۔ میں نے اس کی صحیح سے خبر لی ہے، میرا انہیں خیال کہ اب وہ کسی لڑکے کے ساتھ دکھائی دے گی۔'' موسیٰ نے بیوی کو تسلی دی، تو اس کے دل کو اطمینان ہوا۔ ممنون نظروں سے شوہر کو دیکھا، اسے اپنے سر کے سائیں کی اہمیت کا اندازہ آج ہوا تھا۔ ورنہ بیٹی کی بدنامی کے خیال سے ہی کلیجہ منہ کو آ رہا تھا۔
''ساجدہ اگر تم! سوچو تو تم نے جو کچھ ماہین کے ساتھ کیا ہے، اب ان باتوں کا نتیجہ سامنے آ رہا ہے۔ کوئی کیکر بو کر گلاب کی تمنا کیسے کر سکتا ہے؟'' موسیٰ نے ہاتھ ملتے ہوئے افسردگی سے کہا۔
''لو جی! ماہین کے معاملے میں میرا کیا قصور تھا؟ وہ تو تھی ہی، جادوگرنی۔'' اپنی غلطی ماننا اتنا آسان نہیں ہوتا۔ وہ بھی ساجدہ جیسی عورتوں کے

لیے واپس اپنے جون میں آتے ہوئے لگیں، صفائیاں پیش کرنے۔

''ساجدہ بیگم تم نہیں سدھرو گی۔ ابھی بھی تم اس مظلوم عورت کو ہی الزام دے رہی ہو، زرا اپنے دل میں جھانک کر دیکھو کہ کون قصور وار ہے!'' انہوں نے بیوی کو آئینہ دکھایا، ساجدہ نے مزید کچھ کہنا چاہا مگر موسیٰ نے ہاتھ اٹھا کر اسے خاموش کرا دیا۔

''اب گزری باتوں کو بھلا دو اور حال کو سنوارنے کا سوچو، عثمان میرے پاس آیا تھا۔ وہ ماہا سے نکاح کرنا چاہتا ہے۔ رخصتی بہنوں کی شادی کے بعد کروائے گا۔ یہ بتاؤ اماں اور ہارون سے تم بات کرو گی کہ میں بات کرلوں۔'' موسیٰ نے انہیں بغور دیکھا اور عثمان کی خواہش کے بارے میں بتایا۔

''کیا! ایسا سوچنے کی عثمان کی ہمت کیسے ہوئی؟ میں ایسا کبھی نہیں ہونے دوں گی۔ میرے دل میں عثمان کی شادی کے بڑے ارمان ہیں، مگر ماہا میری بہو بنے ایسا کبھی نہیں ہوسکتا۔'' ساجدہ بیگم کے تو سر سے لگی تلوے تک جا پہنچی، وہ غصہ میں ٹہلنے لگی، ساتھ ساتھ ماہا اور ماہین کو بھی کوستی جا رہی تھیں۔

''اب ماضی کی راکھ مت کریدو، ورنہ وہ شعلہ بھڑک کر تمہارے دامن کو بھی جلا بیٹھے گا۔'' موسیٰ آج صرف اپنی کہنے کے موڈ میں تھے۔

''تم اگر بیٹے کو کھونا نہیں چاہتی ہو تو اس رشتے کے لیے ہاں کردو، ورنہ جیسے اماں ہارون کی صورت دیکھنے کو ترس گئی ہیں، تمہارا بھی وہی انجام ہوگا۔ ویسے بھی تمہارا اکلوتا بیٹا ہے جو فیصلہ کیے بیٹھا ہے، ماہا کے لیے وہ اس گھر کو بھی چھوڑ دے گا۔ ٹھنڈے دل سے سوچو، بچی آنکھوں کے سامنے پلی ہے، ہر ایک اس کے سلیقے طریقے کی تعریف کرتا ہے۔ بڑھاپے میں تمہاری خدمت کرے گی، کوئی اور تیز طرار آگئی تو اکلوتے بیٹے کو لے اڑے گی، تم ہاتھ ملتی رہ جانا۔''

موسیٰ نے انہیں ان ہی کی ذہنیت کے حساب سے آنے والے برے وقت سے آگاہ کیا۔

''مگر میں نے تو عثمان کے لیے رعنا کی لڑکی لینے کا کہا ہوا ہے۔'' ان کا لہجہ ٹوٹا پھوٹا سا ہو گیا تھا۔ موسیٰ کی باتوں نے انہیں بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا ویسے بھی وہ ابھی ابھی میکے کے ٹرانس سے باہر آئی تھیں۔

''آفرین ہے تم پر! میں نے تمہاری جیسی میکہ پرست عورت نہیں دیکھی۔ تم ابھی بھی ان ہی لوگوں کے بارے میں سوچ رہی ہو۔ جنہوں نے ہمیشہ تم سے فائدہ اٹھایا، کبھی تمہارے فائدے کا نہیں سوچا۔ اگر رعنا! مائرہ کی خالہ بن کر سوچتی تو تمہاری بیٹی کا پردہ رکھتی۔ سارے خاندان میں اس کے بارے میں باتیں پھیلا کر بدنام کرنے کی جگہ، تم سے، یا مائرہ سے ڈائریکٹ بات کرتی۔'' موسیٰ غصے میں ایک دم تیز ہو کر بولے تو ساجدہ کی بولتی بند ہوگئی۔ ساجدہ کی آنکھوں سے آنسو گرنے لگے، موسیٰ نے بھی اپنا لہجہ دھیما کیا۔

''دیکھو، شاید قدرت بھی تمہیں اپنے گناہوں کے ازالے کے لیے ایک موقع فراہم کر رہی ہے تم ماہا کو اپنی بہو بنالو۔ اس گھر کے بہت سے ٹوٹے رشتے دوبارہ جڑ جائیں گے۔'' موسیٰ نے اس کے دونوں ہاتھ تھام کر پیار سے سمجھایا، اس کے آنسو پونچھے اور پانی پلایا۔ ساجدہ کو تھوڑا قرار آیا تو اسے اپنے قریب بٹھا کر اس کا ہاتھ سہلانے لگے۔

دیکھو بی بی برائی کی مثال ایسی ہے جیسے کہ ہم سیڑھیوں سے نیچے جا رہے ہوں، اترتے ہوئے تو بڑے آرام سے نیچے پہنچ جاتے ہیں مگر خود کو پستی میں کھڑا پاتے ہیں۔ مگر اچھائی کا سفر مشکل ہوتا ہے، جیسے سیڑھیوں سے اوپر کی طرف چڑھنا، جیسے جیسے اوپر جاتے ہیں قدم تھکنے لگتے ہیں، لیکن اختتام سفر پر

ہم بلندی تک پہنچ جاتے ہیں۔ اس لیے اچھائی کے لیے اگر اپنی اندر کی برائی سے بھی لڑنا پڑے تو لڑو'' موسیٰ نے ان کی آنکھوں میں دیکھ کر کہا۔

ساجدہ نے ڈبڈبائی نظروں سے شوہر کی طرف دیکھا، جس کی قدر اس نے ساری زندگی نہ کی۔ اب وہ ہی غمگسار بنا حوصلہ بڑھا رہا تھا۔

''اگر تم سمجھ لو تو یہ ہی فلسفہ حیات ہے، اب فیصلہ تمہیں کرنا ہے۔ برائیوں سے مزید دامن آلودہ کرنا ہے۔ یا اچھائی کی طرف قدم بڑھانا ہے۔'' اسے سوچنے کا موقع دے کر موسیٰ کمرے سے باہر نکل گیا۔

☆......☆......☆

''مہوش پلیز آفس جانے سے پہلے میری ایک بات سن لو، مجھے تم سے کچھ کہنا ہے۔'' عزیر بہت سنجیدگی سے مہوش سے مخاطب ہوا۔ اس کے والد بہت بیمار تھے، وہ ایک ہفتہ ان کے پاس رہ کر آیا تھا، جب سے واپس آیا تھا تو، بڑا بدلا بدلا اجنبی سا لگ رہا تھا۔

''آفس سے واپسی پر بات کرتے ہیں۔ ابھی میری ایک اہم میٹنگ ہے'' مہوش نے جلدی سے الماری میں سے بیگ نکالا، گاڑی کی چابی اٹھائی اور دروازے کی طرف قدم بڑھا دیے۔

''نہیں جو بات میں کرنے جا رہا ہوں، شاید اس سے زیادہ اہم تمہارے لیے کوئی دوسری بات نہیں ہوگی۔'' عزیر نے اس کا ہاتھ پکڑ کر روکا اور کمرے کا دروازہ بند کر دیا، عزیر کے ہاتھ لہجے کی طرح سرد تھے۔ اس کے بدلے انداز پر مہوش کا دل دھڑکا، وہ متوحش سی ہو کر شوہر کو دیکھنے لگی۔ کسی انہونی کا احساس اسے صبح سے ہی ہو رہا تھا، اسی لیے فرار حاصل کرنے کے لیے جلدی دفتر روانہ ہو رہی تھی۔ مگر جس سے نظریں چرا رہی تھی وہ لمحہ آ ہی گیا۔

''ہاں بولو کیا بات ہے؟'' مہوش کا دل اندر سے کپکپا رہا تھا، مگر بظاہر مضبوط بنی اس کی طرف متوجہ ہوئی۔

''ہم نے ایک دوسرے کے ساتھ کافی وقت گزار لیا ہے، مگر ہمارے درمیان وہ انڈر اسٹینڈنگ ناپید رہی، جو دو پیار کرنے والے میاں بیوی کے درمیان ہونی چاہیے۔ میں یہ تو نہیں کہوں گا سارا قصور تمہارا ہے، مگر اس حقیقت سے تم بھی نظریں نہیں چراؤ گی کہ شادی شدہ زندگی کو کامیاب بنانے میں مرد سے زیادہ عورت کا ہاتھ ہوتا ہے۔'' اس نے بغور مہوش کو دیکھ کر کہا، وہ بے چینی سے اپنے پاؤں کو مسلسل ہلا رہا تھا۔ یہ اس بات کی نشانی تھا کہ وہ بہت ٹینشن میں ہے، مہوش کا دل چاہ رہا تھا کہ اسے آئینہ دکھائے کہ خود غرضی پر مبنی رشتوں میں وہ کہاں محبت کی چاشنی ڈھونڈنے نکلا ہے، مگر اس وقت تو عزیر جج بنا سارے فیصلوں کا اختیار خود لیے ہوا تھا۔

''آگے بولو میں سن رہی ہوں۔'' وہ سر جھکائے، چادر پر نہ نظر آنے والی شکنوں کو دور کرتی دل ہی دل میں اس سے سوال کرنے لگی۔ اس نے اب تک نظر اٹھا کر عزیر کی جانب نہیں دیکھا تھا کہیں وہ اس کی آنکھوں میں آئے شبنمی موتی نہ دیکھ لے، اس موقع پر وہ کسی کمزوری کا اظہار کرنا نہیں چاہتی تھی۔

''تم نے ہمیشہ مجھے یہ احساس دلایا کہ میں تم سے کمتر ہوں۔ میں تمہاری طرح کامیاب پروفیشنل لائف نہیں گزار رہا ہوں۔ تم اے سی ایم اے کوالیفائڈ ہو کر کیسے ایک بی کام پاس سے اپنے جیسے پروفیشنل رویے کی توقع کر رہی تھیں، کبھی کبھی تو لگتا کہ میں اپنے کسی باس کے ساتھ زندگی گزار رہا ہوں۔'' عزیر نے چڑ کر کہا۔

''اس کے علاوہ اور بھی جو شکایات ہیں مجھ

سے، وہ بتادو۔'' مہوش کا لہجہ اس کے دکھوں کی غمازی کررہا تھا۔

''اگر اولاد ہو جاتی، تو شاید وہ ہمیں نزدیک لے آتی۔ تم نے ہزاروں جگہ اپنا علاج کروایا، مگر ماں نہیں بن سکیں۔'' عزیر نے دھیمے لہجے میں خدا کی مرضی کو بھی اس کی خطاؤں کے کھاتے میں ڈالا۔

''کیا اس میں میرا کوئی قصور ہے؟'' مہوش کے ہونٹ کپکپائے، اس نے خشک ہوتے گلے سے بڑی مشکل سے پوچھا۔

''نہیں، میں تمہیں قصوروار نہیں ٹھہراؤں گا، مگر تم یہ بات تو مانو گی نا کہ اولاد کی خواہش میرا فطری حق ہے اور شاید ایسی زنجیر ہوتی جو ہمیں باندھ کر رکھتی۔ میرے والد کی آخری خواہش ہے کہ مرنے سے قبل میری اولاد کا منہ دیکھیں۔'' اس کے ہاتھ پر دلاسا دینے کے لیے عزیر نے اپنا بھاری ہاتھ رکھا، کیوں کہ وہ جو فیصلہ کرنے جارہا تھا اس کے لیے شاید اسے خود بھی حوصلے کی ضرورت تھی۔ مہوش کی آنکھوں سے ضبط کے باوجود آنسو گرنے لگے، اور وہ ہچکیوں سے رونے لگی۔ دل چاہ رہا تھا کہ سارے بند ٹوٹ جائیں اور پانی کا ریلا سب کچھ بہا کرلے جائے اس کی ذات بھی۔ عزیر کو پشیمانی نے آگھیرا مگر وہ اپنے بیمار باپ سے وعدہ کرچکا تھا۔

''میں اپنی خالہ کی بیٹی سے شادی کررہا ہوں۔'' عزیر نے دل کڑا کرکے فیصلہ سنایا۔ مہوش نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے عزیر کی طرف دیکھا، اس نے نظریں چرالیں۔

''ٹھیک ہے، تم اپنی دوسری بیوی کو اپنے والدین کے گھر رکھنا، بس چند دن یہاں میرے پاس بھی گزار لینا۔'' مہوش نے بڑی دیر خاموش رہنے کے بعد دل پر پتھر رکھ کر التجا کی۔

''میں تمہیں طلاق دے رہا ہوں۔'' عزیر نے اس دفعہ ایسا دھماکا کیا کہ مہوش کو لگا کہ اس کے وجود کے پرخچے اڑ گئے۔

''پلیز عزیر! یہ ظلم مجھ پر مت کرو۔ میں تمہارے بغیر مر جاؤں گی۔'' مہوش نے انا کو بالائے طاق رکھتے ہوئے اس کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے۔ جو کچھ بھی تھا، اس کے نام کے ساتھ جڑا عزیر کا نام ہی اسے معاشرے میں ایک باعزت شادی شدہ عورت کا مقام دلاتا تھا۔ طلاق یافتہ کا جھومر سجا کر معاشرے میں سر اٹھا کر چلنا دشوار ہو جاتا۔

''مہوش مجھے معاف کردینا مگر، میری خالہ نے الماس سے شادی کی شرط ہی یہ رکھی ہے کہ میں اپنی پہلی بیوی کو طلاق دے دوں۔ میرے والدین نے بھی منتیں کرکے مجھے اس بات کے لیے مجبور کردیا ہے۔'' عزیر نے ایک بڑا لفافہ اس کے ہاتھ میں تھمایا، اسے زبانی تین بار طلاق دی، اس کی طرف دیکھے بنا اپنا سامان اٹھا کر اس گھر اور مہوش کی زندگی سے ہمیشہ کے لیے نکل گیا۔ مہوش نے زوردار چیخ ماری اور گر کر بے ہوش ہوگئی۔

☆......☆......☆

''اف اللہ میری بیٹی کا کیا قصور تھا، جو اسے یہ سزا ملی۔'' جس دن سے مہوش کو طلاق ہوئی تھی پورا گھر ہل کر رہ گیا تھا۔ زبیدہ بیگم کے اونچے اونچے بین بیٹی کے دل پر لگتے تھے، وہ نماز میں بھی بڑی زور زور سے فریاد کرتیں، اور اپنا قصور پوچھے جاتیں۔

''اللہ ہم نے تو ہمیشہ دل سے تیری عبادت کی ہے، پھر ہمیں کس گناہ کی سزا ملی ہے۔'' وہ آنکھیں بند کیے زور زور سے بول کر دل کا بوجھ ہلکا کررہی تھیں۔

''میں بتاؤں اماں آپ کا کیا قصور ہے۔ یہ مکافاتِ عمل ہے۔ ماہین بھابی کو آپ بھول گئی ہوں گی، میں نہیں بھولی، مہوش اپنے حواسوں میں نہیں تھی۔ اوپر سے اماں کی فریادیں، اس کے دماغ میں

ٹھک کر کے لگ رہی تھیں، چیل کی طرح جھپٹ کر آئی اور جائے نماز پر بیٹھی ہوئی ماں کو جھنجھوڑ ڈالا۔

زبیدہ بیگم بیٹی کی حالت دیکھ کر ہکابکا رہ گئیں، بوا ماں نے آگے بڑھ کر مہوش کو الگ کیا اور پانی پلایا۔ ماموں جو ابھی آفس سے واپس آیا تھا۔ ماں کی خراب حالت دیکھ کر جائے نماز سے اٹھایا۔ ان کو بازوؤں کے حلقے میں لے کر کمرے میں لے گیا، زبیدہ بیگم پوری جان سے کانپ رہی تھیں، عثمان، ماہا کو دلاسا دینے لگا جو صحن کی دیوار سے لگی یہ تماشا دیکھ رہی تھی۔ ساجدہ نے بڑھ کر مہوش کو سنبھالا۔ نند کے دکھ پر اس پتھر کی آنکھ سے بھی موتی ٹپک پڑے۔

''ہائے ماموں میرے ہنستے بستے گھر کو کس کی نظر لگ گئی۔'' زبیدہ بیگم بستر پر بیٹھ کر ہاتھ مل مل کر رونے لگیں۔ ''اماں یہ ہمارے اپنے کرم ہوتے ہیں، جو ہمارے آگے آتے ہیں۔'' ماموں نے ماں کے پاؤں دباتے ہوئے انہیں سمجھایا۔

''بیٹا تم ٹھیک کہتے ہو، ماہین کے معاملے میں میں نے ساجدہ کی باتوں میں آ کر بڑا گناہ کمایا اپنا بیٹا تو کھویا، بیٹی کی بربادی بھی دیکھنا نصیب ہوئی۔'' پشیمانی کے آنسو زبیدہ بیگم کی آنکھوں سے رواں تھے۔ ماموں سے ماں کی حالت دیکھی نہیں جارہی تھی، وہ جیسی بھی تھی، اس کی ماں تھیں۔

''اماں یہ وہ کانٹے ہیں، جن سے ہم نے خود اپنا دامن تار تار کرلیا ہے۔'' ماموں نے ٹھنڈی آہ بھری۔ زبیدہ بیگم اس سے لپٹ کر بری طرح سے رو رہی تھیں، ماموں نے دل میں ایک فیصلہ کیا اور موبائل نکال کر ہارون کو کال ملانے لگا۔ ماں کی ٹوٹی پھوٹی حالت اس سے دیکھی نہیں جارہی تھی۔ اب تک ماں سے بھائی بھابی کے لیے لڑتا تھا، اسے اب بیٹے کا حق ادا کرنا تھا۔ ماں جائے سے ماں کے لیے لڑنا تھا۔

☆......☆......☆

''اماں میں چاہتا ہوں، کہ ابو کی وصیت پر عمل کرتے ہوئے ماہا اور عثمان کا نکاح کردوں۔'' موسیٰ نے بڑے سبھاؤ سے ماں کے گھٹنوں پر ہاتھ دھرتے ہوئے بات شروع کی۔ ساجدہ خاموشی سے شوہر کے ساتھ ہی بیٹھی تھیں، نہ خوش نظر آرہی تھی نہ غمگین۔ ماموں نے حیرت سے بھاوج کو دیکھا، وقت بڑے بڑے پتھروں کو ہلا دیتا ہے۔ یہ وہ ہی ساجدہ تھیں نا، جو ہواؤں سے لڑتی تھیں۔ شوہر کو انہوں نے کبھی کچھ نہیں سمجھا۔ آج جب بات ان کے بچوں کی خوشی کی آگئی، تو ہر سمجھوتا کرنے کھڑی ہوگئیں۔ مہوش کی بربادی نے بھی انہیں اندر تک ہلا کر رکھ دیا تھا، اب ہر نماز میں استغفار کررہی ہوتی تھیں۔

''دیکھو بیٹا مانا ماہا یہاں رہتی ہے، مگر اس کی شادی کا فیصلہ کرنے کا حق اس کے باپ کو ہے۔ اس وقت تو بہت رات ہوگئی ہے۔ میں ہارون کو کل دبئی فون کروں گی، پھر جو اس کا فیصلہ ہوگا ہمیں منظور ہوگا۔'' زبیدہ بیگم نے دھیرے سے بیٹے سے کہا۔ بیٹی کی اجڑی زندگی نے ان کا لہجہ دھیما کردیا تھا۔

''مجھے یقین ہے کہ میرا بھائی مجھے مایوس نہیں کرے گا۔'' موسیٰ بہت خوش نظر آرہے تھے۔

ماہا کھڑکی سے ان لوگوں کی باتیں سن رہی تھی، یہ ہی تو صحیح وقت ہے، اس نے بیگ سے فرید کا کارڈ نکالا، اور فون اسٹینڈ کی طرف بڑھ گئی۔

☆......☆......☆

''ماہی میں آج بہت خوش ہوں، میری بچپن کی محبت جیت جائے گی۔ مجھے یقین ہے کہ چاچا کے گھر والوں سے جتنے بھی اختلافات صحیح، مگر وہ اپنے بھتیجے کا رشتہ نہیں ٹھکرائیں گے۔'' عثمان کو تنخواہ ملی تھی۔ وہ سب کے لیے مٹھائی لایا تھا، مگر ماہا کے لیے بے بی پنک کلر کا بڑا نفیس باریزے کا سوٹ لے کر آیا تھا۔ ماہا نے نہ چاہتے ہوئے بھی وہ سوٹ لے لیا۔

عثمان ماہا سے نکاح کے حوالے سے بہت پُر جوش تھا۔ ابھی ہارون سے بات نہیں ہوئی تھی، پھر بھی اسے ایک فیصد بھی نہ کی امید نہیں تھی۔

☆......☆......☆

موسیٰ، فون پر ہارون سے ماہا کے رشتے کے سلسلے میں بات کر رہا تھا۔ ہارون نے اس معاملے میں ماں کی رائے مانگی، انہوں نے بھی اس رشتے پر اپنی رضامندی دے دی۔ آخر میں ہارون مامون سے تفصیلی بات کر رہا تھا۔

''بھائی ماہی کے لیے رشتے ایک نہیں دو ہیں۔ دونوں ہی اچھے ہیں۔ اب باپ ہونے کی حیثیت سے فیصلہ آپ کو کرنا ہوگا۔'' مامون نے ایک نئی بات کی۔ وہاں جمع سب لوگ حیران ہو گئے۔

''جی عثمان کے علاوہ میرے دوست کے چھوٹے بھائی فرید حسن نے بھی ماہا کا رشتہ دیا ہے۔ وہ بھی وکیل ہے اس لیے اکثر کوئی خاص کیس ڈسکس کرنے میرے پاس آتا رہتا ہے۔ اسی لیے میں اس کو جانتا ہوں۔ وہ بہت سلجھا ہوا لڑکا ہے۔'' ماہا کے کہنے کے مطابق فرید نے اپنے لیے ماہا کی پسندیدگی کا حوالہ بھی دے دیا تھا، جس پر مامون اس کی وکالت کر رہا تھا۔ ہارون اب، مامون سے دوسرے رشتے کے بارے میں تفصیلات جان رہا تھا۔

''اچھا شریف لڑکا ہے۔ اسے جاب کی ضرورت نہیں، جاگیردار گھرانے سے اس کا تعلق ہے، مگر وہ اپنی الگ پہچان بنانا چاہتا ہے۔ جی ٹھیک ہے، میں فرید حسن کے گھر والوں سے بھی مل لوں گا۔''

''کیا واقعی میں گھر والوں کو یہ خوش خبری بھی سنا دوں۔''

مامون بہت خوش نظر آ رہا تھا، اس نے ''یاہو'' کا نعرہ مار کے فون رکھا۔

''اماں! بھائی ماہا کی شادی کرنے، اپنی پوری فیملی کے ساتھ پاکستان آ رہے ہیں۔'' مامون نے خوشی خوشی، ماں کے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔

''ماہا کے سلسلے میں اس نے کیا کہا۔'' زبیدہ بیگم نے وہ سوال کیا جس کے جواب کا عثمان کو بڑی بے صبری سے انتظار تھا۔

''انہوں نے فیصلے کا اختیار ماہا کو سونپ دیا ہے۔ اب یہ فیصلہ ماہا کو کرنا ہے کہ وہ کس سے شادی کرے گی۔'' مامون نے بتایا تو عثمان کی جان میں جان آئی۔

''یہ بات تو پتھر پر لکیر ہے کہ ماہا، میرے حق میں ہی فیصلہ دے گی۔'' عثمان نے مسکرا کر ماہا کو دیکھا تو اس نے بھی اُسے حوصلہ افزا مسکراہٹ سے نوازا۔

''بالآخر بھائی کو میری بات سمجھ میں آ ہی گئی۔ وہ وطن لوٹنے پر راضی تو ہوئے۔'' مامون نے ماں سے کہا جو شکرانے کے نفل پڑھنے کے لیے صحن میں لگے، واش بیسن پر وضو کرنے جا رہی تھیں۔ خوشی ان کے انگ انگ سے پھوٹ رہی تھی۔

''اب تو شرم کر لے، بھتیجی کی شادی ہو رہی ہے۔ تیرے سہرے کے پھول کب کھلیں گے۔'' انہوں نے لاڈ سے مامون کے کان کھینچے۔

''آ......آ......آ۔ اماں کان تو چھوڑیں۔ کیا خیال ہے، اگر آپ لوگوں کو ایک ٹکٹ میں دو مزے کرا دوں تو کیسا رہے گا؟'' مامون نے ماں سے کان چھڑائے اور شوخی سے بولا۔

''چل بے وقوف کسی اور کو بنانا۔ ہٹ مجھے وضو کرنے دے'' مامون کی سنجیدہ بات کو انہوں نے مذاق میں لیا اور وضو کرنے کھڑی ہو گئیں۔

''میں اسی ہفتے دبئی جا رہا ہوں۔ بھائی نے کسی کام سے بلوایا ہے۔ ان کے ساتھ ہی انشاءاللہ واپس

آؤں گا۔ کہیں تو آپ کی بہو بھی ساتھ لے آؤں۔'' مامون نے انہیں ذہنی طور پر تیار کیا۔ انہوں نے دوران وضو اشارے سے بیٹے کے مخول پر اثبات میں سر ہلایا۔ مامون ہنستا ہوا اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

''اماں جھوٹ سمجھ رہی ہیں، ان کو کیا خبر یہ میری زندگی کا سب سے بڑا سچ ہے۔'' مامون بستر پر لیٹتے ہی خوابوں میں کھو گیا۔

☆......☆......☆

''ماہی، مجھے پورا یقین ہے کہ تم چاچو کے سامنے میرے حق میں فیصلہ دو گی۔ میرے جذبے بے اثر ہوں ایسا ہو نہیں سکتا۔'' عثمان نے بڑی چاہت سے ماہین کا ہاتھ تھام کر کہا۔ وہ کسی کام سے کچن میں آیا تھا، تو اپنے پیار کا اظہار اور ماہین سے اس کے فیصلے کی بابت پوچھ بیٹھا۔ ماہین نے گھبرا کر ہاتھ چھڑایا اور پیٹھ موڑ کر چائے کا پانی رکھنے لگی۔ یہ اس کے لیے بہت مشکل لمحات تھے، عثمان کی پُر خلوص محبت کا اثر اس پر ہونے لگا تھا۔

''دیکھو شرمانے سے کام نہیں چلے گا، میں نے تو نکاح کے سوٹ کا رنگ بھی سوچ لیا ہے ۔۔۔ پنک کلر کا ہوگا۔ تمہیں پتا ہے نا۔۔۔ جو لوگ گلابی رنگ پسند کرتے ہیں وہ ٹوٹ کر محبت کرنے والے ثابت ہوتے ہیں۔ اور میرا پسندیدہ رنگ بھی بے بی پنک ہے، اب تم اپنی خیر منالو'' خوشی عثمان کے انگ انگ سے پھوٹ رہی تھی۔ اس نے ماہین کا رخ اپنی طرف موڑ کر اس کے دونوں ہاتھوں کو دوبارہ نرمی سے تھاما۔

ماہین کے لیے اس کی آنکھوں میں دیکھنا محال تھا، اس کی آنکھوں سے جیسے محبت کی روشنی پھوٹ رہی تھی، ماہا گھبرا کر اس سے نظریں چرا رہی تھی، آج کل اس کے لیے عثمان کو فیس کرنا بہت مشکل لگ رہا تھا۔ کبھی کبھی تو عثمان کی بے لوث محبت کے آگے اس کا سر تسلیم خم کر جاتا، مگر پھر ماں کا چہرہ نظروں میں گھوم جاتا اس کی محبت کی گرمی سے جو ماہا کا جسم پگھلنے سا لگتا تھا، پتھر میں تبدیل ہو جاتا۔

☆......☆......☆

''اماں، اگر آپ مجھے خوش دیکھنا چاہتی ہیں، اور یہ چاہتی ہیں کہ میں جلد پاکستان آجاؤں تو مامون کی شادی میری مرضی سے کر دیں'' مامون دبئی پہنچ چکا تھا۔ اس نے وہاں سے ہارون کی بات ماں سے کرائی، اس کا اپنا مطلب جو اٹکا تھا۔ پھر بھلا وہ دیر کیسے کرتا۔ اماں کا ذہن کچھ کچھ تو وہ تیار کر آیا تھا۔ اب باقی کام ہارون کا تھا۔ اسے پتا تھا کہ اماں اپنے پردیسی بیٹے کو ناراض کرنے کا خطرہ اس بار نہیں مول لیں گی۔

''بیٹا، تُو جو کہے گا وہی ہوگا۔ میری آنکھ بند ہونے سے پہلے مجھے اپنی شکل دکھا جا، بس ایک بار واپس آجا۔'' زبیدہ بیگم خوشی سے نہال ہو رہی تھیں۔ ہر بات پر حامی بھر رہی تھیں۔

''اللہ نہ کرے ابھی تو آپ کو مامون اور ماہا کے بچوں کو کھلانا ہے، خیر سوچ لیں کہیں وعدے سے نہ مکر تو نہ جائیں گی۔'' ہارون لاڈ سے بولا، مامون بھائی کے پیر پکڑے کھڑا مسکرا رہا تھا۔

''ارے نہیں مکروں گی۔ مگر لڑکی کون ہے، خاندان کیسا ہے؟ کچھ تفصیل تو بتا۔'' انہوں نے جلدی جلدی پوچھا۔

''لڑکی اچھی ہے، سمجھ لیں ہمارا ہی خاندان ہے، آپ بس مجھ پر بھروسا رکھیں۔ اس بار بھی آپ کی ایک اچھی سی بہو لاؤں گا، پھر آپ کے بیٹے کی پسند ہے۔ یہ ہی تو آپ نے اس سے کہا تھا نا۔'' ہارون نے ہنستے ہوئے کہا اور مامون کے سر پر ایک چپت لگائی ۔ مامون اپنی ہر بات بھائی سے شیئر کرتا تھا، ہارون بھی

اپنا ہر دکھ سکھ چھوٹے بھائی کو ہی بتاتا تھا۔

"ٹھیک ہے اگر مامون راضی ہے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔" انہوں نے جلدی سے حامی بھر لی کہیں ساجدہ کوئی نیا مسئلہ نہ کھڑا کر دے۔ ان کے دل میں اندیشوں نے سر اٹھایا، مگر انہوں نے ایسے سر جھٹکا جیسے فکروں سے پیچھا چھڑا رہی ہوں۔

"ارے۔۔۔۔ چھوٹے صاحب کی بھی مرضی پوچھ لو" زبیدہ بیگم کا لہجہ بیٹوں کی محبت میں پور تھا۔

"ارے، اماں صاحب بہادر تو، چاروں ہاتھ پاؤں سے راضی ہیں۔" ہارون نے پاس کھڑے مامون کے کان کھینچے، تو وہ بھائی بھائی...... کرتا رہ گیا۔

☆......☆......☆

ہارون اپنی فیملی کے ساتھ آسیہ پھوپو کو منانے آیا ہوا تھا۔ مامون ماہین کی چھوٹی بہن شاز مین سے شادی کرنا چاہتا تھا۔ اس کے لیے پھوپو کو راضی کرنا کوئی آسان بات نہیں تھی، مگر اپنی چہیتی بیٹی ماہین کے حوالے سے انہیں ہارون ابھی بھی بہت عزیز تھا اسی لیے اس کے مسلسل منانے پر آخر وہ دوبارہ بھائی کے خاندان سے رشتہ کرنے پر راضی ہو گئیں۔ ان کے شوہر نے بھی شاز مین کی خوشیوں کی خاطر مامون کے گھر والوں کو معاف کر دیا۔

مامون کی خوشیوں کا تو کوئی ٹھکانہ ہی نہیں تھا۔ وہ جب بھی ماہا کو لے کر دبئی آتا تھا، ماں کو بتائے بغیر پھوپو سے ملنے ضرور جاتا تھا۔ پھوپو تو اچھی طرح سے ملتی تھیں، مگر پھوپا بڑا خشک رویہ اختیار رکھتے تھے۔ کیوں کہ مامون انہیں حق بجانب سمجھتا تھا۔ اس لیے ان کے رویہ کو خندہ پیشانی سے برداشت کرتا۔ مامون کو اگر چڑ آتی تھی تو وہ ان کی چھوٹی نک چڑھی بیٹی شاز مین سے جو اس کی آمد پر خوب ناک بھوں چڑھاتی، کبھی کبھی تو دروازے سے ہی بھگا دیتی، دونوں میں اکثر تلخ کلامی ہو جاتی۔ وہ مامون کو بھی ماہین کی موت ذمہ دار سمجھتی تھی۔ کیوں کہ اس وقت وہ بھی گھر میں موجود تھا، جب ماہین کو حادثہ پیش آیا تھا۔ آسیہ دونوں بچوں کے بیچ سیز فائر کراتیں۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ دونوں میں پہلے دوستی ہوئی، پھر شاز مین اپنی دلکش شخصیت کے ساتھ سیدھی اس کے دل میں جا اتری۔ جلد ہی مامون کی شفاف اور بے لوث محبت کا جادو اس پر بھی چل ہی گیا۔ اب ہارون کی کوششوں سے یہ رشتہ استوار ہونے جا رہا تھا۔

"آج ابا زندہ ہوتے تو کتنا خوش ہوتے۔" ہارون کے دل میں باپ کی یاد نے بسیرا کیا تو اس نے گیلی آنکھیں پونچھ ڈالیں۔

☆......☆......☆

ہارون جب سب کو لے کر پاکستان آیا تو حیران رہ گیا۔ گھر کے حالات میں بہت تبدیلی آ چکی تھی۔ وہ سب آپس میں گلے مل کر بہت روئے، ماہین بھی اپنی نانی، خالہ کے گلے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر روئی۔ زبیدہ بیگم بھی نند سے لپٹ کر بری طرح سے رو دیں۔ انہوں نے ماہین کے معاملے میں ہونے والی اپنی کوتاہیوں پر معافی مانگ لی، انہوں نے بھی گئے وقت کو آواز نہ دی اور سب کچھ بھلا کر بھاوج کو گلے لگا کر معاف کر دیا کہ اب نئے رشتے استوار ہو رہے تھے، پرانی یادوں کو دفن کرنا ضروری تھا۔

"آپ لوگ ایک دوسرے کو چاہے معاف کر دیں، مگر میں اپنی مما کو دکھ پہنچانے والوں کو نہیں بھلاؤں گی۔" ماہا نے اپنی نانی کے کان میں سرگوشی کی تو وہ اپنی جگہ پر سن رہ گئیں۔ ماہا نے اپنی کہی بات کو پورا کر کے دکھایا۔

☆......☆......☆

زبیدہ بیگم کی گھر کی خوشیاں لوٹ آئی تھیں۔

ماہا اور مامون کی شادی تھی، مامون اور ہارون پاکستان واپس آچکے تھے، مہوش بھی گھر میں آنے والی دو دو خوشیوں میں مصروف ہو کر اپنا غم کسی حد تک بھلا چکی تھی۔

سرخ شیفون کے بھاری کامدار شرارے میں دلہن بنی، ماہا بہت خوبصورت لگ رہی تھی۔ فرید حسن بار بار اس کی طرف دیکھ کر یقین کر رہا تھا کہ وہ اس کی بنا دی گئی ہے۔ ہولے سے اس کا ہاتھ دبا کر اس کی موجودگی کا احساس کر رہا تھا، ماہا نے شرما کر ہاتھ کھینچا، تو وہ ہنس دیا۔ ماہا کی ساس بار بار بہو بیٹے پر سے پیسے وار کر غریبوں میں بٹوا رہی تھیں۔ شادی میں پورا خاندان جمع تھا، سوائے ساجدہ کے...... وہ عثمان کے جانے کے بعد نروس بریک ڈاؤن کا شکار ہو گئی تھیں۔ سارہ ان کی تیمارداری کے لیے ان کے پاس رکی تھی،

"ہائے...... رے...... کوئی تو عثمان کو بلادے۔" انہیں لگ رہا تھا کہ انہوں نے بھی ہارون کی طرح اپنا بیٹا کھو دیا ہو، اسی لیے ایک ایک کے سامنے ہاتھ جوڑے فریادیں کر رہی تھیں۔

☆......☆......☆

ماہا کے عثمان کے لیے انکار اور فرید حسن کے لیے اقرار نے عثمان کی ہستی تک ہلا دی تھی۔ اسے گہرا صدمہ پہنچا تھا۔ اس نے اس معاملے پر چاچا سے بات بھی کی، مگر ہارون بیٹی پر کسی بھی قسم کا دباؤ ڈالنے کے حق میں نہیں تھے، سب کو یہ لگ رہا تھا کہ فرید حسن ماہا کی پسند ہے، اسی کے لیے اس کی خوشی مقدم تھی۔ سب نے ہنسی خوشی ماہا کے فیصلے کو قبول کر لیا۔

ہارون کو بھتیجا بہت پیارا تھا مگر وہ اپنی بیٹی کو ساجدہ بھابی کی بہو بنانے کے حق میں نہیں تھے، ان کا اعتبار اب بھی قائم نہیں ہوا تھا۔ ماہا عثمان کے لیے بہت افسردہ تھی، مگر وہ اس معاملے میں کچھ نہیں کر سکتی تھی۔ موسیٰ بھی خاموش ہو گئے، جب لڑکی ہی راضی نہیں تو وہ کس برتے پر اپنے بیٹے کے لیے بھائی سے لڑتے۔

☆......☆......☆

"ماہا تم نے مجھے کس بات کی سزا دی۔ کیوں میری پرُخلوص محبت کا مذاق اڑایا، میں نے تو تمہیں اپنے دل میں بہت اونچا مقام دیا تھا، مگر تم تو ایک سطحی لڑکی نکلیں، جو فرید حسن کے روپے پیسے پر ریجھ گئی۔ ارے تھوڑا انتظار کر لیتی، میری کمپنی پرموشن کے ساتھ مجھے یوکے بھیج رہی ہے۔ میں تمہاری خواہشوں سے بڑھ کر تمہارے لیے پیسہ کما لیتا۔" عثمان نے ماہا کے انکار کو فرید حسن کی دولت سے جوڑ دیا۔ اسی لیے جب سب گھر والے خاندان کی ایک دعوت میں گئے ہوئے تھے، وہ ماہا کے کمرے میں آ گیا۔

"عثمان بھائی بس کر دیں، آپ نے بھی اپنی ماں کی طرح من گھڑت الزام لگانا ہی سیکھا ہے۔ میرے انکار کی وجہ آپ نہیں تائی اماں ہیں۔" ماہا نے اس سے اپنا ہاتھ چھڑایا، جو اس نے غصے سے پکڑ لیا تھا۔

"بلا وجہ میری ماں کا نام استعمال کر کے میری نظروں سے مجھے اور مت گراؤ، پلیز اپنے مذموم مقاصد کو پایۂ تکمیل تک پہنچاؤ، میں تمہاری راہ کا پتھر نہیں بنوں گا۔" عثمان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے، جسے اس نے سختی سے اپنی ہاتھوں سے پونچھ ڈالا۔

"ابھی آپ کو اصل بات کی خبر نہیں، ورنہ شاید آپ کی نگاہوں سے کوئی اور گر جائے۔" ماہا نے غصے سے کہا۔

"چلو تم ہی بتا دو اصل بات کیا تھی؟" عثمان نے اس کا مذاق اڑایا۔

"میں کیوں بتاؤں، پوچھیے نا تائی اماں سے جو

میری ماں کی قاتل ہیں۔" ماہا بری طرح سے رو دی۔

"جھوٹ مت بولو۔ میری ماں کا نام بھی اب اپنی زبان پر بھی مت لانا۔" عثمان، ماں پر اتنا بڑا الزام برداشت نہ کر سکا۔

"سچ کو کیا آنچ! جائیے تایا ابا سے پوچھیے کہ تائی اماں نے میری ماں پر کیسے رکیک الزام لگا کر انہیں گھر سے نکالا تھا۔ زرا یہ ہی پوچھ لیں کہ وہ اتنے سالوں سے الگ کمرے میں کیوں رہتے ہیں۔ آخر ایسی کیا بات تھی جو انہوں نے اپنی بیوی کو اپنے سے دور کر دیا۔" ماہا کی باتوں میں وزن تھا۔

وہ باپ کے پاس پہنچ گیا۔ پہلے تو انہوں نے ٹالا مگر اس کی منتیں کرنے اور ہاتھ پکڑ کر رونے پر انہوں نے بھرائے ہوئے لہجے میں سارے واقعات من و عن بتا دیے۔ عثمان کے پیروں تلے زمین نکل گئی۔ اسے نہیں پتا تھا کہ اس کی ماں نے ایسا ظلم کمایا ہے۔ اس کے دل سے ماہا کے لیے سارے گلے شکوے جاتے رہے۔

☆......☆......☆

"ہائے میری اماں، یہ کیا ہو گیا، میں لٹ گئی، میرا بچہ مجھے چھوڑ کر چلا گیا۔" ساجدہ کے کمرے سے بین کرنے کی آواز پر سب وہاں دوڑے۔

"ارے کیا ہوا ساجدہ کیوں اتنی زور زور سے رو رہی ہو؟" زبیدہ بیگم نے فرش پر بیٹھی ساجدہ سے ہول کر پوچھا۔

"پھوپو یہ دیکھیں، عثمان کا خط وہ مجھے چھوڑ کر ہمیشہ کے لیے برطانیہ چلا گیا ہے۔" پاس ہی مائرہ بیٹھی رو رہی تھی اس کے ہاتھ میں وہ خط تھا، جو صبح عثمان کے خالی کمرے سے ملا تھا۔ اس نے ماں کو پڑھ کر سنانا شروع کیا۔

عثمان نے ماں سے التجا کی تھی کہ وہ ماہا، ہارون اور ماہین کے گھر والوں سے اپنے کیے کی معافی مانگ لیں، اسے ماضی کے سارے واقعات، پتا چل چکے تھے۔ اس کا خیال تھا کہ ان گناہوں کی تلافی کے لیے اسے اس گھر سے دور چلے جانا چاہیے۔ جہاں اس کی چاچی پر ایسے ظلم کیے گئے کہ وہ موت کے منہ میں چلی گئیں، اور چاچا کو جلا وطنی اختیار کرنی پڑی۔

ساجدہ سے اس سے زیادہ سنا نہیں گیا، وہ تیورا کر گر پڑیں۔ موسیٰ نے بڑھ کر انہیں سنبھالا، اور اسپتال لے کر بھاگے۔

☆......☆......☆

ماہا نے اپنی شادی کے بعد عثمان کے اس نمبر پر برطانیہ فون کیا، جو اس نے ایک ہفتہ قبل بھیجا تھا۔ عثمان سے اپنے رویے پر معافی مانگنے کے علاوہ گھر لوٹنے کی استدعا بھی کی۔ سارے حالات جاننے کے بعد اب عثمان کا دل ماہا کی طرف سے صاف ہو چکا تھا، اس لیے اس نے ماہا اور فرید حسن کو اپنی دعاؤں سے نوازا۔ فرید حسن نے بھی کافی دیر عثمان سے باتیں کی۔

ماہا کی زندگی میں فرید حسن کی پُر جوش محبت نے پھول سے کھلا دیے ہیں۔ اب اس کے دل کو بہت سکون حاصل ہو چکا ہے۔ وہ جب بھی میکے آتی اس کی چاچی پلس خالہ اسے ہتھیلیوں پر رکھتی مگر، فرید حسن اسے میکے میں رکنے نہیں دیتا جس پر شازمین کی فرید سے بہت لڑائی ہوتی ہے، ماموں ان کی محبت پر ہنستا رہتا ہے۔ ماہا کو زندگی کی ساری خوشیاں جیسے ایک دم ہی مل گئی تھیں۔ فرید حسن نے اسے پلکوں پر بٹھا کر رکھا تھا۔ اب ماہا کو وہ خواب بھی نظر آنا بند ہو گئے تھے جنہوں نے ساری عمر اسے ڈرایا، لگتا تھا اس کی ماں کی بے چین روح کو سکون مل گیا تھا۔ کیونکہ ماہا اپنے گیٹ وے آف لو میں داخل ہو گئی تھی۔

☆......☆......☆

افسانہ

روبینہ شاہین

کیسی ہے یہ تنہائی

''واقعی تم عورتیں بھی نا، پوتی پوتے اور نواسی نواسے کے خواب دیکھتے ہوئے یہ بھی بھول جاتی ہو کہ انہیں دادی نانی کہلانا پڑے گا۔'' ''خیال رکھیے جناب آپ بھی دادا کہلائیں گے۔'' ثمرہ نے جوابی وار کیا۔ ''ارے جناب ہم تو بہ خوشی دادا کہلانے......

معاشرے کا وہ دکھ، جس سے ہر دوسرا فرد متاثر ہے، افسانے کی صورت

''احمر! اب برداشت نہیں ہوتا مجھ سے یہ سب کچھ۔''

ثمرہ ڈارلنگ کیا ہوا۔ کیا برداشت نہیں ہوتا تم سے۔'' احمر نے بڑے پیار سے اس کا ہاتھ تھام کر کہا۔

''ہونا کیا ہے، وہی اماں جی کا مسئلہ ہے اور کیا ہے۔ وہی بحث تکرار، کوئی نہ کوئی موضوع شروع کردیتی ہیں۔'' اس کا لہجہ سخت اور انتہائی تلخ تھا۔

''اب کیا مسئلہ ہے؟''

''ماں جی کہتی ہیں بچے کو مغرب کے وقت باہر لے کر مت نکلو۔ اسے یہ کھلاؤ، وہ نہ کھلاؤ اور نہ معلوم اس پر پڑھ پڑھ کر کیا پھونکتی رہتی ہیں اور کہتی ہیں کہ وہ اب محفوظ رہے گا۔ شادی کے بعد سے ان کی یہ سب پابندیاں برداشت کر رہی ہوں، یہ نہ کرو، وہ نہ کھلاؤ مغرب کے وقت کھلے آنگن میں نہ بیٹھو، تم نئی دلہن ہو۔ مجھے تو ان سے الجھن ہونے لگی ہے۔''

''ڈونٹ وری ڈیئر! میں اماں جی کو سمجھا دوں گا۔ ویسے ان کی باتوں کو مائنڈ نہ کیا کرو۔ یہ بوڑھے بزرگ لوگ بھی سردرد کی طرح ہوتے ہیں۔ انہیں زیادہ اہمیت نہ دیا کرو۔'' احمر فرمانبردار شوہر ہونے کا فرض نبھاتے ہوئے اسے مطمئن کر رہا تھا۔

ثمرہ ہمیشہ کی آزاد طبیعت اور بدمزاج لڑکی تھی، جسے احمر نے جنون کی حد تک چاہا اور بیگم تجمل بیٹے کی چاہت سے مجبور ہو کر اسے اپنی بہو بنانے کی غلطی کر چکی تھیں۔

بیگم تجمل ثمرہ کی ہٹ دھرمی دیکھ کر اس لیے خاموش رہتی تھیں کہ وہ اپنے اکلوتے بیٹے کو کھونا نہیں چاہتی تھیں۔ تجمل صاحب کی موت کے بعد انہوں نے احمر کی ہر خواہش باپ کی طرح پوری کی تھی لیکن بیگم تجمل کو لگتا تھا ان کی ساری محنت، پرورش اور تربیت ثمرہ نامی طوفان بیکار کردے گا۔ یہ سب کچھ اور ایسی بہت سی الجھنیں تھیں جن سے گھر کا ماحول بہت ٹینس رہنے لگا تھا۔ رفتہ رفتہ یہ گھٹن اور ٹینس انہیں استھما اور فالج کی مریضہ بنا گیا۔ ان کی دیکھ بھال اور خدمت کے لیے ثمرہ کے پاس وقت کہاں تھا۔ اس مسئلے کا حل یوں نکالا گیا کہ ایک غریب عورت کو ان کی دیکھ بھال کے لیے رکھ لیا گیا جسے

کھانا پینا اور تنخواہ بھی مل جاتی۔
''انس تم پھر ماں جی کے روم میں گئے۔ تمہیں بتاتی ہوں میری بات نہ ماننے کا انجام کیا ہوتا ہے۔''
ثمرہ نے قہر آلود نظروں سے اپنے بیٹے کو گھورا۔
''مما دادی ماں اکیلی تھیں۔ میں ان کے پاس آ گیا۔ وہ مجھے کہانی سنا رہی تھیں، ایک شہزادے کی جو جادوگرنی کی جادو نگری میں گم ہوگیا ہے۔ شہزادے کی مما اسے تلاش کر رہی ہے۔ مجھے پوری کہانی تو سننے دیں۔'' انس التجا کرنے لگا۔
''نہیں بالکل نہیں، تمہیں معلوم ہے دادی بیمار ہیں۔ ان کے پاس تمہیں نہیں جانا چاہیے، تم بھی بیمار ہو جاؤ گے۔'' ثمرہ نے انس کو کھینچ کر دادی کے پہلو سے اٹھایا۔
''ثمرہ میرا دل بہل رہا تھا، انس کو میرے پاس رہنے دو۔''
''اماں کچھ تو خیال کریں۔ آپ کے اکلوتے بیٹے کی اولاد ہے۔ کیا چاہتی ہیں آپ یہ بھی بیمار ہو جائے۔''
''نہیں میں ایسا کیوں چاہوں گی۔ تم لے جاؤ اسے۔ بیٹا اب مت آنا میرے پاس۔ میں بیمار ہوں نا میں نہیں چاہتی کہ میری بیماری تمہیں لگ جائے۔''
بیگم تجمل نے اپنے وجود کی تمام توانائی کے ساتھ یہ باتیں اپنے پوتے انس سے کہیں اور اسے بھیگی آنکھوں سے اپنے کمرے سے جاتے ہوئے دیکھتی رہیں۔ اب ان کے حصے میں صرف تنہائی، اکیلا پن اور اداسی رہ گئی تھی۔
ان کی زندگی ویل چیئر تک محدود ہو کر رہ گئی تھی۔ باہر کی رواں دواں زندگی دیکھے انہیں بہت عرصہ گزر گیا تھا۔ ان کی صحت خراب ہوتی جا رہی تھی۔
اور پھر ایک دن وہ خاموشی کی چادر اوڑھے اس گھر نما قید خانے سے رخصت ہو گئیں۔ احمر نے بڑی شان سے ماں جی کی آخری رسومات ادا کیں۔ خوب

نمود و نمائش ہوئی جس کے پاس ماں کے ساتھ گزارنے کے لیے چند لمحے نہیں تھے۔ کچھ پیار کی باتیں نہیں تھیں جو اس بیمار وجود کو راحت دے سکتیں، آج وہی بیٹا لوگوں کے درمیان بیٹھا ماں سے محبت کے قصے بیان کر رہا تھا۔ ثمرہ بھی اپنی خدمت اور فرمانبرداری کی داستانیں سنا رہی تھی۔

☆☆

گزرتے ماہ سال نے احمر کے گھر میں بہت کچھ تبدیل کر دیا۔ سب سے بڑھ کر ثمرہ بیگم جو پہلے خود کو عقل کل سمجھتی تھیں، اب مختار کل ہونے کا پورا لطف اٹھا رہی تھیں لیکن گزرتے وقت کے ساتھ سمندر میں سرکشی کی لہریں اٹھ رہی تھیں۔ انس عمر کے ایسے حصے میں تھا جہاں جذبوں کی اڑانیں آکاش سے باتیں کرتی ہیں۔

''آپا آپ کی مائرہ میرے انس کے لیے بہت اچھی لائف پارٹنر رہے گی آپ کی کیا مرضی ہے۔''

ثمرہ بیگم نے اپنی بھانجی کا رشتہ اپنی بہن سے بڑے پیار سے مانگ لیا۔

''مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ دونوں ہی بچے گھر کے ہیں۔'' آپا جان نے مسکرا کر جیسے اپنی رضامندی دے دی۔

''مما آپ کیسی باتیں کر رہی ہیں۔ مجھے یہ رشتہ منظور نہیں۔ مائرہ اور مجھ میں کوئی انڈر اسٹینڈنگ نہیں ہے۔ میری اپنی پسند ہے۔ میری بھی کچھ خواہشیں ہیں۔'' انس جو ابھی ابھی کمرے میں داخل ہوا تھا ماں اور خالہ کی باتیں سن کر انہیں بے اختیار ٹوکا تھا۔

''تم یہ کیسی باتیں کر رہے ہو۔ بڑوں کے درمیان تم کیوں دخل دے رہے ہو۔''

''اس لیے کہ زندگی میری ہے اور مجھے گزارنا ہے آپ بڑوں کو نہیں۔''

''ثمرہ تم نے اس لیے بلایا تھا مجھے۔ ارے اتنی بڑی بات کرنے سے پہلے اپنے لڑکے سے تو پوچھ لیا ہوتا یوں میری بے عزتی نہ ہوتی۔ ایسے بے ادب، گستاخ لڑکے کو اپنا داماد بنانے کا مجھے بھی کوئی ارمان نہیں۔ تمہیں مبارک ہو یہ بے ادب اولاد۔''

آپا جان ناراض ہو کر جا چکی تھیں۔ ثمرہ بیگم سکتے کے عالم میں اس بدلتی چویشن کو دیکھتی رہ گئیں۔ انس ان کی خواہش کو اتنی بے دردی سے رد کر سکتا تھا انہوں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ کتنے لاڈ پیار سے پالا تھا انہوں نے اپنے بیٹے کو۔ مان ٹوٹنے کا دکھ کیا ہوتا ہے اس کا احساس انہیں آج ہوا تھا۔ اس دن کے بعد سے وہ بہت چپ اور اداس، اداس سی رہنے لگیں تھیں۔ بی پی کافی لو ہو گیا تھا۔ لیکن انس نے ان کی اداسی، ان کی خفگی کا کوئی نوٹس ہی نہیں لیا۔ اپنی ہر بات منوانے والی ثمرہ نے بالآخر ہار مان لی اور خود ہی بیٹے سے پوچھا۔

''انس مجھے بتاؤ تو وہ لڑکی کون ہے؟ کیسی ہے؟ جسے تم اپنا ہم سفر بنانے کا خواب دیکھ رہے ہو۔''

''ملوادوں گا ابھی وہ ابراڈ گئی ہوئی ہے۔''

''کوئی بات نہیں جب آئے تو ضرور ملوانا۔'' اس نے بیٹے کا ماتھا چوم کر کہا۔

ثمرہ کا اپنے بہن بھائیوں سے جو تعلق کبھی کمزور نہیں پڑا تھا، اب انس کی وجہ سے بالکل ختم ہو گیا تھا۔ اپنے بیٹے کی محبت کے آگے جیسے وہ بے بس ہو گئی تھی۔ مامتا کے رشتے نے باقی رشتوں کو دھندلا سا دیا تھا۔

☆☆

اور پھر ایک خوبصورت شام میں انس اور مہا گل کی منگنی کی رسم ہو گئی۔

''احمر مبارک ہو بیٹے کی منگنی۔ اب مجھے بہو کی شاپنگ کرانے کے لیے تیار رہیے۔ ثمرہ نے خوشی سے کھنکتے لہجے میں احمر کو جیسے وارننگ دی۔

"ممام آپ فکر نہ کریں، شادی کی ساری شاپنگ میں اور مہاگل خود کریں گے۔" انس نے ثمرہ کے ارمانوں پر پانی پھیر دیا۔

"ہاں بیٹا بالکل تم لوگ اپنی مرضی سے شاپنگ کرنا۔" ثمرہ نے مہمانوں کے درمیان اپنے احساسِ ندامت کو مٹانے کی کوشش کی۔

☆☆

دن رنگین تتلیوں کی طرح اڑانیں بھر رہے تھے اور راتیں جگنوؤں کے اجالے چرا لائی تھیں۔ انہی روز و شب میں ثمرہ اپنے بیٹے کی پسند کو اپنی بہو بنا کر لے آئی۔ اس دن اس کے چہرے پر بکھری خوشی ہر کسی کی نگاہوں کا مرکز بنی ہوئی تھی۔ وہ اپنے آپ کو جیسے ہواؤں میں اڑتا محسوس کر رہی تھی۔ ولیمہ اور دعوتوں سے فرصت ملی تو انس اور مہاگل ہنی مون کے لیے بیرون ملک چلے گئے۔

"احمر! انس کتنا خوش ہے۔ لگتا ہے ہمارے گھر قوس و قزح کے رنگ بکھر رہے ہیں اور بہت جلد ہم اپنے بیٹے کے بچوں کا شور اور قلقاریاں سنیں گے۔"

"واقعی تم عورتیں بھی نا، پوتی پوتے اور نواسی نواسے کے خواب دیکھتے ہوئے یہ بھی بھول جاتی ہو کہ انہیں دادی نانی کہلانا پڑے گا۔"

"خیال رکھیے جناب آپ بھی دادا کہلائیں گے۔" ثمرہ نے جوابی وار کیا۔

"ارے جناب ہم تو بہ خوشی دادا کہلانے کو تیار ہیں لیکن مسئلہ آپ کا ہے۔"

"میں بھی دادی کہلانے کو تیار ہوں بلکہ میری تو آرزو پوری ہو جائے گی۔"

احمر اور ثمرہ اس وقت گھر سے لانگ ڈرائیو کے لیے نکلے ہوئے تھے اور مستقبل کے حسین خواب بنتے ہوئے احمر کو سامنے سے آنے والے تیز رفتار ٹرک سے اپنی کار بچانے کا موقع ہی نہیں ملا۔

☆☆

حادثہ بے حد شدید تھا احمر تو موقع پر ہی جاں بحق ہو گئے جبکہ ثمرہ کو شدید زخمی حالت میں اسپتال لے جایا گیا اور جب ثمرہ کو ہوش آیا تو ان کی دنیا ہی بدل گئی تھی۔ اس کا جیون ساتھی اسے ہمیشہ کے لیے چھوڑ کر جا چکا تھا جبکہ معذوری نے زندگی بھر کے لیے اس کا ہاتھ تھام لیا تھا۔ اب وہ ایک کمرے میں محدود

شیخی خور

کبوتروں کا ایک جوڑا فضا میں اڑ رہا تھا۔ نر نے اپنی مادہ سے کہا۔ "تم کیا جانو کہ مجھ میں کتنی طاقت ہے، اگر میں چاہوں تو اپنے پروں کے ایک ہی وار سے سامنے کی پوری عمارت گرا دوں۔"

اتفاق سے اس عمارت کی چھت پر کھڑا ہوا آدمی پرندوں کی بولی جانتا تھا۔ اس نے اشارے سے کبوتر کو اپنے پاس بلایا اور کہا۔

"کیوں میاں! یہ شیخی کیوں بگھار رہے ہو؟"

کبوتر نے فوراً کہا۔ "معاف کیجیے گا جناب! میں تو صرف اپنی کبوتری پر رعب جما رہا تھا ورنہ میں کیا اور میری طاقت کیا؟"

آدمی نے کہا۔ "خبردار آئندہ ایسا مت کرنا، ایسا رعب ہرگز نہ جمانا، یہ بہت بری بات ہے۔"

کبوتر واپس کبوتری کے پاس پہنچا تو اس نے پوچھا۔ "وہ آدمی تم سے کیا کہہ رہا تھا؟"

کبوتر نے جواب دیا۔ "تم نے دیکھا نہیں...... وہ آدمی ہاتھ جوڑ کر کہہ رہا تھا کہ خدا کے لیے میری عمارت مت گرانا۔"

مرسلہ: کوثر اسلم، راولپنڈی

ہو کر رہ گئی تھی۔

کبھی کبھی بہو بیٹا مہمانوں کی طرح کمرے میں آتے اور کچھ دیر بیٹھ کر چلے جاتے۔ وقت کی تنابیں تھام کر حکمرانی کرنے کی شوقین ثمرہ اب تنہا کمرے میں ایک 'میڈ' کے رحم و کرم پر تھی۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بہو بیٹا اسے کمرے کا مکین بنا کر بھول گئے تھے۔ کبھی کبھی ڈاکٹر بھی طبی معائنہ کرنے آجاتا اور ثمرہ خالی نگاہوں سے آس پاس کے ماحول کو پھٹی پھٹی آنکھوں سے گھورتی رہتی۔ اس کمرے کی تنہائی، در و دیوار سے ٹپکتی وحشت و بے بسی ثمرہ کو ذہنی مریض بنانے لگی تھی۔ اب وہ زیر لب کچھ نہ کچھ بڑبڑاتی رہتی تھی۔

اور پھر یہ بڑبڑاہٹ بلند ترین چیخوں میں بدل گئی۔ ''وہ دیکھو مجھے گھور رہی ہے۔ وہ میرا مذاق اڑا رہی ہیں۔ وہ میری طرف بڑھ رہی ہیں۔ اماں جی مجھے مار دیں گی۔ ہر لمحہ مجھے گھورتی ہیں۔ وہ میرا گلا دبا دیں گی، مار دیں گی۔'' ثمرہ کے کمرے سے اب اس طرح کی چیخوں کی آواز آتی رہتی تھی۔

☆☆

''انس مجھے لگتا ہے مما کو مینٹل ہاسپٹل بھیجنا ہوگا۔ وہاں انہیں صحیح علاج اور توجہ ملے گی۔ یہاں ڈاکٹر سکون کی دوائیاں اور خواب آور انجیکشن دے کر چلا جاتا ہے۔ مجھے تو ڈر لگتا ہے کہ کہیں وہ خود کو یا مجھے نقصان نہ پہنچا دیں۔ ہسپتال میں رہیں گی تو ان کی ٹھیک سے دیکھ بھال ہوگی۔'' ثمرہ بیگم کی اکلوتی بہو مہا گل نے اس دن انس کو مشورہ دیا تو وہ سوچ میں پڑ گیا۔

''کہتی تو تم ٹھیک ہو لیکن وہ میری ماں ہیں۔''

''اوہو یہ کوئی پہلی ماں نہیں ہیں۔ وہاں ان جیسی بہت ساری مائیں ہوں گی۔ اکثر ماؤں کی آخری عمر گزارنے کے لیے یہ مینٹل ہاسپٹل اور ایسے دوسرے ادارے ہی اچھی جگہ ہیں۔''

کچھ پس و پیش کے بعد انس بھی بیگم کی رائے سے متفق ہو گیا۔

☆☆

''مجھے چھوڑ دو۔ یہ میرا گھر ہے۔ مجھے میرے احمر سے اور اس گھر سے دور مت لے جاؤ۔ یہاں میرا بیٹا انس رہتا ہے۔ مجھے ان سب سے دور مت لے جاؤ۔ یہ میرا پیارا گھر ہے۔ مت نکالو مجھے اس گھر سے۔'' ثمرہ کی چیخیں در و دیوار سے ٹکرا رہی تھیں۔ انس کا دل کٹنے لگا۔ آخر وہ اس کی ماں تھیں۔

''مما ہاسپٹل میں آپ کی اچھی طرح دیکھ بھال ہوگی۔ میں آتا رہوں گا آپ سے ملنے۔'' وہ انہیں نوکر کی مدد سے کار میں بٹھاتے ہوئے بہت پیار سے تسلی دے رہا تھا لیکن ثمرہ کے دل کو قرار نہیں آ رہا تھا۔

ہاسپٹل میں انہیں چھوڑ کر آتے ہوئے نہ جانے اس کی آنکھوں سے کیوں چند آنسو ٹپک پڑے۔ ثمرہ جو اس کے ساتھ ہی تھی اس نے پیار سے اس کا ہاتھ تھام لیا تھا۔

او! ڈارلنگ ڈونٹ بی اَپ سیٹ، سب ٹھیک ہو جائے گا۔ چلو آج ہم باہر دیر تک گھومیں گے۔ کھانا بھی مشہور فوڈ اسٹریٹ سے کھائیں گے اور مما کی فکر مت کرو۔ ہم انشاء اللہ ہر ویک اینڈ ان سے ملنے جایا کریں گے۔''

انس نے اس کی خوبصورت آنکھوں میں جھانکا اور دھیمے سے مسکرا دیا، اس کے وہ چند آنسو بیوی کی مسکراہٹ میں کچھ ایسے گم ہو گئے جیسے بیگم تجمل کی محبت ثمرہ نے احمر کے دل سے گم کر دی تھی اور یہ مکافات عمل ابھی نہ جانے اور کتنی بار دہرائے جانا تھا۔

☆☆☆☆

افسانہ
تحسین انجم انصاری

صفائی کی مہک

"میرا مطلب ہے آپ ساری عمر امریکہ میں رہے ہیں۔ وہاں بے شمار لڑکیاں ہوں گی، حسین بھی ہوں گی، خوش لباس بھی، کئی آپ کو بے حد پسند بھی ہوں گی، پھر آپ شادی کیوں کرنا چاہتے ہیں ادھر کی کسی لڑکی سے......

مرد کی فطرت کو عیاں کرتا، ایک افسانہ

"بھابی دُھلے کپڑوں سے صفائی کی مہک کیوں نہیں آ رہی؟"

"صفائی کی مہک؟ وہ کیا ہوتی ہے؟"

"ہماری وائف جی کہتی......

"مائی گاڈ......میں تنگ آ گئی ہوں اس اشتہار سے۔ دھنک خدا کے لیے کوئی اور چینل لگاؤ۔" شفق نے تنگ

آکر دھنک سے ریموٹ چھینا اور کھٹا کھٹ چینل چینج کرنے لگی۔ دھنک نے حیرت سے اُسے دیکھا۔

"اور ایک دھلائی چیلنج کس نے جیتا؟" دوسرے چینل پر وسیم صاحب سوال کر رہے تھے۔ صبا بے اختیار مسکرائی اور شفق کی طرف دیکھا۔ شفق نے غصے میں ایک اور چینل چینج کیا۔

"اور اس کی قیمت ہے پورے پینسٹھ روپے کم، پھر ہم بھلا دوسرا مہنگا پاؤڈر کیوں خریدیں۔" ماڈل مسکرا رہی تھی۔ جبکہ شفق دانت پیس رہی تھی۔

"آج تو لگتا ہے یہ ٹی وی کم بخت زبردستی پورے گھر کے کپڑے دھلوانے کے چکر میں ہے۔ خدا کے لیے بند کرواسے، ورنہ اماں نے سُن لیا تو سمجھ لو آج کا سارا دن صفائی ستھرائی میں گزر جائے گا۔" ستارہ نے صوفے پر دھم سے بیٹھتے ہوئے وارننگ دی تو جیسے زلزلہ سا آگیا۔

"بیٹھا تو آرام سے کرو۔" شفق خفگی سے بولی۔

"اگر اس وقت میں چائے پی رہی ہوتی تو چھلک جاتی نا؟"

"میری عقل مند ناراض کزن، میں دیکھ کر ہی بیٹھی تھی۔ ہائے داوے تم اتنی ناراض اور خفا کیوں ہو؟"

"صبح سے کچن میں کھڑی سب کے لیے ناشتہ بنا رہی تھی۔ سب کی الگ الگ فرمائشیں......دادی کو نرم پھلکے کے ساتھ رات کا سالن چاہیے تھا۔ تایا جان اور تائی جان سوکھے توسٹ چاہتے تھے کہ آج کل وہ ویٹ کم کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ چچی جان کو میٹھی لسی اور بن چاہیے تھا۔ امی ابو تو آج کل دلیے کی فرمائش کرتے نہیں تھکتے، احمد بھیا، سراج بھیا، انجم بھائی اور تم سب چٹوری لڑکیاں پراٹھوں اور آملیٹ کے بغیر ٹلتی نہیں ہو اور اتنی بے مروت ہو کہ کوئی بھی اتنی شرم نہیں رکھتی کہ ذرا سی مدد تو کردے۔"

"اوہ! تو موڈ اِس لیے خراب ہے آپ کا۔ لیکن یار یہ تو زیادتی ہے۔ پراٹھوں کے لیے آٹا کس نے گوندھا تھا۔ میری خدمات کو تم نے یکسر نظر انداز کر دیا۔" ستارہ نے شکایتی انداز میں اُسے دیکھا۔

"اور دلیہ تو امی اور ابو کے لیے تم نے مجھ سے بنوایا تھا۔" دھنک بھی نرمی سے بولی۔

"اور ٹوسٹ کس نے گرم کیے تھے۔ صبا کمر پر ہاتھ رکھ کر تیکھی نظروں سے اُسے دیکھنے لگی۔ شفق ایکدم سے دھیمی پڑ گئی۔

"ٹھیک ہے! تم سب بہت اچھی ہو۔ سب نے مدد کی۔ لیکن اتنے زیادہ پراٹھے بنانا آسان کام نہیں۔ تم جانتی ہو مجھے روٹی بنانا پسند نہیں ہے اور پھر اتنی ڈھیر ساری چائے بنانا، سرو کرنا۔ بعد میں ٹیبل کلیئر کرنا۔ میں واقعی بہت تھک گئی ہوں" شفق نے مسکین سی شکل بنائی۔

"اور ابھی برتن دھونے باقی ہیں، کچن بھی صاف کرنا ہے" ستارہ کی آنکھوں میں شرارت ناچ رہی تھی۔

"اور صاف بھی ایسے کرنا ہے کہ صفائی کی مہک آئے۔" صبا بھی شوخ ہوئی۔

"اُف! یہ صفائی کی مہک۔" شفق نے دانت پیسے تو سب نے خوب مزا لیا۔

"ویسے یہ صفائی کی مہک ہوتی کیا ہے؟" ستارہ نے ہنستے ہوئے سوال کیا تو اماں جو اندر آ رہی تھیں وہیں رُک گئیں۔

"کبھی دل سے صفائی کی ہو تو پتا چلے نا کہ صفائی کی مہک کیا ہوتی ہے۔ آج کل کی پود کوئی کام بھی تو سنجیدگی سے نہیں کرتی۔ اِدھر اُدھر دو ہاتھ مارے اور بس کام ہو گیا۔ سلیقہ کس چڑیا کا نام ہے تم کیا جانو؟ سب کو جلدی پڑی ہوتی ہے کہ جتنی جلدی ہو سکے اُلٹے سیدھے ہاتھ ماریں اور پھر کوئی اپنے موبائل سے جڑا بیٹھا ہوگا اور کوئی لیپ ٹاپ گود میں لیے سر جھکائے گردن تھکا رہا ہوگا۔ کسی کو ڈراموں کی قسطیں بے چین کر رہی ہیں تو کوئی ڈائجسٹوں میں منہ چھپائے وقت ضائع کر رہا ہے۔"

"ممّاں!" شفق لاڈ سے اماں کے گلے سے لپٹ گئی۔
"ہم بیٹیاں ہیں آپ کی۔ کبھی تو ہم سے خوش ہوا کریں۔ گھر کے سب لڑکے بھی تو یہی کرتے ہیں۔ انہیں کیوں نہیں ڈانٹتیں آپ؟" اماں نے خشمگیں نظروں سے اُسے دیکھا۔
"وہ لڑکے ہیں اور لڑکے تو لڑکے ہی ہوتے ہیں۔ اُن کے یہی طور طریقے ہوتے ہیں۔ تو کیا چاہتی ہے میں اُن سے چولہا ہانڈی کرواؤں یا اُن سے کہوں جاؤ مشین لگاؤ اور سارے خاندان کے کپڑے دھو کر دھوپ میں لٹکاؤ۔"
"ہم یہ نہیں کہہ رہے اماں!" دھنک اپنی عادت کے مطابق نرمی سے بولی۔
"لیکن موبائل اور لیپ ٹاپ اور ڈی (؟) کے اتنے زیادہ استعمال سے وقت ضائع کرنے پر انہیں بھی تو ڈانٹا کریں۔"
"ڈانٹوں اُن کو؟" اماں غصے سے بولیں۔
"ارے اگر لڑکے یہ کام نہیں کریں گے تو اور کیا کریں گے۔ کیا چار پائیاں توڑیں گے سارا دن؟"
"تو ہم کیا چار پائیاں توڑتے ہیں چچی!" صبا نے شکایتی انداز میں کہا۔ "سارا دن تو کولہو کے بیل کی طرح لگی رہتی ہیں ہم چاروں۔" وہ اپنی چچی سے کہتے ہوئے ذرا گڑبڑائی کہ وہ ہمیشہ اُسے تائی کے بجائے چچی کہنے پر ڈانٹی تھیں۔
"اور اسکول کالج سے آتے ہی ہم سب کام میں معروف ہو جاتی ہیں۔ حالانکہ اتنے تھک جاتے ہیں ہم اور ہمارے دماغ۔" ستارہ بھی دھیمی آواز میں بولی۔
"اور سب لڑکے آتے ہی ہم پر حکم چلانا شروع ہو جاتے ہیں۔ جیسے ہم اُن کی بہنیں اور کزنز نہ ہوں۔ گھر کی نوکرانیاں ہوں۔"
"بے شرمو! وہ لڑکے ہیں اور لڑکے ایسے ہی ہوتے ہیں۔ لڑکے ایسے کام کرتے اچھے نہیں لگتے۔ یہ اُن کی مردانگی کے خلاف ہے۔ ایسے کام لڑکوں کو زیب نہیں دیتے۔ اور تم سب لڑکوں کی برابری کرنے یا اُن کی نقل کرنے سے باز آ جاؤ، ورنہ خدا کا قہر ٹوٹے گا تم پر۔"
"اماں ایک بات بتائیں۔" دھنک تحمل سے بولی۔ "کیا لڑکوں کو ہر کام کی اجازت صرف اس لیے ہوتی ہے کہ وہ لڑکے ہیں۔ کیا اُن کے سارے قصور اس لیے معاف ہو جانے چاہئیں کہ وہ لڑکے ہیں؟" وہ سراپا سوال تھی۔ اماں نے غور سے اُسے دیکھا۔ شفق کے مقابلے میں دھنک بہت زیادہ تحمل والی تھی۔ ہر کام سلیقے اور طریقے سے کرتی تھی۔ نماز باقاعدگی سے پڑھتی۔ گھر سے باہر ہمیشہ حجاب کے ساتھ جاتی تھی۔ بڑوں کے ساتھ ہمیشہ عزت واحترام سے پیش آتی۔ اس لیے اماں کو اپنی یہ بیٹی بے حد عزیز تھی۔
"دیکھو بیٹی! تم کیوں اس بے کار کی بحث میں وقت ضائع کرتی ہو۔ تم جانتی ہو وقت کم ہے اور کام زیادہ ہیں۔ آج چھٹی ہونے کی وجہ سے سب دیر سے اُٹھے ہیں اور آج ہی سارے کام ختم کرنے ہیں۔ اگلے ہفتے پھر اسکول اور کالج شروع ہو جائیں گے۔ تو بہتر یہ ہے کہ سب مل کر سارے کام بانٹ لو۔ ایک گھر کی صفائی کر لے۔ ایک کپڑے دھو لے، ایک کھانا بنا لے اور باقی جو بچے وہ سب کے کپڑے استری کر دے۔ ابھی شروع کر لو گی تو شام تک کام ختم ہو جائے گا اور سب کان کھول کر سن لو۔ سب کچھ ٹھیک سے صاف ہونا چاہیے۔ اتنا صاف کہ......"
"صفائی کی مہک آئے۔" شفق نے جل کر کہا۔
"صفائی کی مہک؟" سراج بھائی نے اندر آ کر سوالیہ نظروں سے سب کو دیکھا۔
"وہ کیا ہوتی ہے سراج؟" انجم بھائی نے بمشکل اپنی ہنسی ضبط کی۔
"بس ہوتی ہے ایک چیز...... تم کیا جانو، آج گھر میں مقابلہ ہونے والا ہے۔"

"ہاں ہاں! اڑالیں ہمارا مذاق۔" اماں کے جاتے ہی شفق پھٹ پڑی۔ "اور کیا؟" ستارہ کہاں پیچھے رہتی۔ "آپ بھی کرلیں باتیں، آپ کے تو سارے قصور معاف ہیں نا۔"

"اِس لیے کہ آپ لڑکے ہیں۔" صبا بڑے انداز سے چبا چبا کر بولی تو دونوں کو بے اختیار ہنسی آگئی۔ وہ چپکے سے باہر بھاگ گئے۔ شفق ٹھنڈی سانس لے کر بیٹھ گئی۔

"سچ کہا ہے کسی نے...... عورتیں ہی عورتوں کی سب سے بڑی دشمن ہیں۔ مرد بے چارے تو خواہ مخواہ لپیٹ میں آجاتے ہیں۔"

"کیا مطلب ہے تمہارا؟" ستارہ حیران ہوئی۔

"تم خود دیکھ لو، اماں کیسے ہمیں ڈانٹ پلا کر لڑکوں کو بری الذمہ قرار دے گئیں۔ لڑکے تو لڑکے ہیں۔ لڑکے ایسے ہی ہوتے ہیں۔ لڑکوں کی مردانگی......"

"یہ مردانگی کیا بلا ہوتی ہے؟" شفق نے آنکھیں مٹکائیں۔

"جیسے عورتوں کی نسوانیت ہوتی ہے۔" صبا لاپروائی سے بولی۔

"تو کیا مردوں کی مردانگی عورتوں کی نسوانیت سے بڑھ کر ہے؟" شفق نے پوچھا۔

"ارے چھوڑو اِن باتوں کو۔" دھنک نے شفق کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی۔

"ابھی تو ہم اپنے کاموں سے گھبرا رہے ہیں اور وہ جو اگلے ہفتے ریحان بھائی پھوپو کے ساتھ آنے والے ہیں۔ پھر سوچو کتنا کام بڑھ جائے گا۔ تب تو ہمیں تگنی کا ناچ نچوایا جائے گا۔"

"ارے ہاں! میں تو بھول ہی گئی تھی۔" شفق کی ڈپریشن ایکدم سے ختم ہوگئی۔

"مجھے آج درزی کے پاس جانا ہے۔ کم بخت نے پچھلے ہفتے وعدہ کیا تھا میرے اسٹائلش جوڑے وقت پر بن جائیں گے۔ ہمیشہ ہی غلط اور جھوٹا وعدہ کرتے ہیں یہ درزی۔"

"اور پارلر کا بھول گئیں، تم جاؤ تو مجھے ضرور ساتھ لے جانا۔ مجھے نئے اسٹائل کے ہیئر کٹ کا بہت شوق ہے۔ وہی جو پچھلے ہفتے میگزین میں دکھایا تھا تمہیں۔ میرے چہرے پر سوٹ کرے گا نا؟" ستارہ نے شوق سے پوچھا۔ "ہاں۔" صبا بے خیالی میں بولی۔

"مجھے بھی تو فیشل کروانا ہے۔ یوں کرتے ہیں سب اکٹھے ہی جائیں گے۔"

"اور اماں سے کیا کہیں گے؟" شفق نے سوال کیا۔

"بنالیں گے کوئی بہانہ؟" ستارہ لاپروائی سے بولی۔

"میں سراج بھائی سے منت کرلوں گی۔ بڑے اچھے ہیں میرے بھائی۔"

"پھر تو شاید اماں مجھے بھی اجازت دے دیں۔ سراج بھائی پر بہت بھروسا ہے انہیں۔"

"لڑکے جو ہیں۔" دھنک بے اختیار مسکرائی۔

"لیکن تم لوگ اتنی تیاریاں کس خوشی میں کررہی ہو۔ پھوپو اور ریحان ہی تو آرہے ہیں۔"

"ریحان بھائی کہو دھنک، اماں نے سن لیا تو خیر نہیں۔"

"ارے چھوڑو! اماں کون سا اِدھر کھڑی ہیں۔" شفق لاپروائی سے بولی۔

"سنا ہے پھوپو، ریحان بھائی کے لیے دلہن تلاش کرنے آئی ہیں۔"

"پھر تو ہمیں سج بن کر رہنا چاہیے۔" ستارہ شرارت سے بولی۔

"کیوں وہ سوئمبر رچانے آرہے ہیں۔"

"کاش! ستارہ نے آہ بھری۔ کاش وہ پھولوں کی ورمالا میرے گلے میں ڈالیں۔"

"شکل دیکھی ہے اپنی۔" شفق نے مذاق اڑایا۔

"دیکھی ہے، اسی لیے تو پارلر جارہی ہوں۔" اس

نے براسامنہ بنایا۔ "کتنے دن جاؤ گی...... جس دن منہ دھویا راز کھل جائے گا۔" شفق پھر ہنسی۔

"بڑی بے رحم ہو تم" ستارہ کی آنکھیں بھیگ گئیں۔

"ویسے تائی نے کیا سوچ کر تمہارا نام رکھا تھا۔" شفق پھر بھی باز نہ آئی۔

"شفق!" دھنک نے غصے سے اُسے دیکھا۔

"تمہیں کوئی حق نہیں ستارہ سے ایسی باتیں کرنے کا۔ شکل وصورت خدا کی بنائی ہوئی ہے۔ اور تم کون سی کسی سلطنت کی شہزادی ہو جو یوں اِترا رہی ہو۔"

"یہ تو میں نہیں جانتی" شفق پر ذرا اثر نہ ہوا۔ "لیکن دیکھ لینا۔ ریحان بھائی کی نظرِ انتخاب یقیناً مجھ پر پڑے گی"

"بہت یقین ہے خود پر؟"

"ہاں ہے۔" شفق پورے اعتماد سے بولی۔

"کم از کم اِس گھر کے جھمیلوں سے تو فرصت ملے گی نا۔ ہر وقت کام، کام اور بس کام۔ لگتا ہے قائداعظم کے قول پر سب سے زیادہ اسی گھر میں عمل ہوتا ہے۔ میں تو دل سے چاہتی ہوں کہ ملک سے باہر چلی جاؤں۔ عیش و آرام کی زندگی گزاروں، یہاں کیا رکھا ہے۔ ہر وقت کے طعنے اور جھڑکیاں۔"

سب خاموشی سے اُسے دیکھ رہی تھیں۔ یہ حقیقت تھی کہ وہ گھر میں سب سے زیادہ حسین شکل وصورت کی مالک تھی۔ پھر اپنا خیال رکھنے اور فیشن کے مطابق کپڑوں کے انتخاب نے اُس کی شخصیت کی خوبصورتی میں مزید اضافہ کر دیا تھا، پھر بھی جانے کیوں دھنک نے تاسف سے اپنی اس مغرور بہن کو دیکھا اور پھر اُس کی آنکھیں ستارہ کے مایوس چہرے پر ٹک گئیں۔

☆......☆......☆

دادی جان مہر النساء بیگم اپنے تین بیٹوں، اُن کی بیویوں اور اولادوں کے ساتھ قدیم طرز کے اس بڑے سارے گھر میں مقیم تھیں۔ بیٹی اکلوتی تھی جو شادی کے بعد بیرونِ ملک چلی گئی تھی۔ انجم اور سراج بڑے بیٹے کی اولادیں تھیں۔ ستارہ اُن کی اکلوتی اور لاڈلی بہن تھی۔ دھنک اور شفق منجھلے بیٹے کی کل کائنات تھیں۔ صبا اور احمد سب سے چھوٹے بیٹے کی اولاد تھے۔ سب میں بے انتہا پیار و محبت تھا۔ دوستی تھی اور ایک دوسرے کے جذبات کا احساس تھا۔ ہنسی مذاق میں باتیں کہہ جانا ایک الگ بات تھی۔ لیکن کسی ایک سے بھی چند گھنٹوں سے زیادہ ناراض رہنا ناممکنات میں شامل تھا۔ دادی جان سب پر کڑی نظر رکھتی تھیں۔ پھر بھی سب آپس میں مل کر چھپ چھپا کر دل کی حسرتیں پوری کر لیا کرتے تھے اور یہ حسرتیں کیا تھیں۔ موبائل، کمپیوٹر اور ٹی وی ڈرامے...... لڑکیوں کو لباس اور بجنے سنورنے کا شوق تو ہوتا ہے۔ لیکن حدود سے تجاوز کسی نے نہیں کیا تھا۔ پھوپو کی ایک ہی اولاد تھی ریحان، جسے انہوں نے انتہائی لاڈ پیار سے پالا تھا۔ ہتھیلی کا چھالا بنا کر رکھا تھا۔ ہر خواہش پوری کی تھی۔ امریکہ جیسے ملک میں باندھ کر رکھنا تو ناممکن تھا۔ سو اُسے پوری آزادی تھی اور اُس نے آزادی کا بھرپور فائدہ اٹھایا تھا۔ وجیہہ تھا، ایک نظر پڑتی تو دوسری ڈالنا ضروری ہوتا۔ پھوپو اپنے اکلوتے ہیرے کے لیے لڑکی پاکستان سے لانا چاہتی تھیں۔ ریحان جذبذ تھا۔ لیکن ماں نے سمجھایا، دور اندیشی سے کام لیتے ہوئے کئی اسرار و رموز سے پردہ اٹھایا۔ پورے مستقبل کی بنیاد اور ازدواجی زندگی کے سکون سے لے کر آئندہ آنے والی نسلوں کی خیر خواہی کے متعلق ایسا نقشہ کھینچا کہ ریحان کو حامی بھرنے کے سوا چارہ نہ تھا۔ یوں بھی پاکستان آ کر یہاں کی لڑکیوں کو نظر بھر کر دیکھنے اور نئی منزلیں، نئی چوٹیاں سر کرنے کا شوق اُس کے دل میں انوکھا ولولہ بھر گیا تھا۔ دل لگی کا تو وہ ہمیشہ سے شوقین تھا۔ تھوڑا فلرٹی بھی تھا۔

☆......☆......☆

ایک ہفتے کے اندر ہی پھوپو نے جان لیا تھا کہ وہ جس قسم کی لڑکی کو بہو بنانا چاہتی ہیں وہ دھنک کے علاوہ کوئی اور نہیں ہو سکتی۔ اُس کا تحمل، برداشت میٹھا لہجہ،

خوش لباسی، تمکنت، مذہب سے خاص لگاؤ۔ کوئی نماز مس نہ کرنا، بڑوں کے ساتھ تمیز اور عزت سے پیش آنا اور گھر سے باہر حجاب کے ساتھ جانا انہیں بے انتہا متاثر کر گیا تھا۔ اُس کی ہر بات اُن کے دل میں اُتر گئی تھی۔

لیکن ریحان کو ان تمام باتوں سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ وہ تو صرف اس لیے اُس کے دل میں گھر کر گئی تھی کہ دھنک نے ریحان کو قابلِ توجہ نہیں سمجھا تھا۔ اُس کے آگے پیچھے نہیں پھری تھی۔ حقیقتاً اُسے بالکل نظر انداز کر دیا تھا۔ ہاں اُس کی خوش لباسی بھی اُسے پسند آئی تھی۔ لیکن وہ تو باقی لڑکیوں میں بھی تھی۔ جو ہر دم اُس کے آگے پیچھے پھرتی تھیں۔ اُس کی تمکنت سے بھی وہ متاثر ہوا تھا جو کسی اور میں نہ تھی۔ مذہب سے لگاؤ اور نماز کی باقاعدگی کو وہ اُس کا ذاتی مسئلہ سمجھتا تھا اور جانتا تھا کہ وہ اُسے مجبور نہیں کر سکتی۔ بس اُس کا حجاب اوڑھنا اُسے ناپسند تھا۔ لیکن اُسے یقین تھا کہ شادی کے بعد وہ آسانی سے یہ سب قدامت پسندی چھڑا لے گا، سو اُس نے دھنک کے حق میں فیصلہ کر لیا۔

پھوپو بے انتہا خوش تھیں۔ انہوں نے اپنی ماں کو ریحان کے انتخاب سے آگاہ کیا تو وہ بھی مطمئن نظر آئیں۔ اُن کو پکا یقین تھا کہ اپنے تحمل، بردباری اور برداشت کی وجہ سے وہ اُن کی واحد پوتی ہے جو ریحان کے ساتھ چل سکتی ہے۔ ریحان کی اچھی بری عادتوں کے ساتھ نباہ کر سکتی ہے۔ دھنک کو پتا چلا تو وہ کچھ عرصہ خاموش رہی، پھر بصد احترام دادی سے مخاطب ہوئی۔

''دادی جان! میں ریحان سے بات کرنے کے بعد اپنا فیصلہ بتاؤں گی۔'' دادی نے حیرت سے اُسے دیکھا۔ کم از کم دھنک سے انہیں اُمید نہ تھی کہ اُن کے فیصلے پر کچھ بولے۔

''کیا مطلب ہے تیرا دھنک؟ فیصلہ تو ہو چکا۔ ریحان نے تجھے پسند کر لیا ہے۔''

''لیکن دادی جان! ابھی میں نے فیصلہ نہیں کیا کہ ریحان مجھے ہمسفر کے طور پر پسند ہے یا نہیں۔''

اُس نے نہایت سنجیدگی اور متانت سے کہا تو دادی حیرت سے اُسے دیکھتی رہ گئیں۔ وہ لڑکی جسے وہ آج تک صبر و تحمل کی تصویر سمجھتی آئی تھیں کہ وہ بڑوں کی ہر بات برداشت کر جاتی تھی۔ انتہائی مذہبی گردانتی تھیں بلکہ ایک لحاظ سے دبو خیال کرتی تھیں کہ وہ اپنے خیالات کا بہت کم اظہار کرتی تھی آج اس طرح بول رہی تھی، حالانکہ آج بھی وہ انتہائی شائستہ الفاظ میں اپنی خواہش کا اظہار کر رہی تھی۔

''تجھے آخر اُس سے کیا بات کرنی ہے؟''

''یہ تو میں ریحان کو ہی بتاؤں گی دادی اماں۔'' وہ یہ کہہ کر خاموشی سے دھیمی چال چلتی کمرے سے نکل گئی۔

☆......☆......☆

''آپ نے شادی کے لیے مجھے کیوں چنا ریحان؟'' وہ دونوں لان میں پتھریلے بینچ پر ذرا فاصلہ دے کر بیٹھے تھے۔

''کیا مطلب؟'' ریحان نے حیرت سے اُسے دیکھا۔

''میرا مطلب ہے آپ ساری عمر امریکہ میں رہے ہیں۔ وہاں بے شمار لڑکیاں ہوں گی، حسین بھی ہوں گی، خوش لباس بھی، کئی آپ کو بے حد پسند بھی ہوں گی، پھر آپ شادی کیوں کرنا چاہتے ہیں اِدھر کی کسی لڑکی سے؟''

''ماما نے کہا تھا یہ میرے اور مستقبل کی نسلوں کے لیے بہتر ہے۔''

''اوہ! ماما نے کہا تھا'' دھنک بے اختیار مسکرائی۔

''وہ تو پھوپو کا خیال ہے، آپ کا کیا خیال ہے؟ کیا وہاں آپ کو کوئی لڑکی پسند نہیں آئی۔''

''آئی تھیں، بے شمار لڑکیاں ہیں۔ خوبصورت بھی اور ذہین بھی، لیکن تم تو جانتی ہو کہ وہاں لڑکیاں کیسی آزاد زندگی گزارتی ہیں۔ آئی مین شادی سے پہلے ہی......''

وہ چپ ہو گیا تو دھنک نے غور سے اُسے دیکھا۔

''جانے کس کس کے ساتھ افیئر زچلاتی ہیں۔''

''اور آپ! آپ نے کیسی زندگی گزاری وہاں۔ میرا مطلب ہے کیا آپ نے وہاں اُن لڑکیوں سے مختلف زندگی گزاری۔ کیا آپ...... کیا آپ...... میرا مطلب ہے۔'' وہ کچھ جھجکی۔

''میرا مطلب سمجھ رہے ہیں آپ؟''

''اب ایسی بھی کوئی بات نہیں۔'' اُس کے وجیہہ چہرے پر غرور کے اثرات اُبھرے جیسے وہ کئی چوٹیاں سر کر چکا ہو اور اُس پر اُس کا سینہ فخر سے پھول رہا ہو۔

''میں خوبصورت ہوں، جوان ہوں اور پھر ایسے ملک میں رہتا ہوں جہاں ہر طرف ایسے ہوشربا نظارے بکھرے ہوتے ہیں کہ کوئی زاہد خشک بھی ہو تو اپنی قسم توڑ دے۔''

''تو آپ نے بھی اپنی قسم توڑ دی؟''

''میں نے قسم کھائی کب تھی؟'' وہ استہزائیہ انداز میں بولا۔

''کئی لغزشیں ہوئیں مجھ سے بھی، اس عمر میں ایسے حادثات تو ہوتے ہی رہتے ہیں۔ اور میں فرشتہ تو ہوں نہیں۔ گوشت پوست کا دل ہے، جو بہک جاتا ہے۔ یقینی طور پر بہک سکتا ہے۔ اور میں بھی کئی بار بہکا، لیکن جب شادی ہو جائے گی تو......'' وہ خاموش ہو گیا جیسے کچھ کہنا نہ چاہتا ہو۔ کوئی کمٹمنٹ نہ کرنا چاہتا ہو۔

کتنے خاموش لمحے بیت گئے۔ آخر دھنک نے ہی زبان کھولی۔

''آپ نے قرآن پاک پڑھا ہے۔'' دھنک نے دھیمی آواز میں پوچھا۔

''کیا مطلب ہے تمہارا؟'' وہ بگڑ کر بولا۔

''آخر میں ایک مسلمان کی اولاد ہوں۔''

''مسلمان کی اولاد تو ہیں، لیکن کیا خود بھی مسلمان ہیں؟''

''ظاہر ہے۔'' وہ ناگواری سے بولا۔

''یہ کس قسم کا سوال ہے؟''

''پھر آپ نے مجھ سے رشتہ جوڑنے کی جرأت کیسے کی ریحان؟'' وہ متانت اور سنجیدگی سے بولی۔

''آپ جانے کتنی لڑکیوں سے رشتہ جوڑ چکے ہیں۔ کتنی لڑکیوں کو محبت کے نام پر دھوکہ دے چکے ہیں اور اس پر فخر بھی ہے آپ کو۔ کوئی پچھتاوا یا شرمندگی نہیں۔ معاف کیجیے گا آپ کے لیے آپ جیسی لڑکی ہی مناسب رہے گی۔ پھوپو سے کہہ دیجیے گا کہ آپ مجھے شوہر کے روپ میں قبول نہیں ہیں۔ مجھے آپ سے گھن آتی ہے۔ بدبو محسوس ہوتی ہے۔'' وہ ڈرے یا جھجکے بغیر اطمینان سے بولی۔

''بدبو...... یومین بیڈ اسمیل؟'' ریحان نے حیرت سے اُسے دیکھا۔ تذلیل کے احساس سے اُس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔

''واٹ ربش؟ آر یُو کریزی؟ میں نے دنیا کا بہترین اور مہنگا پرفیوم خود پر چھڑکا ہوا ہے۔ خوشبو سے نہایا ہوا ہوں اور تم کہہ رہی ہو مجھ سے بو آ رہی ہے؟''

''آپ جتنا بھی رگڑ رگڑ کر نہالیں۔ جتنی چاہے خوشبو استعمال کرلیں ریحان...... لیکن آپ سے صفائی کی وہ مہک کبھی نہیں آسکتی۔ اس لیے کہ آپ کا دل صاف نہیں۔ آپ کا من اُجلا نہیں ہے۔ آپ کے خیالات اور نظریات شفاف نہیں ہیں۔ ایک پاکیزہ مرد کے گرد یہ مہک ایک ہالے کی صورت اُس کا احاطہ کیے رکھتی ہے۔ لیکن آپ کی تو آنکھیں بھی آپ کا راز ظاہر کیے دیتی ہیں۔ آپ کی آنکھوں میں پاکیزہ شفاف چمک ناپید ہے۔ لیکن آپ کا شکریہ کہ آپ کی وجہ سے مجھے پتا چل گیا کہ صفائی کی مہک کیا ہوتی ہے۔''

وہ رُخ موڑ کر تمکنت سے چلتی گھر کے اندر چلی گئی جبکہ ریحان کچھ نہ سمجھنے والے انداز میں وہاں کھڑا رہا۔ پھر لاپروائی سے شانے اُچکائے اور نئی منزلیں تلاشنے گیٹ سے باہر نکل گیا۔

☆☆......☆☆

ناولٹ

نعمان اسحق

میرے پرندہ دل

"مینا۔ سچ بتانا بالکل سچ۔ تمہیں کیا چیز چاہیے؟ شہرت یا محبت......؟" ملہ کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ چہرہ بھی تناؤ کا شکار ہو رہا تھا۔ مینا کو سوچنے کی ضرورت نہیں تھی۔ اسے پتا تھا کہ اسے کیا چاہیے، لیکن اعتراف کرنا اس کے لیے بہت مشکل تھا۔ "مینا بتاؤ بھی......

زندگی کی کٹھنائیوں کو عیاں کرتے، ایک خوبصورت ناولٹ کا آخری حصہ

"ہنسنا بند کرو۔" غالب نے تقریباً چلا کر کہا تھا اور رطابہ کی ہنسی کو ایک دم بریک لگ گئے تھے۔ رطابہ نے غالب کے چہرے اور آنکھوں میں دیکھا تھا، وہاں وحشت تھی۔

"تو کیا رونا شروع کردوں۔" رطابہ نے چند لمحوں بعد کہا تھا۔

"بکواس بند کرو۔"

"نہیں بتاؤ تو، کیا رونا شروع کردوں، کیوں کہ تمہارا ایک بازو کٹ گیا ہے۔" رطابہ نے دوبدو کہا تھا۔

غالب کو یہ اُمید نہیں تھی۔ ایک عجیب طرح کا تناؤ اس کے چہرے پر آگیا۔ رطابہ کو کہنے کے لیے اس کے پاس کچھ نہیں تھا۔ غالب کو رونا آیا تھا، لیکن اُس نے ضبط کیا تھا۔ اِس وقت وہ رونا نہیں چاہتا تھا۔

"تم خود ترسی میں کیوں مبتلا ہو غالب۔ خدا کی قدرت، جو ہونا تھا ہو چکا۔ اب پلیز......" رطابہ نے فقرہ ادھورا چھوڑا تھا۔

غالب نے اس کا کوئی جواب نہ دیا تھا۔ وہ ابھی تک بیڈ کی پشت سے ٹیک لگائے بیٹھا ہوا تھا۔ غالب نے اپنے ہونٹ ایک دوسرے میں پیوست کیے تھے۔ ایک گہری سانس لینے کے بعد ایک طویل گہری سانس خارج کی تھی۔

"میں تم سے شادی نہیں کرسکتا۔" چند لمحوں بعد غالب نے رطابہ سے کہا تھا۔ رطابہ نے غالب کو دیکھا تھا۔ اسے اُمید تھی کہ شاید غالب اس سے یہ کہے گا۔

"اوہ......تو میں رخصتی کے بغیر ہی یہاں اپنے گھر آؤں گی۔" رطابہ نے 'اپنے گھر' پر زور دیا تھا۔

"نہیں تم اس گھر میں نہیں آؤ گی۔"

"کیوں؟ کہیں اور شفٹ ہونا ہے یا کوئی اور اہم وجہ۔"

"وجہ۔" غالب استہزائیہ ہنسا تھا۔ "وجہ ہے نا، یہ......" غالب نے اپنا بایاں بازوں رطابہ کے سامنے کیا تھا، جو کہنی تک محدود تھا۔

"بڑی خوب وجہ ہے۔ اگر میرے ساتھ یہ حادثہ ہوتا تو تب بھی تم مجھے یہی کہتے۔"

"رطابہ۔" غالب نے چند لمحوں کے وقفے کے بعد کہا تھا۔ "میں نے تمہیں طلاق دینے کا فیصلہ کیا ہے۔"

غالب کے الفاظ سن کر رطابہ کو اپنا سر گھومتا ہوا

محسوس ہوا تھا۔

زندگی میں پہلی بار اسے بڑی شدت سے غصہ آیا تھا۔ رطابہ چپ چاپ اٹھی تھی۔ غالب کے قریب گئی تھی اور اسے بڑے زور سے تھپڑ مارا تھا۔ غالب کو توقع ہرگز نہیں تھی اس سے۔

بچپن میں مینا کو مارنے کے علاوہ رطابہ نے پہلی بار کسی کو تھپڑ مارا تھا۔ وہ بھی اس شخص کو، جس کے ساتھ اس کا نکاح ہو چکا تھا۔ غالب کو بھی زندگی میں پہلی بار کسی نے تھپڑ مارا تھا۔

''آئندہ کچھ ایسا اول فول بکا تو زبان کھینچ لوں گی۔'' رطابہ نے پھنکارتے ہوئے کہا تھا اور کمرے سے باہر چلی گئی تھی۔

رطابہ کے کمرے سے باہر جانے کے بعد غالب کی آنکھوں سے آنسو نکلے تھے اور کمرے سے باہر جاتے ہوئے رطابہ کی بھی آنکھیں نم ہوگئی تھیں۔

......☆☆☆......

وہی ڈائننگ ٹیبل تھی۔ طٰہٰ اور مینا بیٹھے تھے۔ مغرب کی اذان میں کچھ وقت باقی تھا۔ انہوں نے کھانا کھا لیا تھا اور اب وہ دونوں باتیں کر رہے تھے۔ مینا کی گفتگو میں اب فلمی باتوں کا گراف قدرے کم ہوتا تھا۔

طٰہٰ کچھ دنوں سے محسوس کر رہا تھا کہ مینا اب کافی خاموش اور کھوئی کھوئی رہنے لگی ہے۔ ابھی کچھ دن پہلے تو طٰہٰ نے یہ بھی تجزیہ کیا تھا کہ ایک مووی دیکھتے ہوئے وہ اتنی ایکسائٹڈ بھی نہیں تھی جیسا کہ وہ کچھ عرصہ سے ہوا کرتی تھی، ہاں البتہ وہ فلم کافی غور سے دیکھ رہی تھی۔ یہ مثبت تبدیلی تھی یا منفی۔ طٰہٰ کو کچھ اندازہ نہ تھا۔

''شاید ماریہ یہاں نہیں ہے اس لیے......'' طٰہٰ نے لمحاتی طور پر سوچا تھا، لیکن یہ اسے کوئی وجہ محسوس نہ ہوئی۔ مینا فلمیں دیکھتی تھی، اسے فلموں کا چسکا پڑ گیا تھا، لیکن اس میں ماریہ کا اتنا قصور نہ تھا جتنا کے مینا کا۔ خود طٰہٰ کو ماریہ کے گھر کے بارے میں اندازہ تھا۔ وہ لڑکی بلاشبہ شوبز کی اَپ ڈیٹس سے باخبر رہتی تھی، لیکن اسے اپنی زندگی پر حائل نہیں کرتی تھی۔ Just as a Refreshment، لیکن مینا جو فلموں میں غرق ہوئی تو اسے طٰہٰ اور گھر کا ہوش ہی نہ رہا۔ نماز قرآن کی تو وہ اب بھی پابند تھی، لیکن فلموں نے اسے دوسرے لوگوں سے بہت دور کر دیا تھا۔ بہت دور کہ اب اسے کسی دوسرے کی تنبیہ سنائی ہی نہیں دیتی تھی۔

طٰہٰ مینا سے اس موضوع پر بھرپور انداز میں بات کرنا چاہتا تھا۔ وہ مینا کو ہر پہلو دکھانا چاہتا تھا اور اسے باور کرانا چاہتا تھا کہ وہ اسے نظر انداز کر رہی ہے، لیکن اسے کوئی مناسب موقع ہی نہیں مل رہا تھا۔

''کہاں کھوئی بیٹھی ہو۔'' طٰہٰ نے مینا کو مخاطب کیا تھا جو مسلسل اس کے چہرے کو تکے جا رہی تھی۔

''آں آں۔ کچھ نہیں۔'' مینا ایک دم چونک پڑی تھی۔

''کیا دیکھ رہی تھی۔'' طٰہٰ کا موڈ آپ ہی آپ بہت خوشگوار ہو گیا تھا۔ اسے مینا کا یوں دیکھنا بہت اچھا لگا تھا۔

''بتاؤ نا۔ کیا دیکھ رہی تھی۔'' طٰہٰ نے دوسری بار پوچھا تھا۔

''آپ کی شکل رنویر سنگھ کے ساتھ کتنی ملتی ہے۔'' مینا نے کچھ وقفے کے بعد کہا تھا۔ طٰہٰ کی مسکراہٹ سکڑتے سکڑتے معدوم ہو گئی۔ اسے بہت بُرا لگا تھا، ایسے جیسے کسی نے ہتھوڑا اس کے دماغ کے انتہائی نازک حصے پر مارا ہو۔

''تمہیں یہ مشابہت کیوں کر نظر آئی۔'' طٰہٰ بُری طرح چڑ بھی گیا تھا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ طٰہٰ مینا کے ساتھ اس طرح تیز آواز میں بات کر رہا تھا۔ ایکدم مینا بوکھلا گئی تھی۔

''آپ کو بُرا لگا۔ سوری۔'' چند لمحوں کے وقفے کے بعد مینا نے کہا تھا۔

''کیا تمہیں نہیں لگتا کہ تم فلموں میں مست ہو گئی ہو، یہاں تک کہ مجھے بھی نظر انداز کرنے لگی ہو۔'' طٰہٰ کی آنکھوں کی پتلیاں سکڑی ہوئی تھیں اور اس کی آنکھیں بھی سرخ ہو رہی تھیں۔

مینا نے سر جھکا لیا تھا۔

طٰہٰ مینا کو کچھ دیر دیکھتا رہا، جب مینا نے کوئی جواب نہ دیا تو اس نے آنکھیں بھینچ لیں۔ مینا سر جھکائے بیٹھی رہی۔ کتنے ہی لمحے یوں ہی گزر گئے۔ خاموشی میں۔

''سوری'' طٰہٰ کو مینا کی آواز سنائی دی تھی۔

طٰہٰ نے آنکھیں کھولی تھیں۔ مینا سر جھکائے بیٹھی ہوئی تھی، غالباً گود میں پڑے اپنے ہاتھوں کو تک رہی تھی۔

طٰہٰ کو اتنی چھوٹی معذرت کی امید نہ تھی۔ مینا نے تو یہ بھی نہیں کہا تھا کہ آئندہ ایسے نہیں ہوگا۔ طٰہٰ کو دکھ ہوا تھا۔

''اِٹس اوکے۔'' طٰہٰ نے کہا تھا، لیکن قدرے بے دلی سے۔

''احتیاط کیا کرو مینا۔ مجھ سے برداشت نہیں ہوتی تمہاری عدم توجہی۔ تم سے پیار کرتا ہوں میں۔'' طٰہٰ نے مینا کی گود میں پڑے ہاتھوں پر اپنا ہاتھ دھرا تھا۔

مینا نے نظر اٹھا کر طٰہ کی طرف دیکھا تھا۔ طٰہ کے چہرے پر مینا کو محبت دکھائی دی تھی۔ مینا نے نظریں جھکائی تھیں۔ حلق میں آنسوؤں کا گولہ اٹک گیا تھا، لیکن مینا نے ضبط سے کام لیا تھا۔ وہ رونے سے باز رہی تھی۔ وہ بھی طٰہ سے کچھ کہنا چاہتی تھی۔ کافی دنوں سے۔ طٰہ کی محبت ناکافی ہو رہی تھی اس کے لیے، کچھ اور چاہیے تھا اسے۔ مغرب کی اذانیں ہونا شروع ہو گئی تھیں۔

''چلو اٹھو نماز پڑھو۔ میں بھی مسجد میں نماز پڑھ کر آتا ہوں۔'' طٰہ نے مینا کا ہاتھ چھوڑ دیا تھا۔ مینا کے چہرے پر آئی ہوئی لٹ کو کان کے پیچھے اڑسا تھا اور پھر اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

''اٹھو بھی'' طٰہ نے دوبارہ کہا تھا۔

روزانہ مینا نماز پڑھنے کی بات کرتی تھی۔ آج طٰہ کر رہا تھا۔ مینا اٹھ کھڑی ہوئی۔

''اچھا۔ خدا حافظ'' طٰہ روانہ ہوا تھا۔

''خدا حافظ'' مینا نے اتنی کم آواز میں کہا تھا کہ اسے خود بھی بہت مشکل سے سنائی دیا تھا۔

طٰہ مسجد چلا گیا اور مینا وضو کرنے کے لیے واش روم میں۔ واش بیسن کے سامنے لگے شیشے پر مینا کو اپنا عکس نظر آیا تھا۔ اپنا عکس دیکھ کر اسے پھر سے رونا آ گیا تھا۔

اس بار مینا نے اپنے آپ کو رونے سے نہیں روکا تھا۔ رونے کے درمیان وہ مشکل اپنے آنسو صاف کرتی رہی تھی۔

جتنی محبت مینا کو اس وقت میسر تھی، وہ اس کی ضرورت سے زیادہ تھی...... بہت زیادہ۔ دراصل اسے شہرت کی طلب ہونا شروع ہو گئی تھی۔ شدید طلب...... شاہ رخ، ایشوریہ اور کترینہ کے پاس موجود شہرت جیسی طلب...... کیا کرتی؟؟ اپنے طلب کے بے ہودہ پن کا اسے اندازہ تھا۔ اور شاید اُس کے رونے کی وجہ بھی یہی تھی۔ ویسے اس نے طٰہ کے چہرے میں رنویر سنگھ کی مشابہت بھی اسی لیے ڈھونڈی تھی، کیوں کہ وہ طٰہ کو بتانا چاہتی تھی کہ...... کہ...... اسے Fame چاہیے۔

......☆☆☆......

شاید رطابہ کا تھپڑ غالب کو کافی ہوا تھا...... آج غالب پہلی بار گھر سے باہر نکلا تھا حماد کے ساتھ...... وہ ایک فاسٹ فوڈ سینٹر آئے تھے۔ اس سینٹر میں جب غالب داخل ہوا تھا تو کتنے ہی لوگوں نے اسے اور خصوصاً اس کے بائیں بازو کو دیکھا تھا، جو کہنی تک تھا۔ جہاں ابھی تک بینڈیج بندھا ہوا تھا...... لوگوں کو اپنی طرف متوجہ دیکھ کر غالب کو تکلیف ہوئی تھی۔

وہ ایک ٹیبل پر بیٹھے تھے۔ انہوں نے آرڈر دیا۔ غالب یہاں ریفریشمنٹ کے لیے نہیں آیا تھا۔ وہ حماد سے بات کرنا چاہتا تھا...... کھل کر بات، جو شاید گھر میں ممکن نہ تھا۔ ویسے اسے حماد بھی اپنے ساتھ ہمدردی کرتا محسوس ہوتا تھا، لیکن ایک تو غالب کو حماد سے مشورے کی عادت تھی، دوسرا وہ خود کوئی فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا۔ اس لیے وہ حماد کے ساتھ آیا تھا۔

ان کا آرڈر آنے سے پہلے ہی غالب نے اسے سب کچھ بتا دیا تھا۔

''ہوں تو تمہیں محسوس ہوتا ہے کہ سب تم سے ہر وقت ہمدردی جتاتے رہتے ہیں۔ ترس کھاتے ہیں تم پر اور اسی وجہ سے تم رطابہ سے بھی شادی نہیں کر سکتے۔ دوسرا رطابہ کے ساتھ شادی کرنے کی صورت میں رطابہ کو تمہاری ذمے داری اٹھانی پڑے گی۔ اس کی زندگی بھی خوشیوں سے محروم ہو جائے گی۔ یہی نا'' حماد نے غالب کی جانے والی باتوں کا خلاصہ بیان کرتے ہوئے تصدیق چاہی تھی اور غالب نے اثبات میں سر ہلا دیا تھا۔

''رطابہ کا رویہ کیسا ہے تمہارے ساتھ۔''

''ہمدردی بھرا''

''تم نے اس سے یہ کہا ہے؟''

''ہاں''

''اس کا کیا ری ایکشن تھا؟''

''وہ ناراض ہو کر چلی گئی تھی...... وہ کہتی ہے یہ میرا گھر ہے، میں چاہوں تو اس گھر میں بغیر رخصتی کے آجاؤں۔'' غالب نے رطابہ کے تھپڑ مارنے کی بات درمیان میں خود گول کر دی تھی۔

''اوہ'' حماد سوچ میں پڑ گیا۔

''دیکھو غالب میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ تمہیں حقیقت پسند بننا چاہیے اور خود ترسی کا شکار بھی نہیں ہونا چاہیے۔ یہ رطابہ پر منحصر ہے کہ وہ کیا کرتی ہے۔ ویسے اگر میں رطابہ کی جگہ ہوتا۔ چاہے مجھے تم نے محبت ہوتی یا نہ ہوتی میں تم سے رشتہ نہ توڑتا۔ ہمدردی کی وجہ سے نہیں بلکہ اپنے لیے۔ میں اسے اپنا مقدر مانتا...... مقدر میں کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ کیا پتا اگلے چند سالوں میں مر جاؤں تو پھر...... اس لیے میں خود غرض نہ بنتا۔ اب یہ رطابہ اور تمہارا معاملہ ہے اور اگر رطابہ گرین سگنل دکھاتی ہے تو تمہیں کوئی مسئلہ نہیں ہونا چاہیے......'' حماد ابھی مزید کچھ کہتا لیکن ان کا آرڈر آگیا تھا، اس لیے......

''بات سمجھ میں آئی!!......'' حماد نے کیچپ کی بوتل اٹھاتے ہوئے کہا تھا اور غالب نے سر اثبات میں ہلا دیا تھا۔

غالب کا کھانے کا زیادہ دل نہیں کر رہا تھا، اس لیے اس نے آدھا برگر کھا کر رکھ دیا، جسے حماد نے اپنا برگر کھانے کے بعد کھایا تھا۔

......☆☆☆......

نینا آئی ہوئی تھی......

شام کا وقت تھا۔ سیف آرام کرسی پر بیٹھے تھے، جب کہ شاہین چارپائی پر بیٹھی ہوئی تھی۔

شاہین مونگ پھلیاں چھیل رہی تھی۔ مونگ پھلیاں چھیل چھیل کر وہ ایک جار میں ڈال رہی تھی۔ سلطانہ اور رطابہ غالب کے پاس گئی ہوئی تھیں۔

نینا، سیف اور شاہین کو بتانے آئی تھی۔ مشورہ کرنے آئی تھی یا اپنا فیصلہ سنانے...... اسے خود بھی پتا نہیں تھا۔

''وہ میرے پاس آئے تھے۔'' نینا نے ایک طویل سانس لینے کے بعد اٹکتے ہوئے کہا تھا۔

''کون تمہارے پاس آئے تھے؟'' شاہین نے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔

نینا نے ایک نظر شاہین پر ڈالی۔ وہ چھلی ہوئی مونگ پھلیاں جار میں ڈال رہی تھیں۔ پھر اس نے ایک نظر سیف کو دیکھا تھا۔ سیف آنکھیں موند کر آرام کرسی کی پشت سے ٹیک لگائے بیٹھے تھے۔ نینا نے ایک اور طویل سانس لی تھی۔ پھر چند سیکنڈز کا وقفہ کیا تھا، پھر اس نے کہا تھا۔

''ایوب لغاری''

شاہین کے مونگ پھلی چھیلتے ہاتھ ایک دم رک گئے تھے اور ہاتھ میں مونگ پھلی کے جو چھلے ہوئے دانے تھے وہ بھی گر گئے تھے۔

سیف نے بھی آنکھیں کھول لی تھیں اور یکدم سیدھے ہو کر بیٹھ گئے تھے۔

''کون آئے تھے؟'' سیف کو گمان ہوا شاید کہ انہوں نے غلط سنا ہے۔

''ایوب لغاری'' نینا نے دوبارہ دہرایا۔

''تو پھر......'' سیف نے چند لمحوں بعد پوچھا تھا۔

''پھر میں ان سے ملی۔ وہ شرمندہ تھے۔ وہ اب مجھ سے تعلق رکھنا چاہتے ہیں۔ اسی لیے میرے پاس آئے تھے۔'' اتنا کہہ کر نینا چپ ہو گئی تھی۔

شاہین نے دوبارہ مونگ پھلیاں چھیلنی اور جار میں ڈالنا شروع کر دی تھیں، البتہ ان کی رفتار اب پہلے سست تھی۔

''تو پھر تم نے کیا کہا؟'' چند لمحوں کے بعد سیف نے پوچھا تھا۔

''میں نے...... میں نے منع کر دیا۔''

''کیوں؟'' سیف نے پھر پوچھا۔

نینا کو اس سوال کی توقع نہ تھی۔ اس نے کوئی جواب نہ دیا تھا، خاموش رہی وہ، کچھ لمحے پھر خاموشی میں گزرے۔

''نینا! تم نے کیوں منع کر دیا؟'' سیف نے دوبارہ پوچھا تھا۔ نینا نے سیف کو دیکھا تھا۔ اسے سمجھ نہیں آیا کہ سیف یہ سوال کیوں پوچھ رہا ہے۔

''میں نے کیوں منع کیا؟'' نینا نے سیف کا سوال زیرِلب دہرایا تھا۔

''پندرہ سال بعد اب، اب جب مجھے ضرورت نہیں رہی اور اب جب بڑھاپا ان پر حاوی ہوا چاہتا ہے۔ جب انہیں خود میرے سہارے کی ضرورت آن پڑی ہے۔ پھر جا کر انہیں میں یاد آئی۔'' یہ کہتے ہوئے نینا کے ماتھے پر شکنیں آئی ہوئی تھیں اور آواز بھی قدرے اونچی ہوگئی تھی۔

''تو پھر کیا ہوتا ہے؟'' سیف نے پرسکون انداز میں کہا تھا۔ نینا کو حیرت ہوئی تھی۔ اسے توقع نہیں تھی۔

''بہت کچھ ہوتا ہے ابو...... اب وہ کیوں آئے ہیں، جب مجھے ان کے سہارے کی ضرورت نہیں، بلکہ انہیں میرے سہارے کی ضرورت ہے۔''

''تو پھر اس وجہ کی بنا پر تم نے ان سے رابطہ نہیں کرو گی۔'' سیف نے کہا تھا۔ نینا چپ ہوگئی۔ اس نے یہ تو نہیں کہا تھا کہ وہ رابطہ نہیں کرے گی۔

سیف نے نینا کے بولنے کا انتظار کیا تھا۔ جب وہ کافی دیر نہ بولی تو انہوں نے پوچھا تھا۔

''بتاؤ نینا کیا تم نے ان سے رابطہ نہیں کرنا۔''

''نہیں۔ میں ان سے رابطہ نہیں کروں گی۔'' نینا نے کہا تھا۔ ویسے اسے اپنے کہے کا زیادہ اعتبار بھی نہیں تھا۔

''خون کے رشتے اپنے اندر بہت کشش رکھتے ہیں۔'' سیف نے دوبارہ کرسی کی پشت سے ٹیک لگائی تھی۔

نینا بھی اضطراری طور پر اپنے دائیں ہاتھ کے انگوٹھے کا ناخن، دائیں ہاتھ کی چھوٹی انگلی کے ناخن کے ساتھ ملایا تھا اور ان دونوں ناخنوں کو بے خیالی میں دیکھتی رہی تھی، چند لمحے گزرے تھے جب اسے آواز سنائی دی تھی۔

''نینا تم ان سے رابطہ کر لو۔'' شاہین نے مونگ پھلیوں کو جار میں ڈالتے ہوئے کہا تھا اور جار کا ڈھکن بند کیا تھا۔ انہوں نے تمام مونگ پھلیاں چھیل لی تھیں۔ نینا نے شاہین کو دیکھا تھا۔ ان کے چہرے پر کوئی تاثر نہیں تھا۔

نینا کی آنکھوں میں جھلمل آنسوؤں کے ننھے قطرے آگئے۔ اس کے دل کا ایک کونہ خود بھی تو یہی چاہتا تھا۔

......☆☆☆......

اس وقت ریسٹورنٹ میں زیادہ لوگ نہیں تھے۔ ان کی ٹیبل کے علاوہ صرف تین مزید ٹیبلز تھیں جن پر لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ رطابہ اور غالب دوسری بار اس ریسٹورنٹ میں آئے تھے۔

جب غالب ریسٹورنٹ میں داخل ہوا تھا تو گیٹ پر وردی میں ملبوس کھڑے گیٹ کیپر نے اس کے کٹے ہوئے بازو کو دیکھا تھا اور جب اس نے ان دونوں کے لیے گیٹ کھولا تھا اور غالب کو سلام کیا تھا تو اس کے لہجے میں ہمدردی آگئی تھی۔ پہلی بار غالب نے اس بات کا کوئی خاص نوٹس نہیں لیا تھا۔ ان کی ٹیبل پر آنے والا ویٹر بھی کتنی دیر غالب کے کٹے ہوئے بازو اور اس کے انداز دیکھتا رہا۔ غالب کے انداز بتاتے تھے کہ ابھی وہ ایک ہاتھ سے کام کرنے کا عادی نہیں ہوا ہے، اسی لیے گلاس میں پانی بھرتے ہوئے پانی گلاس کے ساتھ ساتھ ٹیبل پر بھی گرا تھا۔ غالب نے ویٹر کی

نظروں کا بھی کچھ زیادہ نوٹس نہیں لیا تھا۔ یہ خوش آئندہ تبدیلی تھی۔

کھانا کھانے کے دوران بھی غالب کو دقت ہوئی تھی، لیکن رطابہ نے اس کی کوئی مدد نہیں کی تھی، کیوں کہ رطابہ چاہتی تھی کہ غالب اپنے آپ کو محتاج تصور نہ کرے۔ غالب رطابہ سے اس معاملے پر بات کرنا چاہتا تھا۔ دوٹوک بات، لیکن کر نہیں پا رہا تھا۔ اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ بات کہاں سے شروع کرے۔

کھانا ختم ہو چکا تھا اور ویٹر آ کر برتن اٹھا کر لے گیا تھا۔

''تم نے پیپرز کی تیاری شروع کی ہے؟ تمہیں پتا ہے تمہارے پیپرز کو اب صرف ایک مہینہ اور دو تین دن رہ گئے ہیں۔'' رطابہ نے ٹشو سے ہاتھ صاف کرتے ہوئے کہا تھا۔

''ہوں۔ آج سے شروع کروں گا۔'' غالب نے جواب دیا۔

''اچھی بات ہے۔ کیا ارادے ہیں اس بار کوئی Distinction لینی ہے؟ پچھلے سال بھی تو تمہاری Distinction آئی تھی۔''

''پتا نہیں۔ رطابہ میں نے تم سے ایک بات کرنی ہے؟'' غالب کو رطابہ کے اس انٹرویو سے الجھن ہونے لگی تھی۔ اسی لیے اس نے اصل موضوع کی تمہید باندھی تھی۔

''ہوں۔ کرو۔ میں نے تمہیں منع کیا ہے بھلا؟''

غالب چند لمحے خاموش بیٹھا رہا۔ لاشعوری طور پر الفاظ کے چناؤ کے لیے۔ پھر وہ گویا ہوا۔

''رطابہ...... تمہیں کچھ سوچ سمجھ کر فیصلہ لینا چاہیے۔ بات ایک دو دن یا ایک دو مہینے کی نہیں، بلکہ پوری زندگی کی ہے۔ کیا تم زندگی بھر ایک ادھورے انسان کے ساتھ گزارہ کر سکتی ہو؟'' رطابہ کہنی ٹکائے مسلسل غالب کو دیکھے گئی۔

''ایک ہاتھ نہ ہونے سے کوئی ادھورا نہیں ہوتا۔ اگر تمہیں یہ بات سمجھ میں نہیں آتی تو میں کیا کروں۔ اور رہ گئی بات میرے زندگی گزارنے کی تو میں خوش و خرم زندگی گزار سکتی ہوں، کیوں کہ تم میرے ساتھ ہو گے۔ تم میرے ہو غالب۔ یہ بات بھی اگر تمہاری سمجھ میں نہیں آتی تو میں کیا کروں۔

"I Love You" رطابہ نے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔ نظریں ہنوز غالب پر ہی گڑی ہوئی تھی۔ غالب کو اپنے اندر ایک سکون سا اترتا ہوا محسوس ہوا تھا۔

رطابہ نے اِدھر اُدھر دیکھا تھا۔ اِکا دُکا ہی لوگ بیٹھے ہوئے تھے، لیکن کوئی بھی ان کی طرف متوجہ نہیں تھا۔ اس نے ٹیبل پر دھرے غالب کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا تھا اور غالب کے ہاتھ کو دبایا تھا۔ غالب کے اطمینان میں کچھ اور اضافہ ہوا تھا۔

......☆☆☆......

مینا اپنے بیڈروم کی کھڑکی میں کھڑی تھی۔ جو لان میں کھلتی تھی اور اس وقت اس کھڑکی سے پندرھویں کے چاند کا موازنہ کرتی تھی۔ اس کا ذاتی تجزیہ یہی تھا کہ ان تینوں راتوں کے چاند ایک جتنے ہوتے ہیں، بس تیرھویں اور پندرھویں کے چاند چاندنی ذرا دیر سے پھیلاتے ہیں اور ان کی چاندنی ذرا کم بھی ہوتی ہے۔ اس وقت چاند اپنی چاندنی سے ہر چیز کو معطر کر رہا تھا۔

طٰہٰ بیڈ پر سویا ہوا تھا۔ بائیں کروٹ پر...... یہ عادت بھی مینا کے کہنے پر پڑی تھی۔ مینا پندرہ منٹ سے کھڑکی میں کھڑی تھی۔ وہ چاند میں کسی غیر مرئی نقطے کو دیکھ رہی تھی، لیکن وہ چکور نہیں تھی۔

رات کے ڈھائی بجے وہ کھڑکی میں کھڑی تھی۔ بچپن سے ہی وہ بھوک اور نیند کی کچی تھی۔ اس نے بچپن اور لڑکپن میں کبھی ناشتا، دوپہر یا رات کا کھانا نہیں چھوڑا تھا اور نیند بھی ایسی آتی تھی کہ رات کے دس بجتے ہی اس کی آنکھیں بند ہونے لگتیں۔ طٰہٰ کے ساتھ

شادی کے بعد اسے بھوک پر اس قدر کنٹرول ہوگیا تھا کہ جب طٰہٰ شام چار اور پانچ کے درمیان آتا تو وہ اس کے ساتھ لنچ کرتی اور نیند......

نیند تو ویسے ویسے اڑنے لگی تھی۔ جیسے جیسے اس کی شہرت کی طلب بڑھتی رہی تھی اور آج یہ وقت آگیا تھا کہ رات کے اڑھائی بج رہے تھے اور وہ......

یوں ہی وقت گزرتا جارہا تھا کہ طٰہٰ اس کے پیچھے آکھڑا ہوا۔ مینا کو طٰہٰ کی موجودگی کا احساس بھی طٰہٰ کے پکارنے پر ہوا تھا۔

طٰہٰ مضبوط قد کاٹھ کا چوڑے سینے والے جوان تھا، جب کہ مینا متوسط قد کی اچھے نقوش رکھنے والی دودھیا مائل رنگ کی لڑکی تھی۔ طٰہٰ کے پکارنے پر مینا نے اپنا رخ موڑا تھا۔

اب طٰہٰ اور مینا ایک دوسرے کی طرف رخ کیے ہوئے آمنے سامنے کھڑے تھے۔ مینا کا قد طٰہٰ کے کندھوں سے بھی ذرا نیچے آتا تھا۔ اس کھلی کھڑکی سے آنے والی چاندنی براہ راست ان پر پڑ رہی تھی۔ اس لیے ماحول کافی فسوں خیز تھا۔

''مینا کیا ہوا؟'' طٰہٰ نے پوچھا تھا۔ طٰہٰ کی محبت بولی تھی۔

طٰہٰ...... مینا کا شوہر...... محبت کرنے والا...... جان لٹانے والا......اس کے عشق میں جینے اور مرنے والا......

لیکن مسئلہ یہ تھا کہ مینا کو محبت کی کچھ زیادہ ضرورت نہ تھی......

''کک کک...... کچھ نہیں۔'' مینا نے اٹکتے ہوئے کہا تھا۔ طٰہٰ سے جھوٹ بولتے ہوئے اس کی زبان خود بخود اٹکتی تھی۔

''مینا...... جان...... کیا مسئلہ ہے...... مجھے نہیں بتاؤ گی...... میں ویسے بھی کچھ دنوں سے محسوس کر رہا ہوں تم بالکل چپ چاپ ہو۔ خاموش خاموش...... نہ مجھ سے باتیں کرتی ہو اور نہ ٹی وی دل چسپی سے دیکھتی ہو۔ کیا ہوا؟ اب فٹافٹ مجھے بتاؤ کیا پرابلم ہے۔'' طٰہٰ نے اب بازو مینا کے کندھوں پر رکھتے ہوئے استحقاق بھرے لہجے میں پوچھا تھا۔

طٰہٰ کے انداز اور الفاظ سے مینا کو کچھ ہوا تھا...... اسی لیے تو آنکھوں سے موٹے موٹے آنسو نکلے تھے اور اس کے گالوں پر پھسلتے چلے گئے تھے۔

طٰہٰ اور مینا صرف چند انچوں کے فاصلے پر کھڑے تھے اور طٰہٰ مسلسل مینا کے چہرے کو ہی دیکھے جارہا تھا۔ چاندنی بھی ان پر پڑ رہی تھی۔ اسی لیے مینا کو طٰہٰ کے آنسو نظر آگئے تھے۔

''مینا تم رو رہی ہو...... کیا ہوا سویٹو......'' طٰہٰ کے لہجے میں پریشانی کا عنصر زیادہ ہوگیا تھا اور لہجے میں بھی بے بسی بھی تھی۔

''کچھ نہیں طٰہٰ۔'' مینا کو مزید رونا آیا تھا۔

''مینا'' طٰہٰ نے مینا کو اپنے ساتھ لگایا تھا۔ ''کچھ بتاؤ بھی نہیں۔'' مینا طٰہٰ کے سینے کے ساتھ لگی چند لمحے روتی رہی تھی۔

طٰہٰ اس کا سر تھپکتا رہا، پھر وہ اسے بیڈ پر لے آیا تھا اور اسے بیڈ پر بٹھایا تھا۔ مینا کو روتے دیکھ کر طٰہٰ بہت بے چین ہوگیا تھا۔ شادی کے بعد طٰہٰ نے مینا کو پہلی بار روتے دیکھا تھا۔ مینا کو بیڈ پر بٹھا کر طٰہٰ نے لائٹس آن کی تھیں اور خود مینا کے پیروں میں بیٹھ گیا تھا۔ گھٹنوں کے بل......

''ہاں مینا۔ اب بتاؤ۔ کیا ہوا اتنی رات کو۔'' طٰہٰ نے پوچھا تھا۔ ایک تفکر کی لکیر اس کے ماتھے پر نمایاں تھی۔

مینا خاموش رہی...... کیا بتائے؟؟ اگر بتائے تو کس طرح بتائے......؟

''بتاؤ نا......'' طٰہٰ کے لہجے میں کیا کچھ نہیں تھا، لیکن مینا طٰہٰ کو ایک ٹک دیکھے گئی۔ اپنی طلب پر اسے بڑی شرمندگی ہو رہی تھی...... چند لمحے مزید خاموشی میں گزر گئے۔

طٰہٰ انتظار ہی کرتا رہا کہ مینا کچھ بولے، لیکن جب کافی دیر گزرنے کے بعد بھی مینا نہ بولی تو طٰہٰ نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

''مینا...... کچھ خیال کرو میرا...... میری پریشانی میں اضافہ ہوتا جارہا ہے...... پلیز مجھے بتاؤ کیا ہوا ہے۔''

طٰہٰ کے ہاتھ کا لمس مینا محسوس کر رہی تھی...... اپنائیت تھی اس لمس میں۔ احساسات، جذبات تھے اس لمس میں۔ مینا خود بھی بتانا چاہتی تھی لیکن مسئلہ یہ تھا کہ کیا بتائے اور کس طرح بتائے؟

''آج نہیں۔ پھر بھی۔''

''آج کیوں نہیں...... ہوا کیا ہے، کچھ تو بتاؤ؟''

''پلیز طٰہٰ میں آپ کو بتاؤں گی، لیکن آج نہیں پلیز اصرار مت کریں مجھے انکار کرتے بُرا لگتا ہے۔'' طٰہٰ نے شکوہ بھری نگاہوں سے مینا کو دیکھا تھا۔

''لیکن مینا اور اب میں اگر نہ سو پاؤں تو'' طٰہٰ نے کہا تھا۔ مینا نے طٰہٰ کو دیکھا تھا۔ طٰہٰ صحیح کہہ رہا تھا۔ مینا کو روتے دیکھنے کے بعد اب شاید اس کے لیے سونا مشکل تھا۔

''وہ اصل میں۔ آسٹریا میں ماریہ کا ایکسیڈنٹ ہوگیا ہے تو اس کی آنٹی کا فون آیا تھا، تو اس لیے۔'' مینا نے کہا تھا۔

''تو تم اس لیے رو رہی تھیں۔'' طٰہٰ کو یقین نہیں آرہا تھا۔ یہ ایسی بات تو نہ تھی جس پر آج نہیں پھر بھی کہا جاتا ہے۔

''ہاں۔ وہ اس کی آنٹی کا ابھی فون آیا تھا تو اس لیے۔'' مینا نے جھوٹ بولا تھا۔

''تو انہوں نے ماریہ کے گھر کیوں نہیں کیا...... تمہیں کیوں فون کیا۔''

''وہ...... وہ اصل میں...... ماریہ کے گھر میں فون آف مل رہا تھا تو انہوں نے مجھے فون کرکے کہا کہ ماریہ کے گھر بتادوں۔'' ایک جھوٹ چھپانے کے لئے اسے اور جھوٹ بولنا پڑا تھا۔

''اس وقت......!''

''آسٹریا میں اس وقت صبح ہے۔'' مینا نے مزید جھوٹ بولا تھا۔ اسے پتا نہیں تھا کہ اس وقت آسٹریا میں کون سا پہر ہوتا ہے اور نہ طٰہٰ کو پاکستان اور آسٹریا کے وقت کے فرق کا پتا تھا۔

''تم صحیح کہہ رہی ہونا۔'' طٰہٰ اپنی بے یقینی کو یقین میں بدلنے سے قاصر تھا۔

''ہاں......!'' مینا نے مزید جھوٹ بولا تھا۔ مینا کو شرمندگی ہو رہی تھی۔ اس نے پہلی بار طٰہٰ سے جھوٹ بولا تھا...... اپنی طلب کو چھپانے کے لیے۔ شہرت کی طلب کو چھپانے کے لیے۔

اس کے بعد طٰہٰ نے ماریہ کے ایکسیڈنٹ کی نوعیت اور تفصیل پوچھی تھی اور مینا نے بھی تفصیل گھڑ کر سنادی تھی۔ یقین نہ آنے کے باوجود طٰہٰ نے مینا کو نہ جھٹلایا۔

آدھے گھنٹے بعد طٰہٰ اور مینا سوئے ہوئے تھے۔ کمرے کی لائٹ بند تھی۔

طٰہٰ نے مینا کو بازوؤں میں لیا ہوا تھا...... لیکن دونوں کو رات بھر نیند نہ آئی تھی۔

......☆☆☆......

مینا نے قینچی چپل پہنی ہوئی تھی، انگوٹھے والی، وہ قینچی چپلوں کو زیادہ آرام دہ تصور کرتی تھی۔ لینن کا سوٹ اس نے زیب تن کیا ہوا تھا۔ سر دوپٹے سے ڈھکا ہوا تھا۔ وہ یہاں اکیلی آئی تھی، آشور کشہ پر......

گھر بہت بڑا تھا۔ دروازے پر چوکیدار بھی کھڑا تھا، گھر کا گیٹ جنگلے والا تھا۔ کالے رنگ کا بہت بڑا گیٹ...... مینا نے پرس میں سے پرچی نکال کر ہاؤس نمبر چیک کیا۔ وہ مطلوبہ گھر کے گیٹ کے سامنے کھڑی تھی۔ ویسے اسے اس گھر کے سامنے کھڑے ہوکر حیرت ہو رہی تھی، گریجویشن کے زمانے میں اس کی ایک دوست تھی عبیرہ...... وہ ایک دو بار اس کے گھر گئی تھی۔ مینا کو جہاں تک یاد پڑتا تھا، عبیرہ کا گھر یہی تھا

جس کے سامنے وہ کھڑی تھی۔
یہاں وہ اپنے حقیقی والد سے ملنے آئی تھی...... ایوب لغاری سے...... گھر میں داخل ہونے کے بعد ایک باوردی ملازم نے نینا سے اس کے آنے کا مقصد پوچھا۔ نینا نے بتا دیا کہ وہ ایوب لغاری سے ملنے آئی ہے، پھر ملازم نے اس کا تعارف پوچھا تھا اور نینا نے صرف اپنا نام بتایا تھا، پھر ملازم نے اسے ڈرائنگ روم میں لا کر بٹھا دیا تھا۔

پانچ منٹ تک کوئی نہ آیا۔ ان پانچ منٹوں میں نینا نے ڈرائنگ روم کا جائزہ لیا تھا...... ہر طرف امارت تھی۔ بیش قیمت فرنیچر، بیش قیمت ڈیکوریشن پیسز، دبیز قالین۔ نینا خود ایسے گھر سے آئی تھی جس میں فی الحال کوئی ڈرائنگ روم نہیں تھا۔ اس کے دیواروں کے کمرے کو بوقتِ ضرورت ڈرائنگ روم کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا۔ لیکن نینا نے ان سے مرعوب نہ ہوئی تھی۔ امارت سے مرعوب ہونا اس کا خاصہ نہیں تھا۔ وہ اپنی چادر میں پاؤں پسار کر خوش رہنے والی تھی۔ چھٹے منٹ میں ایوب لغاری ڈرائنگ روم میں داخل ہوئے تھے...... بیش قیمت چھڑی کے سہارے چلتے ہوئے...... نینا کھڑی ہو گئی تھی، ان کے احترام میں......

ایوب لغاری کے چہرے سے خوشی پھوٹ رہی تھی۔ وہ مسکرا رہے تھے۔

''میری بیٹی آئی ہے، مجھ سے ملنے، مجھے یقین نہیں آ رہا......''

ایوب لغاری نینا کے سامنے والے صوفے پر بیٹھ گئے۔ انہوں نے نینا کے سر پر ہاتھ بھی پھیرا تھا۔

''کیسی ہو؟''

''عاشر کیسا ہے؟''

''گھر میں سب خیریت ہے؟''

''یہاں آنے میں کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی؟''

''میں جب تمہارے گھر سے آیا تھا۔ تو ایک موہوم سی امید تھی دل میں کہ شاید تم ملنا چاہو۔ اسی لیے عاشر کو اپنا پتا ایک کاغذ پر لکھ کر دے دیا تھا۔'' ایوب لغاری پوچھتے رہے اور نینا جواب دیتی رہی۔

ایوب لغاری بہت خوش تھے۔

''آپ کیسے ہیں؟...... ابو۔'' 'ابو' کہنے میں نینا نے توقف کیا تھا۔

''الحمدللہ'' ایوب لغاری کو نینا کا 'ابو' کہنا اچھا لگا تھا، بلکہ بہت اچھا۔ نینا کے ذہن میں ایوب لغاری کا جو تصور تھا...... دونوں ملاقاتوں میں وہ اس سے مختلف تھے۔

اس کے بعد خاموشی کا ایک وقفہ آ گیا تھا...... انہیں سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ کیا گفتگو کریں۔

''مجھے معاف کرنا۔ میں کئی سال تم سے غافل رہا۔''

نینا نے ایوب لغاری کے تاثرات دیکھنا چاہے تھے، لیکن انہوں نے سر جھکایا ہوا تھا۔ اس لیے اسے اندازہ نہ ہو سکا۔ ویسے نینا کو ان کا یوں سر جھکا کر بیٹھنا اچھا نہیں لگ رہا تھا، اس کے علاوہ اسے اپنے والد کے منہ سے معافی کے الفاظ بھی اچھے نہیں لگے تھے۔ باوجود اس کے کہ اس کے دل میں شکوہ تھا کہ ایوب لغاری نے آخر کیوں اس سے رابطہ نہیں کیا۔ جوانی میں انہیں نینا کی یاد کیوں نہیں آئی۔

''نہیں ابو...... کچھ نہیں جو ہوا سو ہو گیا۔'' نینا نے یہ الفاظ نیم رضامندی سے کہے تھے۔

ویسے وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ نینا کے دل میں موجود کدورت ختم ہو سکتی تھی۔ اگر اسے اپنے والد سے ویسے محبت محسوس ہونے لگتی، جیسی وہ سیف کے لیے رکھتی تھی۔

''بس اب تم سے بھی رابطہ ہو گیا۔ اب مجھے زندگی سے اور کچھ نہیں چاہیے۔'' ایوب لغاری نے بڑے اطمینان سے کہا تھا۔

چند لمحوں بعد ایک ادھیڑ عمر خاتون اور ایک اٹھارہ انیس سال کی لڑکی کمرے میں داخل ہوئی تھیں۔

"یہ میری بیٹی ہے، نینا۔" ایوب لغاری نے تعارف کرایا تھا۔

"نینا یہ تمہاری مدر ہیں اور یہ تمہاری سسٹر ہے۔" ایوب لغاری نے آنے والوں کا تعارف کروایا تھا۔

ادھیڑ عمر خاتون نے نینا کے سر پر ہاتھ پھیرا تھا۔ نینا کو وہ بہت اچھی لگی تھیں۔

رومیصہ نے اس کے ساتھ ہاتھ ملایا تھا اور اپنا نام بتایا تھا۔ وہ کافی پُرجوش لگ رہی تھی، نینا کے بارے میں جاننے کے لیے۔

"نینا اس کے علاوہ تمہارا ایک بھائی بھی ہے، انس۔ وہ کیڈٹ کالج میں پڑھ رہا ہے۔ اس کے علاوہ تمہارے چچا، چچی اور ان کی فیملی بھی یہیں رہتی ہے۔" ایوب لغاری نے بتایا تھا۔

"مہمانوں کی طرح کیوں بیٹھی ہو۔ تمہارا اپنا گھر ہے بیٹا۔" تھوڑی دیر بعد ایوب لغاری نے کہا تھا۔

"رومیصہ ہنس مکھ لڑکی تھی۔ نینا کو چند لمحوں میں اس کا اندازہ ہو گیا تھا۔

"ہائے اللہ! آپی مجھے تو آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی ہے۔" یہ فقرہ رومیصہ نے کئی بار دہرایا تھا۔ وہ آدھا گھنٹہ مزید بیٹھی تھی اور جانے کے لیے اجازت لے رہی تھی کہ عبیرہ کمرے میں داخل ہوئی تھی۔

"تم نینا ہی ہونا۔" عبیرہ نے چیختے ہوئے کہا تھا اور اگلے ہی لمحے وہ بڑے پُرجوش انداز میں نینا سے گلے مل رہی تھی۔

"اتنے سال رابطہ کیوں نہیں کیا؟" اور اس جیسے کئی اور شکوے دونوں نے ایک دوسرے سے کیے۔ نینا دس منٹ مزید بیٹھی۔ دیر ہو رہی تھی، اس لیے ورنہ وہ شاید مزید بیٹھتی۔

چند سال پہلے وہ یہاں ایک دو بار آئی تھی عبیرہ کے ساتھ۔ پھر گریجویشن کے بعد دونوں کی فیلڈز علیحدہ ہو جانے کی بنا پر رابطہ نہیں ہو سکا تھا۔

"میں خود تمہیں چھوڑ آتا ہوں۔" نینا نے جب دوسری بار جانے کے لیے اصرار کیا تھا تو ایوب لغاری نے کہا تھا۔

"ابو اس لیے مجھ سے ملنے نہیں آئے تھے کہ اب بڑھاپے میں انہیں میری ضرورت ہے۔ فیملی تو ان کی مکمل ہے، خیال رکھنے والی۔ مجھ سے ملنے وہ اس لیے آئے ہیں، کیوں کہ میں ان کی بیٹی ہوں، ان کا اپنا خون......" رخصت ہوتے ہوئے سب سے ملتے ہوئے نینا نے یہی سوچا تھا۔

باوردی ڈرائیور گاڑی ڈرائیو کر رہا تھا۔ نینا اور ایوب لغاری پیچھے بیٹھے ہوئے تھے۔

"میں نے تمہاری ماں کے ساتھ بہت ظلم کیا تھا۔ اسے کہنا کہ مجھے معاف کر دے۔" ایوب لغاری کو یہ فقرہ کہنے میں بہت دیر سوچنا پڑا تھا۔

"انسان تبدیل ہو سکتا ہے۔" نینا نے ایوب لغاری کو نظر بھر دیکھا تھا اور طویل سانس خارج کرتے ہوئے سوچا تھا۔

......☆☆☆......

کتنے دن ایسے ہی چپ چاپ گزر گئے۔ سب ایک جیسے دن۔ مینا وہی گم صم رہتی، البتہ اب طٰہٰ بھی اس کے ساتھ آدھی آدھی رات تک جاگتا رہتا تھا اور صبح فیکٹری بھی لیٹ جاتا تھا۔ مرجھائی ہوئی مینا کو طٰہٰ دیکھتا تو اس کے دل کو جیسے کچھ ہونے لگتا تھا۔ لیکن اس نے مینا سے بالکل کچھ نہیں پوچھا تھا۔ بلاشبہ اس کی پریشانی میں روز بروز اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ اسے اندازہ تھا کہ وہ جتنا مینا سے اس بارے میں پوچھے گا اتنا مینا کو بتانے میں دقت ہوگی۔ اس لیے وہ انتظار کر رہا تھا کہ مینا خود بتائے کہ مسئلہ کیا ہے؟ البتہ خود اس کے ذہن پر دباؤ بڑھتا جا رہا تھا۔ فیکٹری کا کام بھی صحیح طرح نہیں دے سکتا تھا۔ بے خوابی بھی اس کی صحت برباد کر رہی تھی۔

مینا بھی اسے بتانا چاہتی تھی۔ لیکن مسئلہ یہی تھا کہ

کیا بتائے آخر......

یہ کہہ دے ”مجھے Fame چاہیے اس لیے میں فلموں میں کام کرنا چاہتی ہوں......“ اتنی ہمت نہیں ہوتی تھی مینا میں۔

فرزانہ آپا آئی ہوئی تھیں اور انہوں نے اسے سمجھایا تھا کہ اب وہ گھر سے کافی غافل ہو رہی ہے۔ اسے گھر میں دلچسپی لینی چاہیے۔ تفریحات کو ایک حد تک رکھنا چاہیے۔ انہوں نے مینا کو کہا تھا کہ وہ مینا کو اپنی بیٹی مانتی ہے اس لیے اسے سمجھا رہی ہیں۔ آخر میں اس سے وعدہ بھی لیا تھا کہ وہ اب طٰہ سے بھی بے گانہ نہیں ہوگی۔ اس نے وعدہ بھی کر لیا تھا...... لیکن مسئلہ اسے نبھانے کا تھا۔

......☆☆☆......

نینا آج بہت خوش تھی۔ اس کے سارے رشتے اس کے پاس تھے...... آج اس کی گود بھرائی کی رسم تھی۔ عاشر کوئی خاص راضی نہیں تھا اس رسم کے منعقد کرنے پر، لیکن جب زاہدہ نے خوب اصرار کیا تو بھلا ماں کو کس طرح ٹالتا۔

نینا تو محفل کی جان تھی۔ سج کر چلتی نینا کتنی اچھی لگ رہی تھی۔ ویسے اب اسے دیکھ کر بھی احساس ہوتا تھا کہ وہ پریگنینٹ ہے۔ عاشر چچا کی سائیڈ میں مردوں کے ساتھ بیٹھا تھا، ہنستا ہوا عاشر۔ انہی مردوں میں طٰہ بھی بیٹھا تھا۔ گم صم۔ کچھ پریشان سا محسوس ہو رہا تھا۔

سیف اور عاشر دونوں نے پوچھا تھا کہ کیا کوئی پریشانی ہے، لیکن اس نے ہنس کر ٹال دیا تھا۔ غالب بھی آیا ہوا تھا۔ وہ کچھ کنفیوز تھا۔ ایک بازو سے محروم ہونے کے بعد پہلی بار وہ کسی گیدرنگ میں شریک ہوا تھا، سو تھوڑا بہت کنفیوز ہونا تو نیچرل تھا۔ ایوب لغاری بھی آئے ہوئے تھے۔

عورتوں کی سائیڈ پر نینا نے مینا سے پوچھا تھا کہ وہ کیوں اتنی پریشان ہے۔ کافی کمزور بھی ہوگئی ہے۔

مینا نے بس ایک پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا تھا ”کچھ نہیں“ نینا نے اسے چھیڑا بھی تھا کہ کب وہ اس دور سے گزرے گی۔ جواب میں مینا نے دوبارہ بس ایک پھیکی سی مسکراہٹ ہونٹوں پر سجائی تھی۔

نینا نے ارادہ بنالیا تھا کہ وہ جلد ہی میکے میں مینا کو بلا کر ساری تفصیل جانے گی کہ آخر کیا مسئلہ ہے، جو وہ ہر وقت اداس رہتی ہے۔

”اور یہ تم ہر وقت اسکارف میں ہی کیوں لپٹی رہتی ہو، خالی دوپٹے سے تمہارا گزارا نہیں ہوتا تھا“ نینا نے رطابہ سے کہا تھا۔

”نہیں۔ بس اسکارف پہننا مجھے اچھا لگتا ہے۔ ویسے تمہارے سسرالی میل کزنز بھی تو آجا رہے ہیں۔ دوپٹا تو ڈھلک بھی جاتا ہے۔“ رطابہ نے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔

خدیجہ پھوپو بھی اپنی بیٹیوں ریحانہ اور نیلوفر کے ساتھ آئی ہوئی تھیں۔ آج کل وہ کینیڈا میں ریحانہ اور نیلوفر کا اپنی جیٹھ کی فیملی کے ساتھ رشتہ ہونے پر بہت خوش تھیں...... سو وہ تمام وقت اسی موضوع پر شو مارتی رہتی تھیں۔

گود بھرائی کی رسم خیریت سے انجام پائی تھی۔ رات کو جب عاشر اور نینا ساتھ ساتھ ایک ہی تکیے پر سوئے وہئے تھے تب عاشر نے نینا سے پوچھا تھا۔

”بہت خوش لگ رہی ہو۔“

”وہ تو میں ہوں۔“ نینا نے کھلکھلا کر کہا تھا۔

......☆☆☆......

”میں نے تم سے ایک بات کرنی ہے مینا!!“ دائیں طرف موڑ کاٹنے کے بعد طٰہ نے کہا تھا۔ وہ اس وقت کار ڈرائیو کر رہا تھا۔ مینا اس کے ساتھ ہی بیٹھی تھی۔ فرنٹ سیٹ پر۔ نینا اور عاشر کی گود بھرائی کی رسم میں شریک ہونے کے بعد اس کا بھی دل چاہا تھا کہ اب انہیں بھی ایسی کوئی خوشی نصیب ہونی چاہیے، جوان کی

زندگی کو ایک نیا موڑ دے۔ وہ چاہتا تھا کہ اب ان کے ہاں بھی بچہ ہونا چاہیے۔ اس وقت وہ یہی بات مینا سے کہنا چاہتا تھا۔ کافی دنوں بعد اس کا موڈ خوشگوار ہوا تھا، بچے کے بارے میں سوچ کر۔

"میں بھی آپ سے ایک بات کرنا چاہتی ہوں۔" مینا نے سنجیدہ لہجے میں کہا تھا۔ "بہت اہم" مینا نے ہونٹ کاٹتے ہوئے کہا تھا۔ وہ بالآخر نتیجے پر پہنچ گئی تھی اور اس نے فیصلہ کرلیا تھا کہ آج اس نے طٰہ کو سب کچھ بتا دینا ہے۔

مینا کی سنجیدگی سے طٰہ کو کچھ خوف آیا تھا۔

"کہو پھر کیا کہنا ہے تم نے؟" طٰہ نے مینا سے کہا تھا۔ دل میں خواہش ہوئی تھی کہ مینا کہے آپ بھی کچھ کہنا چاہتے تھے پہلے آپ کہیں، پھر میں کہوں گی۔ لیکن ایسا نہیں ہوا تھا۔

"یہاں نہیں۔ گھر جاکر بات کریں گے۔" مینا نے ونڈ اسکرین سے باہر دیکھتے ہوئے کہا تھا۔

"چلو ٹھیک ہے۔" طٰہ نے کہا تھا۔

گھر پہنچے، پورچ میں گاڑی پارک کرنے اور پھر بیڈ روم تک پہنچنے میں انہیں آدھا گھنٹہ لگ گیا تھا۔

مینا بیڈ روم میں بے خیالی کے ساتھ داخل ہوئی تھی اور کمرے کے بیچ میں جاکر وہ رک گئی تھی...... ذہن ایسا الجھا ہوا تھا کہ بیٹھی بھی نہیں۔ بس کھڑی رہی۔

جب چند لمحے ایسے ہی گزر گئے تو طٰہ نے اس کے کندھوں پر اپنے ہاتھ جمائے تھے اور اسے بیڈ پر بٹھایا تھا اور خود ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے پڑی ٹیبل پر بیٹھ گیا۔

وہ اب آمنے سامنے بیٹھے تھے۔

"ہاں کہو۔ تم کچھ کہنا چاہتی تھی......" طٰہ نے دھڑکتے دل کے ساتھ پوچھا تھا۔ اس کے دل کی دھڑکن کافی تیز ہو چکی تھی۔ اسے لگا تھا کہ مینا کچھ غیر معمولی بات ہی کرے گی۔

مینا نے ایک نظر طٰہ کو دیکھا تھا...... طٰہ مکمل طور پر اس کی طرف متوجہ تھا۔ مینا نے ایک طویل سانس خارج کی تھی اور سر جھکا لیا تھا۔ وہ بات کرنے کے لیے مناسب الفاظ ڈھونڈ رہی تھی۔ ساتھ ساتھ اپنا حوصلہ بھی مجتمع کر رہی تھی۔

مینا دو منٹ یوں ہی سر جھکائے بیٹھی رہی۔ اور طٰہ مسلسل اسے دیکھتا رہا...... آخر مینا نے سر اٹھا کر طٰہ کو دیکھا تھا۔ طٰہ ہنوز مینا کو دیکھ رہا تھا۔

مینا نے نچلا ہونٹ دانتوں تلے دبایا تھا اور کہنا شروع کیا تھا۔

"طٰہ وہ، وہ...... آپ کے پاس اتنا سرمایہ ہے نا...... تو آپ ایک فلم کیوں نہیں بناتے...... صاف ستھری پی ٹی وی کے ڈراموں جیسی...... وہ اصل میں...... بات یہ ہے کہ میں فلموں میں کام کرنا چاہتی ہوں...... دیکھیں نا کتنا نام ہوتا ہے اداکاروں اور اداکاراؤں کا...... ساری دنیا انہیں چاہتی ہے...... میں ویسے اپنے آپ کو ڈھانپ کر کام کروں گی...... دوپٹا بھی پھیلا کرلیا کروں گی......" اتنا کہہ کر مینا نے آنکھیں بند کرلی تھیں...... جیسے کسی چیز سے چھپ رہی ہو۔

جیسے جیسے مینا بولتی گئی، طٰہ کی آنکھیں پھیلتی گئیں۔ طٰہ کو ایسے لگا جیسے دنیا کی ہر چیز ساکن ہوگئی ہو۔ طٰہ نے مینا کے تاثرات دیکھے تھے۔ مینا نے آنکھیں بند کی ہوئی تھیں۔ ماتھے پر ایک بل آیا ہوا تھا اور ہونٹ لرز رہے تھے۔

"کتنا نام ہوتا ہے اداکاروں اور اداکاراؤں کا۔" طٰہ کے کانوں میں یہ فقرہ ایک بار پھر گونجا تھا۔

مینا طٰہ کے بولنے کا انتظار کرتی رہی، جب کافی دیر خاموشی چھائی رہی تو وہ دوبارہ بولی۔

"آپ بھی فلم میں کام کیجیے گا نا...... As a Hero...... کتنے خوبصورت تو آپ ہیں۔" طٰہ کو ایسے لگا جیسے مینا نے اسے گالی دی ہو...... وہ چپ چاپ مینا کو دیکھتا رہا۔ اس قدر برا وقت بھی آنا تھا...... طٰہ نے

سوچا بھی نہ تھا۔
"تم فلموں میں کیوں کام کرنا چاہتی ہو؟" طٰہٰ نے مینا کو دیکھتے ہوئے کہا تھا۔ اسے بڑی تکلیف ہو رہی تھی مینا کے خیالات سن کر۔
مینا کو کہنے میں جھجک ہو رہی تھی، لیکن اس نے پھر بھی کچھ توقف کے بعد کہہ دیا۔
"شہرت کے لیے۔"
طٰہٰ کو مینا کے جواب دینے سے پہلے ہی اندازہ ہو رہا تھا کہ مینا کیا جواب دے گی، لیکن اس کا جواب سن کر طٰہٰ کو پھر بھی بڑی تکلیف ہوئی تھی۔ طٰہٰ کو ایسے لگا تھا جیسے کسی نے اسے اندر سے کاٹنا شروع کر دیا ہو۔
کتنے ہی لمحے خاموشی میں گزر گئے۔ مینا نظریں جھکائے ہونٹ کاٹتی رہی اور طٰہٰ مینا کو دیکھتا رہا۔ سپاٹ تاثرات لیے۔
"شہرت اور محبت، کیا چیز پسند کرو گی تم مینا۔" طٰہٰ کو الفاظ ترتیب دینے میں کافی دقت ہوئی تھی۔ اس ایک سوال کے ساتھ اس نے اپنا سب کچھ لگا یا تھا، جیسے کوئی شرط میں اپنا سب کچھ لگاتا ہے۔ اس سوال کے جواب نے یا تو طٰہٰ کا مان بڑھانا تھا۔ یا پھر طٰہٰ نے اس ایک جواب کے ساتھ اپنا مان گنوانا تھا۔
مینا نے سر اٹھا کر طٰہٰ کو دیکھا تھا۔ اسے تھوڑی سی شرمندگی ہوئی تھی، لیکن اس نے اس شرمندگی پر قابو پایا تھا۔ شرمندگی پر قابو پانا اس کے لیے ضروری تھا۔
"مینا۔ سچ بتانا بالکل سچ۔ تمہیں کیا چیز چاہیے؟ شہرت یا محبت......؟" طٰہٰ کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ چہرہ بھی تناؤ کا شکار ہو رہا تھا۔
مینا کو سوچنے کی ضرورت نہیں تھی۔ اسے پتا تھا کہ اسے کیا چاہیے، لیکن اعتراف کرنا اس کے لیے بہت مشکل تھا۔
"مینا بتاؤ بھی سہی۔" طٰہٰ سے خاموشی برداشت نہیں ہو رہی تھی۔ طٰہٰ کو ایسے لگ رہا تھا جیسے اندر سے کاٹنے کا عمل تیز ہو گیا ہے۔
مینا کو جواب دینا مشکل لگ رہا تھا۔ اس نے پھر سے سر جھکا لیا۔ زندگی میں اسے کبھی کچھ کہنے میں اتنی دقت نہیں ہوئی تھی، لیکن یہ بھی سچ تھا کہ اسے کبھی ایسی خواہش بھی نہیں ہوئی تھی۔
"مینا۔ بولو نا......" طٰہٰ اس چھوٹی میز سے اٹھ کر مینا کے سامنے آ کھڑا ہوا تھا۔ اس نے جھک کر مینا کے کندھوں پر اپنے ہاتھوں سے دباؤ ڈالا تھا۔
"بولو مینا۔"
مینا نے بے اختیار سر اٹھا کر طٰہٰ کو دیکھا تھا۔
طٰہٰ نے چہرے پر ایک سپاٹ مسکراہٹ لا کر سر ہلایا تھا۔ جیسے کہہ رہا ہو، ڈرتی کیوں ہو، جو دل میں ہے کہہ دو۔
"میں" مینا نے 'میں' کو لمبا کھینچا تھا۔ اس کے بعد کچھ توقف کے بعد کہا تھا۔
"میں شہرت کو ترجیح دوں گی!"
"مینا کے کندھوں سے طٰہٰ کے ہاتھ خود بخود ڈھلک گئے تھے......اس نے اپنا مان گنوا دیا تھا۔
وہ بے یقینی سے مینا کو دیکھے گیا...... مینا بھی کبھی اسے اتنی اذیت دے گی...... اس نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔
"وہ اصل میں دیکھیں نا۔ ویسے شہرت اور محبت کا کوئی مقابلہ نہیں۔ دونوں مختلف چیزیں ہیں۔ میں آپ سے محبت کرتی ہوں، لیکن بات اصل میں یہ ہے کہ شہرت بھی اچھی چیز ہے اور مجھے شہرت......"
"مینا چپ کرو......" طٰہٰ نے مینا کی بات درمیان میں کاٹی تھی۔ اس کا لہجہ شکست بھرا تھا۔
چند لمحے وہ چپ چاپ مینا کے سامنے کھڑا رہا۔ آنسو اس کے گلے میں اٹک رہے تھے، لیکن وہ مینا کے سامنے رونا نہیں چاہتا تھا، کیوں کہ مینا کے سامنے رونا اسے اپنی ہتک محسوس ہو رہی تھی۔

وہ مینا سے کہنا چاہتا تھا کہ اب اسے بیٹا چاہیے، لیکن مینا نے پہلے کہہ دیا کہ اسے اب شہرت چاہیے۔

طٰہٰ اپنی جگہ سے ہلا تھا اور اس نے الماری کی طرف قدم بڑھائے تھے۔ طٰہٰ نے الماری کا وہ خانہ کھولا تھا جسے طٰہٰ نے اپنی شادی شدہ زندگی میں دوبارہ کھولا تھا۔ مینا سے چھپ کر۔ ایک بار کاغذات اٹھانے کے لیے اور ایک بار کاغذات رکھنے کے لیے، وہ کاغذات فیکٹری اور گھر کے تھے جو اس نے مینا کے نام کر دیے تھے۔

آج بھی اس نے کاغذات اٹھانے کے لیے وہ خانہ کھولا تھا۔ وہ تمام کاغذات اٹھا کر طٰہٰ نے مینا کے سامنے رکھ دیے۔ ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے پڑی چھوٹی میز پر۔ جہاں وہ کچھ دیر پہلے بیٹھا تھا۔ دوسری دراز سے طٰہٰ نے چیک بکس بھی اٹھائے تھے۔ دو مختلف بینکوں کی چیک بکس بھی اس نے چھوٹی میز پر رکھی تھیں۔ مینا حیرانگی سے طٰہٰ کی کارروائی دیکھ رہی تھی۔

''یہ کیا کر رہے ہیں آپ؟'' مینا کو وحشت ہوئی تھی۔ طٰہٰ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ جیسے سنا ہی نہ ہو۔

''یہ کاغذات اس گھر اور فیکٹری کے ہیں جو میں نے کچھ عرصہ پہلے تمہارے نام کر دیے تھے اور یہ بینکوں کے چیک ہیں...... وہ ساری رقم نکلوا لینا جب ضرورت پڑے۔''

یہ کہہ کر طٰہٰ ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ ڈریسنگ ٹیبل کے آئینے میں مینا نظر آرہی تھی۔ طٰہٰ مینا کو آئینے میں دیکھے گیا۔ مینا کی آنکھوں میں حیرانگی تھی، وحشت تھی......

طٰہٰ کی آنکھوں میں بے اختیار آنسو آگئے۔ ویسے اس نے کوشش کی تھی کہ ان آنسوؤں کو روک لے مگر ناکام رہا تھا۔

طٰہٰ نے گرے ٹو پیس پہنا ہوا تھا۔ شادی کے بعد جب وہ پہلی بار شاپنگ کرنے گئے تھے، تب اس نے یہ ٹو پیس لیا تھا۔ یہ ٹو پیس مینا نے پسند کیا تھا۔ طٰہٰ نے ٹو پیس کا کوٹ اتارا تھا۔ اسے ڈریسنگ ٹیبل پر رکھ دیا تھا۔ جہاں کاسمیٹکس کا مختلف سامان پڑا تھا۔ ٹائی کو اتارا تھا۔ بلیک کلر کی ٹائی بھی اس نے کوٹ کے اوپر رکھی تھی، لیکن وہ پھسل کر نیچے جا گری تھی۔ اس کی آنکھوں میں ایک بار پھر آنسو آگئے تھے۔ اس بار اس نے آنسو جلدی سے صاف کر لیے تھے۔

''یہ۔ یہ کیا کر رہے ہیں آپ؟'' مینا اٹھ کر طٰہٰ کے پاس آکھڑی ہوئی۔ اس کی وحشت بڑھتی جا رہی تھی۔ مینا نے طٰہٰ کا ہاتھ پکڑا تھا۔ اس کا مضبوط ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں لیا تھا۔

''طٰہٰ! سوری۔ مجھے اندازہ تھا کہ آپ کو اچھا نہیں لگے گا لیکن......'' مینا نے فقرہ ادھورا چھوڑا تھا اس نے، لیکن سے آگے کچھ کہنے سے پہلے اسے سوچنا تھا، سوچے بغیر وہ آگے کچھ نہیں کہہ سکتی تھی۔

طٰہٰ نے سپاٹ تاثرات سے مینا کو دیکھا تھا اور اپنا ہاتھ مینا کی گرفت سے چھڑوایا تھا۔

ہاتھ چھڑانے کے بعد طٰہٰ نے اپنی کلائی میں موجود بیش قیمت گھڑی اتاری تھی۔ گھڑی کو بھی اس نے ڈریسنگ ٹیبل پر رکھ دیا تھا۔

گھڑی رکھنے کے بعد اس نے پینٹ کی جیب سے موبائل نکالا تھا اور پھر والٹ بھی۔ انہیں بھی اس نے ڈریسنگ ٹیبل پر رکھ دیا تھا۔

''میں جا رہا ہوں مینا، تمہیں میری ضرورت نہیں ہے، ان چیزوں سے شاید تمہیں شہرت مل جائے۔''

''کک...... کک...... کہاں جا رہے ہیں آپ؟'' مینا کی آواز لڑکھڑائی تھی۔

''میرے پیچھے مت آنا مینا۔ اللہ تمہیں خوش رکھے۔'' طٰہٰ، جو چند قدم بڑھا کر آگے چلا گیا تھا، نے مڑ کر کہا تھا۔ آنکھوں میں پھر آنسو آگئے تھے۔

مینا کو ایسے لگا جیسے کسی نے اس پر برف ڈال کر

اسے برف کا کردیا ہے۔ طہٰ اسے چھوڑ کر جا رہا تھا۔ یہ بات تو وہ خواب میں بھی نہیں سوچ سکتی تھی، لیکن اب طہٰ واقعی اسے چھوڑ کر جا رہا تھا۔ مینا بھاگ کر طہٰ کے پاس گئی، طہٰ کا ہاتھ تھام کر وہ اس کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔ طہٰ کا بڑھتا ہوا قدم رک گیا۔

''آپ اس طرح کہاں جا رہے ہیں؟ آپ مجھے چھوڑ کر نہیں جا سکتے۔'' مینا کا لہجہ استحقاق بھرا تھا۔

''جب تمہیں میری ضرورت نہیں۔ تب میں تمہارے ساتھ رہ کر کیا کروں۔

مینا۔ مجھے جانا ہے......'' یہ کہہ کر طہٰ نے اپنا ہاتھ مینا کے ہاتھوں سے چھڑوانے کی کوشش کی تھی...... لیکن مینا نے طہٰ کے ہاتھ پر اپنے دونوں ہاتھوں کی گرفت اور بھی مضبوط کر لی۔

''نہیں۔ آپ مجھے چھوڑ کر نہیں جا رہے۔'' مینا نے سر کو نفی میں ہلاتے ہوئے کہا تھا۔

طہٰ کے چہرے پر ایک مسکراہٹ نمودار ہوئی تھی۔ ایک زہر خند مسکراہٹ۔

''تم نے مجھ پر شہرت کو فوقیت دے دی...... مینا...... میں تو تمہارے لیے محبت کے سوا کچھ بھی نہیں...... اور تمہیں محبت سے زیادہ شہرت کی ضرورت ہے۔'' یہ کہہ کر طہٰ نے مینا کی گرفت سے اپنا ہاتھ ایک جھٹکے س چھڑوایا تھا۔ مینا لڑکھڑا گئی تھی اور مینا کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے......

طہٰ نے چند قدم مزید بڑھائے تھے۔ دروازے پر پہنچ کر اس نے مڑ کر کہا تھا۔

''اپنا خیال رکھنا'' اور آنکھوں میں ایک بار پھر آنسو آ گئے تھے۔

یہ تو مینا نے نہیں چاہا تھا کہ شہرت کے بدلے اسے طہٰ کو کھونا پڑے۔

''طہٰ۔ رک جایئے'' مینا نے آواز دی تھی، لیکن طہٰ دروازہ پار کر گیا تھا، مینا کی آواز سن کر بھی ان سنی کر کے۔

مینا طٰہٰ کے پیچھے جانا چاہتی تھی۔ لیکن وہ قدم نہ اٹھا سکی...... جیسے زمین نے اس کے قدم جکڑ لیے ہوں......

''طا...... ہا'' آنسوؤں میں 'طٰہٰ' کا تلفظ بھی صحیح طرح ادا نہ ہوسکا۔

مینا وہیں زمین پر ڈھے سی گئی۔ آنکھوں سے آنسو اس طرح نکل رہے تھے، جیسے کسی قدرے خراب نل سے قطرہ قطرہ پانی نکلتا ہے۔

''طٰہٰ......'' مینا نے طٰہٰ کو ایک بار پھر بلانا چاہا، لیکن آواز کہیں گھٹ کر رہ گئی تھی۔

روتے ہوئے اس نے کمرے میں اِدھر اُدھر دیکھا تھا...... کمرے میں پڑی ہر چھوٹی بڑی چیز اسے اژدہا لگی تھی، جو اسے نگلنے کے لیے آگے بڑھ رہی تھی، مینا کے رونے میں مزید شدت آگئی تھی۔

کمرے سے لاؤنج، لاؤنج سے پورچ اور پورچ سے گیٹ تک۔ مین گیٹ پر آکر اس نے اس عالی شان گھر کی طرف دیکھا تھا، جہاں وہ مینا کو اکیلے چھوڑ کر جارہا تھا، ایک چوکیدار گیٹ پر موجود تھا اور رضیہ رخ اللہ اپنے کوارٹر میں، ان دو افراد کے ہونے کے باوجود وہاں مینا اکیلی تھی۔

''شہرت یافتہ لوگوں کو ویسے بھی اکیلے رہنے کی عادت ہوتی ہے......'' یہ سوچ کر طٰہٰ نے پتا نہیں اپنے آپ کو کس چیز کی تسلی دی تھی۔

''صاحب اتنی رات کو کہاں جاتے ہو؟'' چوکیدار نے پوچھا تھا۔

طٰہٰ نے اس کی بات کا جواب نہ دیا تھا...... اور چپ چاپ گیٹ سے باہر نکل گیا تھا اور پھر اسٹریٹ لائٹس کی روشنی میں مدھم ہوتا گیا تھا۔

''اللہ خیر کرے۔ صاحب کافی پریشان لگ رہے ہیں؟ چوکیدار بڑبڑایا تھا۔

مینا وہیں بیٹھی کتنی دیر روتی رہی، لاشعوری طور پر وہ انتظار کرتی رہی کہ طٰہٰ ابھی آجائے گا، لیکن کافی دیر گزرنے کے بعد طٰہٰ نہ آیا تو وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

''طٰہٰ آپ مجھے چھوڑ کر نہیں جاسکتے۔ مجھے کچھ نہیں چاہیے۔ مجھے بس آپ کا ساتھ چاہیے۔'' مینا باہر کی طرف دوڑی تھی، جیسے طٰہٰ کو جاکر پکڑ لے گی۔ کمرے سے لاؤنج تک وہ دوڑتی ہوئی آئی تھی...... لاؤنج بھی وہ دوڑ کر پار کرتی لیکن وہ اس قدر جلدی میں تھی کہ اس نے دھیان ہی نہ دیا اور لاؤنج میں پڑی سینٹر ٹیبل سے جاٹکرائی۔ گھٹنے پر اتنی زور سے چوٹ لگی کہ وہ اپنا توازن ہی نہ رکھ سکی اور منہ کے بل گر پڑی۔ اور سر ماربل کے فرش سے بڑا زور سے ٹکرایا تھا۔ زندگی میں پہلے کبھی اسے اتنی زیادہ چوٹ نہیں لگی تھی۔ جتنی کے اب گرنے سے لگی تھی...... وہ صرف کراہ کر رہ گئی تھی۔ 'طٰہٰ' درد کی شدت کو برداشت کرتے ہوئے اس کے منہ سے بمشکل نکلا تھا۔

......☆☆☆......

اماوس کی رات ویسے بھی کچھ عجیب سی لگتی ہے۔ کچھ ڈراؤنی سے...... یہ بھی اماوس کی رات تھی جب گھر میں ڈاکو گھس آئے۔ دیوار پھلانگ کر...... سیف تہجد کے لیے اٹھے تھے...... ابھی وہ صحن میں پہنچے ہی تھے کہ اسے کچھ لوگ دیوار پھلانگتے نظر آئے۔ وہ چیخنا چاہتے تھے، لیکن ایک ڈاکو نے اس پر پستول تان لیا۔

ویسے بھی اگر وہ چلاتا تو بمشکل ہی کوئی سن سکتا۔ سردیوں کی راتوں میں لوگ ویسے بھی اندر سوتے ہیں۔ دوسرا آنگن ہی اتنا بڑا تھا کہ آواز صرف گونج کر رہ جاتی، کجا کہ کسی دوسرے کے گھر پہنچتی۔

پورا ایک گروہ آیا تھا ڈکیتی کے لیے، آٹھ بندے تھے۔ سارے اسلحہ سے لیس ایک دو تو یقیناً گھر سے باہر بھی ٹھہرے تھے۔

سب کچھ لوٹ کر چلے گئے۔ سب کچھ...... مالی چیز کو کوئی کیا روتا۔ سیف کا تو وہیں بندھے بندھے نروس بریک ڈاؤن ہوگیا تھا، جب اس کے سامنے ان

ڈاکوؤں کا سرغنہ رطابہ کو گھسیٹتے ہوئے دوسرے کمرے میں لے گیا تھا......

سیف، سلطانہ، شاہین اور ساربان سب کو انہوں نے باندھا ہوا تھا۔ سلطانہ اور شاہین جتنا چیختی رہیں، اتنا ڈاکوان کے سر پر بولٹ مارتے جارہے تھے۔

☆☆☆......

طٰہٰ کی آنکھوں میں آنسوؤں کی جھڑی لگی ہوئی تھی۔

''میں شہرت کو ترجیح دوں گی۔'' مینا کا ادا کیا ہوا یہ فقرہ طٰہٰ کو ہتھوڑے کی طرح لگ رہا تھا۔ آنسو بڑی رفتار سے بہہ رہے تھے اور وہ انہیں صاف کرنے کا تکلف بھی نہیں کررہا تھا۔

''بس یہی تھی میری حقیقت'' ایک اور آنسو تیزی سے اپنا راستہ بناتا ہوا ٹھوڑی پر آکر رک گیا۔

''مینا نے صحیح نہیں کیا'' ٹھوڑی پر رُکا ہوا آنسو نیچے گر گیا تھا۔

طٰہٰ بس چلتا رہا تھا، بالکل سیدھا، بغیر کسی منزل کی نشاندہی کے۔ اسے پتا نہیں تھا کہ اب کہاں جانا ہے۔ لگ بھگ پندرہ منٹ ہوگئے تھے اسے گھر سے نکلے ہوئے۔ پندرہ منٹ میں اس نے کافی فاصلہ طے کرلیا تھا۔

ایک پل تو اس کے دل میں خواہش جاگی کہ کسی کار کے نیچے آجائے لیکن ہمت نہ ہوئی۔ اس ذیلی سڑک پر کوئی خاص ٹرانسپورٹ نہیں تھی۔ لیکن جو لوگ ٹرانسپورٹ پر گزر رہے تھے وہ اسے اچنبھے سے دیکھ رہے تھے۔

آدھی شرٹ پینٹ کے اندر اور آدھی باہر نکالے اجڑا ہوا روتا ہوا مرد...... ایک کار والی نے طٰہٰ کے قریب آکر گاڑی روکی بھی تھی۔

"Any Problem?" اس عورت نے پوچھا تھا۔ اس عورت کے ساتھ فرنٹ سیٹ پر ایک دس بارہ سالہ لڑکا بھی بیٹھا تھا، جو شاید اس کا بیٹا تھا، کیوں کہ شکلیں دونوں کی ملتی تھیں۔

طٰہٰ نے نفی میں سر ہلا دیا اور آگے بڑھ گیا، اس عورت نے بھی کندھے اچکائے تھے۔ اور گاڑی اسٹارٹ کرکے آگے بڑھ گئی تھی۔

چند منٹ بعد اس نے کسی کار کے نیچے آنے کا پکا ارادہ کرلیا تھا ''لیکن اگر اس طرح بچ گیا تو......'' یہ سوال طٰہٰ کے ذہن میں ابھرا تھا۔

''مینا کو چھوڑ آیا ہوں تو اب اسے آزاد بھی کردوں'' یہ خیال بھی چند لمحوں بعد آیا تھا۔

''مینا میں تمہیں......'' طٰہٰ نے ابھی منہ سے اتنے ہی الفاظ نکالے تھے کہ رک گیا، دل نے روک لیا تھا۔

''جان کو اپنے آپ سے جدا کردوں'' دونوں آنکھوں سے آنسو ایک ساتھ نکلے تھے۔

''جب اسے میری ضرورت نہیں تو کیا فائدہ'' دل میں ہوک سی اٹھی تھی۔

''ایک بار اسے دیکھ لوں تو اچھا ہے، مزید پتا چل جائے گا کہ اسے میری ضرورت ہے یا نہیں۔''

''دکھ اور رسوائی کے سوا کچھ نہیں ملے گا'' دوسرے خیال نے پہلے خیال کی تردید کی تھی۔ ''شہرت اور محبت میں اس نے شہرت کو پسند کیا ہے تو اب میرے لیے تو کچھ نہیں رہ جاتا۔''

''پھر بھی...... بہتر یہی ہے کہ ایک بار چلا جاؤں۔ اگر اپنے لیے وہاں جگہ نہ ملی تو طلاق دے کر آجاؤں گا۔''

''کیا اس کے بغیر رہ پاؤں گا......؟''

''نہیں مر جاؤں گا۔ اس صورت میں مجھے مرجانا چاہیے......''

طٰہٰ وہیں رک گیا۔ چند لمحے شش و پنج میں کھڑا رہا...... پھر رخ موڑ کر چل پڑا۔ واپس گھر کی طرف...... ہر قدم کے ساتھ دھڑکن تیز ہوتی جارہی تھی...... شہرت اور محبت کی گردان اب بھی ذہن میں جاری تھی۔

ابھی اس نے چند قدم ہی واپسی کی طرف

بڑھائے تھے کہ ایک اور کار اس کے قریب آ کر رکی۔ تین اوباش لڑکے اس کار سے اترے تھے۔ وہ سگریٹ پی رہے تھے۔ منہ سے کش لے کر دھواں ناک سے نکال رہے تھے۔ گھسی ہوئی جینز ان کے لباس میں مشترک تھی۔ وہ کار سے جلدی میں اترے تھے۔ ان میں سے ایک نے طٰہ پر پستول تان لیا۔

''جو کچھ اس وقت ہے ہمارے حوالے کرو۔ "Hurry Up" ایک لڑکے نے غراتے ہوئے کہا تھا۔

ایک لڑکے نے اس کے ہاتھ پشت پر باندھ کر اپنی گرفت میں لے لیے تھے۔ طٰہ کے پاس اس وقت کچھ بھی نہیں تھا۔ ایک لڑکا طٰہ کی تلاشی لینے لگا۔

''کچھ نہیں ہے میرے پاس'' طٰہ نے تلاشی لیتے ہوئے لڑکے سے کہا تھا۔ جب لڑکے کو کچھ نہیں ملا تو اس نے ایک گھونسا طٰہ کے جبڑوں پر مارا تھا۔ ''You Bastard گھر سے کچھ لے کر نہیں نکل سکتے۔ جس لڑکے کے ہاتھ میں پستول تھا۔ اس نے ایک لات طٰہ کے پیٹ میں مارتے ہوئے کہا تھا۔ طٰہ درد سے دہرا ہو گیا تھا۔

طٰہ کی جیبیں خالی پا کر تینوں لڑکے طیش میں آ گئے۔ تینوں نے باری باری اسے مکے اور لاتیں ماریں۔

''یار آج تک کسی کو گولی نہیں ماری۔ کیا خیال ہے آج ایڈونچر ہو جائے۔'' جس لڑکے کے ہاتھ میں پستول تھا۔ اس نے ایک کمینی مسکراہٹ چہرے پر لاتے ہوئے کہا تھا۔

اس نے اپنے ساتھیوں کے جواب کا انتظار بھی نہیں کیا تھا اور طٰہ کی ٹانگ پر گولی ماردی۔

طٰہ کے منہ سے ایک گھٹی گھٹی چیخ نکلی تھی۔ تینوں لڑکوں نے طٰہ کو چھوڑا اور گاڑی کی طرف بھاگے تھے۔ وہ گاڑی کو بھگا کر لے گئے۔ طٰہ وہیں گر پڑا۔

☆☆☆

مینا کے ماتھے سے خون نکل رہا تھا۔ گھٹنا بھی درد کر رہا تھا۔ ہمت کر کے وہ اٹھی تھی اور کاٹن کا ایک پیس لے کر پیشانی پر رکھا تھا۔ زخم زیادہ گہرا نہیں تھا۔ اس لیے چند لمحوں بعد خون بہنا رک گیا۔

مینا کو وحشت ہو رہی تھی۔ ہر چیز سے وحشت۔ طٰہ کے متبادل شہرت، اس نے شہرت پسند کر لی۔ اوہ...... بڑی فاش غلطی ہو گئی تھی اس سے۔ محبت پسِ پشت ڈال دی تھی اس نے۔ طٰہ اسے چھوڑ کر چلا گیا۔ وہ مسلسل روتے جا رہی تھی۔

یہ تو اس نے نہ چاہا تھا اور نہ ہی سوچا تھا کہ شہرت کے بدلے وہ طٰہ کو گنوا دے، لیکن جب ایک چیز کو پسند کرنے کا وقت آیا تو اس نے شہرت پسند کر لی۔

طٰہ کے بغیر اسے کچھ نہیں چاہیے۔ وہ طٰہ کے بغیر کچھ نہیں تھی، اس بات کا احساس اسے اب ہو رہا تھا۔ شہرت وقتی طلب تھی۔ جسے وہ دھندلا سکتی تھی۔ لیکن طٰہ...... طٰہ کے بغیر تو وہ کچھ بھی نہیں تھی۔ جب طٰہ نے کہا کہ اب اسے طٰہ کی ضرورت نہیں تو اسے تردید کرنی چاہیے تھی۔ ہائے۔ وہ کیوں کچھ نہ بولی......

اسے طٰہ چاہیے تھا۔ شہرت کی طلب نے اسے اندھا کر دیا تھا۔ یہاں تک کہ شہرت کی چکا چوند کو مدِنظر رکھتے ہوئے اس نے طٰہ اور اپنے رشتے کے بارے میں کچھ نہیں سوچا تھا۔

طٰہ کو گھر سے نکلے گھنٹہ ہونے کو آیا تھا۔ وہ اب جا کر طٰہ کو کہاں تلاش کرے؟ کہاں ڈھونڈے اسے؟ مینا کا دل چاہا کہ وہ دیوار سے ٹکریں مارے۔ اس نے ایسا کیوں کیا......؟

چند لمحوں بعد فون بج اٹھا۔

''کہیں طٰہ نے تو کال نہیں کی'' اس خیال نے اسے لپک کر فون اٹھانے پر مجبور کر دیا۔ آگے فون پر سلطانہ تھی۔ اس نے روتے ہوئے مینا کو جو کچھ بتایا وہ مینا کے رونگٹے کھڑے کرنے کے لیے کافی تھا، کچھ دیر

بعد گاڑی اس کے گھر سے نکل رہی تھی۔
ڈرائیور کار چلا رہا تھا اور وہ پیچھے بیٹھی رو رہی تھی۔ سیف کی حالت نازک تھی...... اور وہ سیف سے ملنے اسپتال جا رہی تھی۔ گاڑی نے ابھی بہت تھوڑا سا ہی فاصلہ طے کیا تھا کہ اسے ایک شخص سڑک پر اوندھے منہ گرا نظر آیا۔ چند لمحوں میں اسے پتا چل گیا کہ وہ طٰہٰ ہے...... گاڑی رکی تھی۔ طٰہٰ بے ہوش تھا اور اس کی پینٹ خون میں لتھڑی ہوئی تھی۔

......☆☆☆......

وہی ریسٹورنٹ تھا......
غالب اور رطابہ آمنے سامنے بیٹھے تھے، خاموش خاموش۔ رطابہ کی شخصیت میں بہت فرق آ گیا تھا۔ وہ اب خاموش رہتی تھی۔ رنگت بھی زرد ہو گئی تھی۔ آنکھو کے نیچے حلقے بھی آ گئے تھے اور آنکھیں بھی اندر کو دھنس سی گئی تھیں......
رطابہ کے گھر رات کو ہونے والے اس واقعے کو آج پورے ساٹھ دن ہو گئے تھے۔ البتہ سیف کو مرے ہوئے آج انسٹھواں دن تھا۔ سیف اس رات جانبر نہ ہو سکا تھا۔ زندگی اور موت کی جنگ میں موت جیت گئی اور تمغے کے طور پر سیف کو لے گئے۔ اتنے غم ایک ساتھ ٹوٹ پڑے تھے۔ سو انسان کو سنبھلنے کے لیے کچھ نہ کچھ وقت تو ضرور چاہیے۔ غالب نے رطابہ کی دل جوئی کی حتی المقدور کوشش کی تھی۔ رطابہ کو بھی غالب سے ڈھارس ملی تھی۔ سیف کے جانے کے بعد اب رطابہ کے ماموں نے گھر میں قیام کیا ہوا تھا۔
غالب نے آج فیصلہ کر لیا تھا۔ یہی وقت بہتر تھا کہ رطابہ کو سب بتانے کا۔ جتنی دیر ہوتی اتنا رطابہ کو زیادہ دکھ ہوتا۔ غالب نے اپنے آپ کو بھی سمجھانے کی بہت کوشش کی تھی کہ اسے بھی سمجھوتا کرنا چاہیے، لیکن دل راضی نہ ہوا تھا۔ سو آج اس نے رطابہ سے بات کرنی تھی۔ اسی لیے وہ رطابہ کو یہاں لایا تھا۔

کھانے سے پہلے بات کرے یا کھانے کے بعد...... یہ فیصلہ کرنے میں بھی مشکل ہو رہی تھی، بالآخر اس نے کھانے کے بعد بات کرنے کا فیصلہ کیا......
کھانا آیا۔ دونوں نے برائے نام کھایا۔ ویٹر برتن سمیٹ کر لے گیا۔ بل ادا ہو گیا، اب بات کرنے کا وقت آ گیا تھا۔ بہت مشکل تھا یہ۔
''رطابہ میں نے تم سے بہت اہم بات کرنی ہے۔''
''ہاں کہو۔ میں محسوس کر رہی ہوں تم مجھ سے کوئی بہت خاص بات کرنا چاہتے ہو......'' غالب نے ایک طویل سانس لی تھی۔ الفاظ ترتیب دیے تھے۔ چند لمحوں کا وقفہ کیا تھا اور بولنا شروع کر دیا۔
''رطابہ...... میں سمجھتا ہوں...... یہ تمہاری زندگی کا مشکل ترین وقت ہے۔ جس ہمت سے تم نے کام لیا ہے۔''
''کام کی بات کرو غالب!'' رطابہ نے غالب کی بات کاٹی تھی۔ رطابہ کا دل بڑی شدت سے دھڑک رہا تھا۔ اسے محسوس ہونے لگا تھا جیسے کوئی بہت خاص بات ہونے والی ہے۔
''وہ اصل میں...... میں نے بہت سوچ بچار کی ہے، لیکن بات میرے ذہن سے نکلتی ہی نہیں۔ اور مجھے اندازہ ہے نکلے گی بھی نہیں۔ بہتر ہے اس کے کہ میرا دل ساری عمر کھٹکتا رہے۔ اور میں تمہارے حقوق بھی ادا نہ کر سکوں اس لیے میں......'' غالب 'میں' پر آ کر رک گیا تھا۔ جبکہ رطابہ کو اپنا سانس رکتا محسوس ہوا تھا۔
''میں...... میں تم سے شادی نہیں کروں گا۔'' غالب نے کہہ کر سر جھکا لیا۔ اس کی نظریں اپنے کٹے ہوئے بازو پر آ کر ٹھہر گئی تھی۔
رطابہ نے اسے قبول کیا تھا جب وہ Crisis میں تھا لیکن وہ رطابہ کے Crisis میں اس کا ساتھ نہیں د سکتا تھا۔ دل نہیں مانتا تھا۔ دماغ چاہے جتنا ہامی بھرے۔ جب تک دل نہ مانے۔ فعل حقیقی نہیں لگتا،

سطحی، مصنوعی اور غیر فطری لگتا ہے۔ غالب کا دل بھی نہیں مان رہا تھا۔ رطابہ کے ساتھ ہونے والے حادثے کے بعد وہ غالب کے لیے پہلے جیسی نہ رہی تھی۔ خاموشی کا وقفہ طویل ہوتا جا رہا تھا۔

''اوکے۔ نو پرابلم......'' رطابہ نے جگ میں سے پانی گلاس میں ڈالا تھا اور غٹا غٹ پی گئی تھی۔ پانی پینے سے انسان کے رونے کے چانسز کم ہو جاتے ہیں...... رطابہ بھی غالب کے سامنے رونا نہیں چاہتی تھی۔

''سوری......'' غالب کے لیے یہ لفظ ادا کرنا بھی مشکل تھا۔ اسے پتا تھا وہ بہت بُرا کر رہا ہے، جس کی تلافی ممکن نہیں ہے، لیکن جب اس کے دل میں جگہ ہی نہیں بن رہی تھی تو وہ رطابہ کو گھر میں لا کر کیا کرتا۔

''اٹس اوکے......'' رطابہ یہ کہہ کر کھڑی ہو گئی تھی۔ ریسٹورنٹ سے واپسی پر وہ غالب کے ساتھ گھر نہیں آئی تھی، بلکہ آٹو رکشا سے گھر آئی تھی۔ رکشے میں اس نے بڑے ضبط سے کام لیا تھا، لیکن پھر بھی آنکھ سے چند ایک آنسو نکل آئے تھے...... البتہ گھر آ کر اپنے کمرے میں تکیے سر دے کر وہ خوب روئی تھی۔

......☆☆☆......

''مینا۔ سو رہی ہو؟'' طٰہٰ نے بہت ہی مدھم آواز میں کہا تھا۔ اگر مینا سو رہی ہو تو اٹھ نہ جائے۔ مینا طٰہٰ کی طرف پشت کر کے لیٹی تھی...... طٰہٰ کو کوئی جواب موصول نہیں ہوا۔ جس کا مطلب تھا کہ وہ سوئی ہوئی ہے۔

طٰہٰ کو نیند نہیں آ رہی تھی۔ رات بارہ بجے سے اوپر ٹائم ہو گیا تھا۔ وہ کھڑکی میں آ کر کھڑا ہو گیا۔ ابھی اسے چلنے میں دشواری ہوتی تھی۔ لنگڑا کر چلتا تھا۔ طٰہٰ نے کھڑکی کھولی تھی۔ کھڑکی سے لان کا خوبصورت منظر دکھائی دیتا تھا۔ آج چاندنی رات تھی، سو لان کا منظر اور بھی دل کش محسوس ہوتا تھا۔ وہ کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔ سوچوں نے اس پر غلبہ پایا ہوا تھا۔ مختصر سے وقت میں بہت کچھ ہو چکا تھا۔ رطابہ کے ساتھ زیادتی، سیف کی موت، اس کا مینا کے ساتھ رشتہ بھی چند لمحے کے لیے کمزور ہوا تھا۔ اور اس کے علاوہ اسے لگنے والی گولی۔ اور پھر دو تین دن پہلے ایک اور اندوہ ناک خبر ان کی سماعت پر بوجھ بنی تھی۔ غالب رطابہ سے شادی کے لیے تیار نہیں تھا۔

''یہاں کیوں کھڑے ہیں آپ؟'' طٰہٰ کو مینا کی آواز سنائی دی تھی۔

''بس ویسے ہی نیند نہیں آ رہی تھی۔ تم سوئی نہیں تھی یا آنکھ کھل گئی۔''

''بس مجھے بھی نیند نہیں آ رہی تھی۔ آپ یہاں کیوں کھڑے ہیں چلیں سو جائیں۔''

''نہیں ابھی نہیں۔ بس دل نہیں کر رہا۔'' طٰہٰ نے کہا تھا۔ مینا نے طٰہٰ کو دیکھا تھا، اور پھر خود بھی طٰہٰ کے مخالف سمت میں کھڑی ہو گئی تھی۔ ویسے سونے کا مینا کا بھی دل نہیں کر رہا تھا۔ اور نہ ہی نیند آ رہی تھی۔

دونوں خاموش کھڑے تھے۔ دونوں غالب کے بارے میں سوچ رہے تھے۔ دونوں کو غالب کا فیصلہ بے حسی اور خود غرضی کا ثبوت لگ رہا تھا۔

''ایک بات تو بتاؤ مینا۔'' طٰہٰ نے لان میں کسی غیر مرئی نقطے کو دیکھتے ہوئے کہا تھا۔

''جی کہیے'' مینا نے چہرے پر آئی لٹ کو کان کے پیچھے اڑسا تھا۔

طٰہٰ نے ایک طویل سانس لی تھی۔ چہرہ موڑ کر ایک نظر مینا کو دیکھا تھا۔ اور پھر سے باہر لان میں دیکھنے لگا۔ چاندنی میں لان بالکل واضح تو نہ تھا، لیکن بہرحال اچھا لگ رہا تھا۔

''تم...... تم مجھے غالب کی طرح چھوڑ تو نہ دو گی۔'' طٰہٰ نے نچلے ہونٹ کو دبایا تھا...... مینا پہلے بھی طٰہٰ سے معذرت کر چکی تھی۔ روتے ہوئے اس نے اپنی وفا کا بھی یقین دلایا تھا۔

؎ فرقت نے جھلسایا، آنکھیں بھیگ گئیں

جذبوں کی ہر ایک کہانی یاد آئی
اتنا پیار بھی خود پر بھاری تھا
اب جو سنبھلے تو ہر اک نادانی یاد آئی

مینا کی آنکھوں کے کٹورے خود بخود آنسوؤں سے بھر گئے۔ اس نے طٰہٰ کی نظروں کا تعاقب کیا تھا۔ طٰہٰ سے پوچھے بغیر اسے اندازہ نہیں ہوسکتا تھا کہ اس نے کس نقطے کو فوکس کیا ہوا ہے۔ مینا کی نظر بھٹک گئی تھی اور اس نے آنکھوں میں آئے آنسوؤں کو صاف کیا تھا۔

''میں آپ کے بغیر نہیں رہ سکتی۔'' مینا نے اپنا ہاتھ طٰہٰ کے کندھے پر رکھا تھا۔

''اور شہرت کے بغیر رہ سکتی ہو کیا؟'' طٰہٰ کا دل دھڑکا تھا۔ دو مہینوں میں مینا کے اطوار اس بات کا جواب تو دے چکے تھے، لیکن پھر بھی وہ تصدیق کرنا چاہتا تھا، دل کے اطمینان کے لیے۔

''مجھے آپ کے سوا کچھ بھی نہیں چاہیے۔ شہرت بھی نہیں...... شہرت کا کیا کرنا ہے......!!'' مینا کی آنکھیں ایک بار پھر تم ہوئی تھیں۔

طٰہٰ کے اندر تو جیسے کسی نے قندیلیں جلادیں۔ چہرے پر مسکراہٹ آگئی۔ اس نے مینا کی طرف دیکھا تھا۔ مینا سر جھکائے کھڑی تھی۔ طٰہٰ نے ایک قدم کا فاصلہ طے کیا تھا...... اسے مینا کے گالوں پر نمی محسوس ہوئی تھی۔ یہ پہلی بار تھا کہ طٰہٰ کو مینا کا رونا اچھا لگ رہا تھا......

......☆☆☆......

''ارے آپ تو لڑکے والوں کی سائیڈ پر ہیں...... آپ کو تو کچھ بھی نہیں ملے گا۔''

''لڑکے والوں کی طرف سے ہوں تو کیا ہوا۔ دلہن بھی تو میری بہن ہے۔''

''یہ چیٹنگ ہے۔''

''کوئی چیٹنگ ویٹنگ نہیں۔ بس تم دیر مت کرو۔ جلدی سے پیسے نکالو۔ میں بھی دو ہزار سے کم تو کسی صورت نہ لوں گی۔''

غزل

ہنسے تو آنکھ سے آنسو رواں ہمارے ہوئے
کہ ہم پہ دوست بہت مہرباں ہمارے ہوئے
بہت سے زخم ہیں ایسے جوان کے نام کے ہیں
بہت سے قرض سر دوستاں ہمارے ہوئے
کہیں تو آگ لگی ہے وجود کے اندر
کوئی تو دکھ ہے چہرے دھواں ہمارے ہوئے
گرج برس کے نہ ہم کو ڈبو سکے بادل
تو یہ ہوا کہ وہی بادباں ہمارے ہوئے
فراز منزل مقصود بھی نہ تھی منزل
کہ ہم کو چھوڑ کے ساتھی رواں ہمارے ہوئے
احمد فراز کی جاناں جاناں سے
نگینہ بابر، گوجرانوالہ کا انتخاب

''دو ہزار، بھابی آپ تو مجھے کنگال کردیں گی۔''

''کوئی کنگال نہیں ہوتے تم دو ہزار سے، جب مینا کو دو ہزار دیے ہیں تو مجھے بھی دیے جاسکتے ہیں۔ جلدی کرو۔ دیر ہوتی جارہی ہے۔'' مینا نے علیزہ کے منہ میں فیڈر دیا تھا۔ علیزہ کو اس نے اٹھایا ہوا تھا۔ سال بھر کی ہونے والی تھی علیزہ۔

ہاشم نے برا سا منہ بنایا۔ چہرے پر مصنوعی بے چارگی لائی اور جیب سے والٹ نکال کر اس میں سے دو ہزار نینا کی ہتھیلی پر رکھ دیے۔

نکاح ہوچکا تھا۔ آدھ گھنٹے بعد رخصتی بھی ہوگئی۔ سلطانہ اور شاہین کی آنکھیں بار بار پرنم ہوتی تھیں۔ خدا کے اس احسان پر کہ رطابہ کی شادی ہورہی تھی۔

مینا اور نینا بھی بہت خوش تھیں۔ آخر ان کی بہن اپنے گھر کی ہورہی تھی۔ باقی سب ٹھیک تھا البتہ نینا آج کل علیزہ کی صحت کے بارے میں پریشان تھی۔ علیزہ دانت نکال رہی تھی۔ موشن ہر وقت لگے رہتے۔ اس کے علاوہ ہر وقت روتی رہتی تھی، سو نینا کا تھوڑا بہت

پریشان ہونا فطری تھا۔

عاشر اور طہٰ بھی آپس میں خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ ساربان بھی بھاگ بھاگ کر چھوٹے موٹے کام سرانجام دے رہا تھا۔ وہ بہت خوش تھا۔

غالب کی والدہ عارفہ، زاہدہ کی گہری سہیلی تھیں۔ زاہدہ نے پرزور تاکید کی تھی کہ وہ آئے، سو وہ بھی موجود تھیں۔ انہیں کافی ملال تھا کہ غالب کو رطابہ کو نہیں چھوڑنا چاہیے تھا، لیکن انہیں غالب بھی غلطی پر محسوس نہیں ہوتا تھا، جب اس کا دل نہیں مانتا تو وہ کیوں کر زبردستی کا رشتہ قائم کرے۔ جس عمارت کی بنیاد کمزور ہو اس کے قائم رہنے یا گرنے کے بارے میں کوئی وثوق سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔

رطابہ سپاٹ تاثرات لیے دلہن بنی بیٹھی تھی۔ اسے شادی کے لفظ سے کافی خوف ابھی بھی محسوس ہو رہا تھا، لیکن وہ حقیقت پسند تھی اور جانتی تھی کہ اکیلی وہ زندگی نہیں گزار سکتی، اسی لیے تو وہ آج دلہن بنی بیٹھی تھی۔ ویسے ہاشم کے رشتے کی حامی بھرنے میں اس ہاں بھی شامل تھی۔

نینا اور رطابہ اب دیورانیاں بننے جا رہی تھیں، اس بات سے بھی نینا کافی خوش تھی۔

ہاشم آئیڈیلزم پر یقین رکھتا تھا۔ اسے آج تک کوئی لڑکی بھی اپنے آئیڈیل جیسی نہیں ملی تھی، لیکن رطابہ اس کے آئیڈیل کے قریب قریب تھی۔ ہاشم نے رطابہ کو پہلی بار نینا کی گود بھرائی کی رسم میں دیکھا تھا۔ وہ شاید رطابہ کی طرف متوجہ بھی ہوتا، اگر اسے چند لمحوں بعد پتا نہ چل جاتا کہ وہ غالب کے ساتھ منسلک ہے، رطابہ کا رشتہ لینے میں زاہدہ اور ہاشم دونوں کی رضا شامل تھی۔ نینا کی رضا تو ہونی ہی تھی۔ رطابہ کے ساتھ ہونے والے حادثے کا صرف زاہدہ، ہاشم اور عاشر کو پتا تھا...... یہاں تک کہ اکرم صاحب سے بھی اس بات کو پوشیدہ رکھا گیا تھا۔

ہاشم کو رطابہ کے ساتھ ہونے والے حادثے کی مطلق کوئی پروا نہ تھی۔ ہاشم کے نزدیک وہ صرف حادثہ تھا جو کسی کے ساتھ بھی ہو سکتا تھا۔ اس بات پر کسی سے ہمدردی کرنے یا اپنانے کے حق میں وہ بالکل بھی نہیں تھا۔

رخصت ہو کر رطابہ ویسے گئی تو وہیں اکرم صاحب کے گھر تھی، لیکن کچھ دنوں تک اس نے واپس یہیں آجانا تھا، ہاشم کے ساتھ۔ شاہین اور سلطانہ کو وہ اکیلے نہیں چھوڑ سکتے تھے۔ ماموں اگر یہاں رہتے تو ان کا اپنا گھر اکیلا ہوتا تھا۔

ہاشم اور رطابہ کے یہاں شفٹ ہونے پر اکرم صاحب کے علاوہ کسی کو اعتراض نہ تھا۔ اکرم صاحب کو بھی جو تھوڑا بہت اعتراض تھا وہ بھی مجبوری کے پیچھے چھپ گیا تھا۔

گھر میں کل تین کمرے تھے...... ایک عاشر اور نینا کے پاس...... ایک کلیم صاحب اور زاہد کے پاس...... اگر تیسرا کمرہ رطابہ اور ہاشم کو دے دیتے تو مہمانوں کے لیے کون سا کمرہ استعمال کیا جاتا؟ اور عاشر کہاں رہتا...... سمن اگر میکے آتی تو وہ کہاں رہتی؟

ان تمام سوالوں کا حل یہی تھا کہ ہاشم اور رطابہ کو وہیں رطابہ کے میکے میں رہنے دیا جائے تو کوئی حرج نہیں۔

......☆☆☆......

''اٹھ گئے آپ...... صبح بخیر'' ہاشم نے آنکھیں کھولی تھیں، تو رطابہ کی آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی تھی۔

رطابہ ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑی بالوں میں کنگھا کر رہی تھی۔

''صبح نماز کے لیے کیوں نہیں اٹھے۔ دو بار میں نے اٹھایا تھا، اس کے علاوہ آپ کے سیل فون کا الارم بھی بجا تھا۔'' ہاشم نے رطابہ کی بات کا کوئی جواب نہ دیا بلکہ آنکھیں موند لیں۔

''آنکھیں بند مت کریں، پھر سے نیند آجائے

گی۔'' رطابہ نے قریب قریب چیختے ہوئے کہا تھا۔

''رطابہ اپنا والیم آہستہ رکھا کرو۔ بہرہ نہیں ہوں میں۔'' ہاشم نے دانت دباتے ہوئے آنکھیں کھولی تھیں۔

''تو پھر اٹھیے نا۔ کتنی دیر ہوگئی۔ گرمیوں کے آٹھ ہو رہے ہیں۔ ویک اینڈ کا آدھا دن تو آپ نے سو کر گزار دیا۔''

''اٹھتا ہوں۔ بھئی اٹھتا ہوں۔ نہیں اٹھا تو تم یوں ہی میرا سر کھاتی رہو گی۔'' یہ کہہ کر ہاشم اٹھ بیٹھا۔

''اب کے بار مارکیٹ جائیں گے تو ضرور یاد دلوایے گا۔ لکڑی کا کنگھا لیں گے۔ ان پلاسٹک کے کنگھوں سے تو موٹے بال ہی بہت ٹوٹتے ہیں۔''

''شادی سے پہلے بھی میرے پاس لکڑی کا ایک کنگھا تھا...... اپنے سنگل بیڈ کی دراز میں رکھتی تھی۔ شادی کے ہنگاموں میں گم ہوگیا۔ اب جا کر دیکھتی ہوں۔ اللہ کرے پڑا ہی ہو۔ اور آپ خدارا اب واش روم تشریف لے جایے۔ کیسے ہر وقت سوئے رہتے ہیں آپ۔ میں کنگھا دیکھنے جا رہی ہوں۔ واپسی پر ناشتا لیتی آؤں گی۔ اماں بھی کیا سوچتی ہوں گی کہ دولہا صاحب آدھا دن سوئے رہتے ہیں۔ ہاں جب واپس آؤں تو منہ ہاتھ دھو کر بیٹھے ہوں۔'' رطابہ نے سائیڈ پر پڑا دوپٹا اٹھایا تھا اور باہر نکل گئی تھی۔

ہاشم نے دانت کچکچائے تھے اور اٹھ کر واش روم میں گھس گیا۔

وہ رطابہ کی زبان سے کافی عاجز تھا۔ ہر وقت پڑ پڑ چلتی رہتی تھی۔ سوال بھی خود کرتی تھی اور جواب بھی خود ہی دے دیتی تھی۔ اسے اس بات کی مطلق پرواہ نہیں تھی کہ ہاشم سن رہا ہے یا نہیں۔ بس بے ڈھنگی باتیں کرتی رہتی۔ مہینے بعد رطابہ کے فائنل ایئر کے پیپرز تھے...... ان کی تیاری بھی کر رہی تھی...... دعا بھی کرتی رہتی کہ یا اللہ سپلی نہ آئے۔

ہاشم نے ایک بار سوچا تھا کہ یہ لڑکی جب ڈاکٹر کی سیٹ پر بیٹھے گی تو بول بول کر مریضوں کے کان کھا جائے گی...... اپنی سوچ پر وہ کافی دیر مسکراتا رہا تھا۔

رطابہ کا سابقہ بیڈ اب سلطانہ کے استعمال میں تھا۔ وہ اب سلطانہ اور شاہین کے مشترکہ کمرے میں تھی اور بیڈ کی درازوں کو کھنگال رہی تھی کہ کہیں لکڑی کا کنگھا پڑا ہو۔ ایک سائیڈ کے دراز دیکھنے کے بعد وہ دوسری سائیڈ کی دراز دیکھنے لگی۔ دوسری سائیڈ کے دراز نسبتاً کم ہی کھلتے تھے۔ کنگھا تو نہ ملا، البتہ نیلے رنگ کا "Miss You" کا ایک کارڈ اس کے ہاتھ لگ گیا، رطابہ نے کارڈ کھول کر دیکھا تھا۔

''غالب کی باقی چیزیں تو واپس کر دی تھیں، پتا نہیں یہ کیسے رہ گیا؟؟'' رطابہ نے بڑبڑاتے ہوئے کہا تھا اور کارڈ میں لکھی غزل سرسری طور پر پڑھنے لگی۔

یہ دل، یہ اجڑی ہوئی چشم نم، یہ تنہائی
ہمارے پاس تو جو بھی ہے مال درد کا ہے
اسیر ہے میری شاخِ نصیب پت جھڑ میں
میرے پرندۂ دل پر بھی جال درد کا ہے
ہم اس کو دیکھتے جاتے ہیں روتے جاتے ہیں
یہ صحنِ شب میں پڑا ہے جو تھال درد کا ہے
اب اس کے بعد کوئی رابطہ نہیں رکھنا
یہ بات طے ہوئی لیکن سوال درد کا ہے
وہیں کسی گھاٹی میں تیرا ہجر بھی ہے
میرے لہو سے جہاں اتصال درد کا ہے

غزل کو پڑھنے کے بعد رطابہ نے منہ بنایا تھا۔ اور کارڈ کے کئی ٹکڑے کر دیے تھے...... ان ٹکڑوں کو کمرے سے باہر جاتے ہوئے اس نے ڈسٹ بن میں پھینکا تھا۔ کارڈ کے باقی تمام ٹکڑے تو ڈسٹ بن کے اندر گرے تھے۔ لیکن ایک ٹکڑا ڈسٹ بن کے باہر گرا تھا، جس کی طرف رطابہ کا دھیان نہیں گیا تھا۔ کارڈ کے اس ٹکڑے پر 'میرے پرندۂ دل' لکھا ہوا تھا......

☆☆☆

ناول

بینا عالیہ

تیرے عشق نچایا

عشق کی راہداریوں، طبقۂ اشرافیہ اور اپنی مٹی سے جڑے
لوگوں کی عکاسی کرتے سلسلے وار ناول کی سترہویں کڑی

گزشتہ اقساط کا خلاصہ

ملک قاسم علی جہان آباد کے مالک تھے۔ ان کا شمار ضلع خوشاب کے جانے مانے زمینداروں میں ہوتا تھا۔ ان کے دو بیٹے ملک عمار علی اور ملک مصطفیٰ تھے۔ عمار علی ریاست کے امور میں دلچسپی لیتے تھے جبکہ ملک مصطفیٰ علی چھوٹی بہن امل کے ساتھ تعلیم کے سلسلے میں لاہور رہائش پذیر تھے، ملک عمار علی کی شادی ان کی کزن ماہین سے ہوئی تھی۔ وہ اٹھارہ سالہ لڑکی خود سے عمر میں کئی سال بڑے ملک عمار علی کو ذہنی طور پر قبول نہ کرسکی تھی۔ وہ کانوینٹ سے پڑھی ہوئی اور خاصے آزاد خیالات رکھتی تھی، جو لائف بھرپور طریقے سے انجوائے کرنا چاہتی تھی۔ اُمِ فروا اُمِ زارا اور اسماعیل بخش مولوی ابراہیم کی اولادیں ہیں۔ اُمِ فروا کی شادی بلال حمید سے ہوئی ہے جو میڈم فیری کے لیے کام کررہا ہے۔ میڈم فیری کا تعلق اس جگہ سے تھا جہاں دن سوتے اور راتیں جاگتی ہیں۔ بلال حمید اُمِ فروا کو پہلی بار میکے لے کر آیا تھا کہ میڈم فیری کی کال آگئی......

میڈم فیری نے بلال عرف بالو کو باور کرایا کہ جلد اُمِ فروا کو ان کے حوالے کردے۔ بلال حمید کے لیے یہ ناممکن سا ہوگیا تھا کیونکہ وہ اُمِ فروا سے واقعی محبت کرنے لگا تھا۔ ماہین اپنے دیور مصطفیٰ علی میں دلچسپی لینے لگی تھی۔ امل کی تعلیم مکمل ہوتے ہی اُس کی شادی اُس کے کزن محمد علی کے ساتھ ہونے کی تیاریاں ہونے لگی تھیں لیکن امل کے خیالات کسی اور طرف بھٹکنے لگے تھے۔

ماہین اپنے بچپن کے دوست کاشان احمد سے ملتی ہے تو پتا چلتا ہے کاشان بچپن ہی سے اُس میں دلچسپی لیتا تھا مگر کبھی محبت کا اظہار نہ کرپایا۔ ماہین اپنے آئیڈیل کے اس طرح بچھڑ جانے پر دکھی ہے۔ کاشان احمد ملک سے باہر جانے سے پہلے ماہین سے محبت کا اظہار کردیتا ہے۔ ماہین ملک عمار علی سے ویسے ہی ناخوش ہے اس پر کاشان احمد کا اظہارِ محبت اُس کی زندگی میں ہلچل مچادیتا ہے۔

ماہین کے دل میں کاشان احمد کی محبت بھی جڑ پکڑ رہی ہے اور اب وہ عمار علی کی شدتوں سے مزید خائف ہونے لگی ہے۔ امل کی شادی اس کے کزن محمد علی کے ساتھ ہوجاتی ہے۔ محمد علی اُسے محبتوں کی بارش میں نہلا دیتا ہے اور یوں فوجی افسر کی بیوی بن کر وہ اپنی پہلی محبت کی یادوں سے پیچھا چھڑا لیتی ہے۔ ماہین اور عمار علی کے بیچ میں تکرار ہونے لگی ہے۔ میڈم فیری بلال کو اُمِ فروا پر کڑی نظر رکھنے کا کہتی ہے۔ ایک دن اچانک بلال کی ملک مصطفیٰ علی سے ملاقات ہوجاتی ہے اور وہ انہیں اعتماد میں لے کر اپنی اور اُمِ فروا کی رام کتھا سنا دیتا ہے۔ ملک مصطفیٰ علی اُسے اپنے ساتھ مراد ولا میں لے جاتا ہے اور انیکسی میں رہائش اختیار کرنے کا حکم دیتا ہے۔ فیری بلال کی تلاش میں ہے۔

اچانک ملک قاسم علی کی وفات ہوجاتی ہے۔ سارا جہان آباد سوگ میں ڈوبا ہے۔ ملک عمار علی سارے انتظام اپنے ہاتھ میں لے کر بڑے ملک کے فرائض انجام دینے لگتے ہیں۔

ماہین کی ذرا سی غفلت اُسے نہ چاہتے ہوئے بھی ماں بنا دیتی ہے۔ ماہین کے دل میں کسی طرح بھی بچے کی محبت پیدا نہیں

ہو پاتی۔ وہ ماں کے سنگھاسن پر بیٹھ کر بھی کاشان کی محبت کی ہُوک اپنے دل میں محسوس کرتی ہے۔ امل دوسری بار ماں بننے والی ہے۔ محمد علی مہرالنساء بیگم سے امل کا خیال رکھنے کا کہتا ہے۔ اِدھر مہرالنساء بیگم دادی بننے کے بعد چاہتیں ہیں کہ ماہین ریاست کی بڑی ملکائن کی ذمے داریاں اُن کی زندگی ہی میں اپنے ہاتھ میں لے لے۔ ماہین اِس صورتِ حال سے سخت متنفر ہے۔ وہ جلد از جلد جہان آباد سے واپس لاہور جانا چاہتی ہے۔ لیکن ملک عمار علی اُس کی باتیں سن کر......

(اب آگے پڑھیے)

''اُس نے سختی سے نچلے ہونٹ پر دانت گاڑھ دیے تھے، تب اُس کی آنکھوں میں بے مرادی کی نمی پھیلی تھی۔

تھوڑی دیر بعد جب وہ کچن سے اُس کے لیے دودھ اور سلائس گرم کر کے لایا تھا تو وہ اُسے دیکھتے ہوئے خواہ مخواہ خوش ہو رہا تھا۔ چہرے پر مسکراہٹ سجانے میں کامیاب ہو چکا تھا۔

تھوڑی دیر پہلے اُمِ فروا کی سنی باتوں نے اُس کے دل میں گہرے گھاؤ لگائے تھے۔ لیکن وہ خوش تھا۔ اب وہ جلد از جلد اُمِ فروا کو وہ خوشی دینا چاہتا تھا جس کی تڑپ اُمِ فروا کے دل میں تھی۔

''اُمِ فروا میں خود چائے بنا لیتا۔ تم زیادہ مت چلو پھرو۔ تمہیں ریسٹ کرنا چاہیے۔''

''معمولی فیور تھا اب ٹھیک ہوں۔'' اُس نے لاپروائی سے شانے اچکائے۔

''اپنے گھر والوں کے لیے اُداس ہو؟'' بلال حمید کی نگاہیں اس اس کی لانبی گوری پتلی اُنگلیوں والے ہاتھوں پر رک گئی تھیں، جن میں اُس نے بلیک کپ پکڑا ہوا تھا۔

''کافی دن جو رہ کر آئی ہوں، اُداسی تو رہے گی۔''

''میں سوچ رہا تھا، تمہاری طبیعت ٹھیک ہوئی تو شام کو تمہیں سیر کے لیے لے جاؤں گا۔ کچھ شاپنگ بھی کر لینا۔''

''اِس کی ضرورت نہیں ہے۔ میرے پاس سب کچھ موجود ہے۔'' تب بلال حمید کے اندر زہریلی کاٹ بھری سنسناہٹ برپا ہوئی۔ وہ اُسے لحہ لحہ یہ باور نہیں کرانا چاہتا تھا کہ تم فی الحال میری منکوحہ ہو اور تمہاری ذمے داری مجھ پر لاگو ہوتی ہے۔ وہ اب بلال حمید سے کترانے لگی تھی۔ اُمِ فروا آج بہت اُداس تھی۔ اُسے سب گھر والے شدت سے یاد آ رہے تھے۔

سنڈے کی اس دوپہر چھٹی کی وجہ سے بلال حمید گھر پر ہی تھا۔ اچانک ملک مصطفیٰ علی آ گئے۔ لائٹ براؤن شلوار سوٹ میں بے حد ڈشنگ لگ رہے تھے، چہرے پر ہمیشہ کی طرح ہلکی ہلکی مسکان پھیلی ہوئی تھی۔

''ملک صاحب کیا لیں گے ٹھنڈا یا چائے، کوفی۔''

''کچھ نہیں۔'' وہ ٹانگ پر ٹانگ رکھے بیٹھ گئے۔ اُن کی نگاہیں اُمِ فروا کو تلاش رہی تھیں۔ جو اُنہیں کہیں دکھائی نہ دے رہی تھی۔ اُس نازک اندام لڑکی نے تو اتنے قوی سراپے والے ملک مصطفیٰ علی کا سکھ چین غارت کر کے رکھ دیا تھا۔

اُن کی نگاہیں بار بار اُمِ فروا کو ڈھونڈ رہی تھیں۔ بلال حمید اُن کی بے چینی جانچ گیا تھا۔

''اُمِ فروا واش روم میں مشین لگائے کپڑے دھو رہی ہے۔''

''بلال میں نے تم سے کہا تھا مالی کی بیوی کو گھر کے کام کاج کے لیے رکھ لو۔''

''ملک صاحب میں نے اُمِ فروا سے کہا تھا۔ لیکن اُس نے منع کر دیا۔ دراصل وہ نہیں چاہتی کوئی اُسے یہاں پر دیکھے۔''

''ٹھیک ہے۔'' اُن کی نگاہیں بار بار سامنے بیڈ روم کی جانب اُٹھتیں۔

''ملک صاحب میں اُمِ فروا کے سلسلے میں آپ سے کچھ بات کرنا چاہتا ہوں۔''

''ہاں بولو۔''

''میں چاہتا ہوں مولوی ابراہیم کو بتا دیا جائے تاکہ میں خلع کے پیپرز تیار کرالوں۔''

''بلال تمہیں اتنی جلدی کس بات کی ہے؟''

''پتا نہیں میں خود نہیں جانتا، بس یہ چاہتا ہوں یہ سب کام جلد از جلد ہوجائے۔ پھر عدت پوری کرنے میں بھی دن لگیں گے۔'' جب سے بلال نے اس شب اُمِ فروا کے منہ سے ملک مصطفیٰ علی کا نام نکلتا سنا تھا، بلال حمید کی خواہش تھی ملک مصطفیٰ علی اس سلسلے میں خود کچھ پیش رفت کریں۔ اُمِ فروا کی بابت کچھ تو بولیں۔

''بلال کوئی اور حل نہیں نکل سکتا؟''

''ملک صاحب میں نے بہت سوچا ہے۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا۔ مولوی ابراہیم کو پتا چلے گا تو......''

''وہ فوراً اُمِ فروا کو گھر بٹھالیں گے۔'' ملک مصطفیٰ علی نے بلال کی ادھوری بات مکمل کردی۔

''آپ درست کہہ رہے ہیں ایسا ہی ہوگا۔ ملک صاحب یہ بھی ہوسکتا ہے تب مولوی صاحب آپ پر بھی بھروسا نہ کریں۔ یہ بھی ہوسکتا ہے وہ عزت کی خاطر جلد بازی سے قدم اٹھاتے ہوئے اُمِ فروا کو کسی ایرے غیرے کے پلّے باندھ دیں۔''

''ہاں بلال تمہارا خیال درست ہونے کے چانس بھی کافی زیادہ ہیں۔ یہ تو ایسی لڑکی ہے جسے پھولوں کی راہگزر پر چلنا چاہیے۔ یہ نہ ہو کہ اپنی عزت وانا کو بچانے کے لیے اُمِ فروا کو کانٹے بھرے رستے پر ڈال دیں۔ بلال جو بھی کرنا ہوگا بہت سوچ بچار کے بعد فیصلہ لینا ہوگا۔ بلال اگر اُمِ فروا تمہارے عقد میں رہے تو بہتر نہیں ہے؟'' ملک مصطفیٰ علی اُس کی طرف دیکھ کر گویا تھے۔

''ملک صاحب ایسا ممکن نہیں ہے۔''

''بھئی کیوں ممکن نہیں ہے؟'' وہ اندر سے اچھی طرح بلال حمید کو کھنگال رہے تھے۔

''میں خود کو اس کا اہل نہیں سمجھتا، وہ بھی میرے جیسے لُوز کریکٹر شخص کے ساتھ نہیں رہنا چاہتی۔ اس روز اُس نے کہا تھا ناں۔ اُمِ فروا کے لیے تو اُسی جیسا پارسا شخص ہونا چاہیے۔'' تب ملک مصطفیٰ علی نے بے چینی سے بلال حمید کی طرف دیکھا۔

''ملک صاحب کیا سوچ رہے ہیں؟'' کافی دیر سے اُنہیں سوچوں میں گم دیکھ کر بلال بولا۔

''کچھ نہیں۔'' اُنہوں نے انگلیوں کی پوروں سے ٹھوڑی کھجائی۔

''ملک صاحب آپ کی نظر میں کوئی اچھا لڑکا ہے؟'' بلال حمید اُن سے خود نہیں کہنا چاہتا تھا کہ آپ اُمِ فروا کو اپنالیں۔

''کس لیے۔'' وہ انجان بن گئے۔

''اُمِ فروا کے لیے۔''

''اس جیسا تو شاید دنیا میں کہیں نہ ملے۔'' اُنہوں نے سوچتی متحرک آنکھوں سے بلال حمید کی طرف دیکھا۔ وہ تذبذب کی کیفیت سے دوچار تھے۔

''ملک صاحب آپ بہت اچھے، بہترین انسان ہیں اور آپ کہہ رہے ہیں دنیا میں اس جیسا اور کوئی نہیں ہے۔'' بلال حمید نے اُن کی جانب مبہم سا اشارہ کیا۔ اُن کے بند ہونٹوں کے کناروں پر معنی خیز مسکان آکر ٹھہر گئی۔

''بلال تم کیسے کہہ سکتے ہو میں صالح اور فصیح شخص ہوسکتا ہوں۔ تم نے مجھے کب زاہدوں، عابدوں کی محفلوں

میں بیٹھتے اٹھتے دیکھا؟ اس لڑکی کو دیکھ کر خدا یاد آتا ہے۔ جب پہلی بار جمعے کے روز میں تمہارے گھر گیا تھا وہاں اُمِ فروا کو دیکھ کر خدا کی خدائی پر ٹوٹ کر پیار آیا تھا۔''

وہ ٹانگ پر ٹانگ رکھے جوتی کی نوک کو حرکت دیتے خیالوں کے جزیروں میں بہت دور نکل گئے تھے۔

''ملک صاحب آپ پھر کہاں کھو گئے؟'' اُنہوں نے چونک کر قریب بیٹھے بلال حمید کی طرف دیکھا۔ اس بار مسکراہٹ ہونٹوں تک نہ آسکی۔

''کچھ نہیں تم کیا کہہ رہے تھے۔''

اُمِ فروا کی بات کر رہا ہوں۔ ملک صاحب گستاخی معاف ایک بات پوچھ سکتا ہوں؟''

''ہاں کیوں نہیں تم ہر بات کھل کر مجھ سے کر سکتے ہو۔ میں دل سے تمہیں اپنا اچھا دوست مانتا ہوں۔''

اُمِ فروا کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟''

''بلال تمہیں کیوں ضرورت پڑ گئی یہ سب جاننے کی؟''

''ویسے ہی پوچھ لیا۔'' اُمِ فروا اب یہاں زیادہ دن نہیں رہے گی۔ یہی اُداسی ہر پل بلال حمید کے چہرے پر کھوئی رہتی۔

''بلال اُمِ فروا جیسی لڑکی میں نے آج تک نہیں دیکھی۔ حالانکہ میں نے دنیا کا قریہ قریہ گھوما، بے شمار لڑکیاں دیکھیں لیکن اس جیسی کوئی نہ پائی۔ اب مجبوراً ہمارے سامنے آئی ہے ورنہ میں سمجھتا ہوں شادی سے پہلے اس نے کبھی کسی غیر محرم شخص کو دیکھا بھی نہیں ہوگا۔ اس کی پارسائی کی وجہ سے میں اس کی مدد کرنا چاہتا ہوں۔ یقیناً تم نے بھی تو اس لیے اس کی مدد کی۔ ورنہ تم اسے لائے کس نیت سے تھے۔ تم نے آج تک اس پر اپنے شوہر ہونے کا حق نہیں جتایا۔ تمہیں بھی تو اس نے بے دین سے دین دار کر دیا نا۔'' ملک مصطفیٰ علی تو کب سے بلال حمید کا مدعا سمجھ گئے تھے لیکن وہ اُس کی زبان سے سننا چاہتے تھے۔

''بلال تم میرے دوست ہو، تمہیں جو کہنا ہے کھل کر کہو۔ کسی قسم کی جھجک یا معافی وغیرہ کو درمیان میں مت لاؤ۔ بولو کیا کہنا چاہتے ہو؟'' وہ تو کب کے منتظر تھے کہ بلال حمید اُمِ فروا کی بابت اُن سے بات کرے۔

''ملک صاحب اُمِ فروا کو اگر آپ اپنے عقد میں لے لیں تو۔ تو مجھے بے حد اطمینان ہو جائے گا۔ میں سمجھوں گا میں نے اس لڑکی کو اس کے صحیح مقام پر پہنچا دیا ہے۔

اچانک ملک مصطفیٰ علی کے اندر شہنائیاں، مرکیاں بج اٹھی تھیں۔ وہ خود کو ہواؤں میں اڑتا محسوس کر رہے تھے۔ بادلوں پر تیر رہے تھے۔ اُن کی آنکھوں میں انجانی سوچوں کے دائرے روپوش ہو چکے تھے۔ اُن کی شہد آگیں ڈارک براؤنش آنکھوں میں دونوں جہاں سمٹ آئے تھے۔

''ملک صاحب میری بات اگر گراں گزری ہے تو معافی چاہتا ہوں۔''

''ارے نہیں بلال۔'' ملک مصطفیٰ علی نے خوشی سے بے قابو ہوتے ہوئے اُس کی پیٹھ تھپتھپائی۔ ''میں خود کو اس اچھی لڑکی کا اہل نہیں سمجھتا۔''

''ملک صاحب آپ کو خود معلوم نہیں کہ آپ کتنے اچھے ہیں۔ اگر آپ نے اُمِ فروا کو سہارا نہ دیا تو ممکن ہے مولوی ابراہیم سوچے سمجھے بغیر کسی بھی شخص سے اس کا عقد پڑھا دیں گے۔ یہ بات مجھے بہت پریشان کر رہی ہے۔ وہ بہت مذہبی آدمی ہیں۔ اللہ اور اُس کے رسول کے حکم کے مطابق چلنے والے ہیں۔ وہ اُمِ فروا کے ساتھ کچھ بھی

کر سکتے ہیں۔ آپ خود سوچیں وہ جسے اُمِ فروا کو سونپیں گے۔ کیا وہ اپنے دل سے یہ بات نکال دے گا کہ یہ پہلے کسی اور کے نکاح میں رہی ہے۔ کیا وہ اُمِ فروا پر بھروسا کرے گا؟ ملک صاحب مرد بہت شکی مزاج ہوتا ہے۔ وہ باہر خود جو مرضی کرتا پھرے لیکن بیوی اُسے نیک ہی چاہیے ہوتی ہے۔ بے شک خود دن رات غیر عورتوں کی گود میں سر رکھے پڑا رہے لیکن طلب ایسی بیوی کی کرتا ہے جس پر کسی کی نگاہ نہ پڑی ہو۔ ملک صاحب میرے دماغ میں ہر وقت یہی کچھ چلتا رہتا ہے۔ مولوی صاحب سے کچھ بھی بعید نہیں ہے۔ ملک صاحب کیا اُمِ فروا کے لیے آپ کے دل میں کوئی سافٹ کارنر ہے؟ مجھے جانے کیوں لگتا ہے ایسا ہی ہے۔ آپ کی آنکھوں کا احوال بار ہا سنا ہے۔ اسے دیکھتے ہی آپ کی آنکھوں کے در و بام میں قندیلیں روشن ہو جاتی ہیں۔ ہونٹوں پر گلاب کی پنکھڑیاں اتر آتی ہیں۔''

''تم درست کہہ رہے ہو بلال۔'' ملک مصطفیٰ علی نے اعتراف کر لیا۔ وہ تو کب سے اُن کے اندر پارے کی مانند بکھر گئی تھی۔ جب میلاد کے دن لاؤنج سے اپنے کمرے کی طرف جانے والی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے کسی کی مدھر آواز نے اُن کے تیزی سے آگے بڑھتے قدم روک دیے تھے۔

سفید ٹائلز کی چوڑی سیڑھیوں پر جب اُن کے پیر منجمد ہو گئے تھے، اُنہوں نے لمحے کے ہزارویں حصے میں پلٹ کر دیکھا تھا وہ سفید دوپٹے کے تھرتھراتے ہالے میں آنکھیں بند کیے۔ ''محمد محمد میں کرتی رہی...... '' پڑھ رہی تھی۔

''بہت شکریہ ملک صاحب! آپ نے میرے دل کا بہت بڑا بوجھ اتار دیا۔ خدا آپ کو اس نیکی کا بہترین اجر دے۔''

''بلال انشاء اللہ اجر تو اُمِ فروا کی صورت مجھے مل جائے گا۔''

''آپ نے تو بلال حمید کو خرید لیا ملک صاحب۔''

''بلال میں تو بہت گناہ گار ہوں۔'' تشکر کے طور پر اُن کی آنکھوں میں نمی اتر آئی، جسے اُنہوں نے بمشکل اندر ہی اندر اتارا تھا۔

''تو آپ اس سے عقد کے لیے تیار ہیں؟''

''ہاں۔''

''آپ کے پیرنٹس؟''

''مجھے یقین ہے اُمِ فروا کو دیکھنے کے بعد میری ماں کو کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ اسے دیکھتے ساتھ وہ عزت و تکریم کے ساتھ اسے اپنی بہو تسلیم کر لیں گی۔''

''ملک صاحب دیکھیں اللہ پاک خود ہی اس کے لیے تمام راہیں ہموار کرتا چلا جا رہا ہے۔ خدا نے آپ کو بھیجا ہی اس کی مدد کے لیے تھا۔ نہ میں بینک جاتا، نہ آپ کی گاڑی کا ٹائر پنکچر ہوتا، نہ میں ٹائر بدلنے میں آپ کی مدد کرتا۔ لیکن ایسا خدا کو منظور تھا۔ راہیں خود بخود سہل ہوتی چلی گئیں۔ وہ اللہ ہی تو ہے، جس نے اس لڑکی کو اتنی بڑی آزمائش سے نکالا۔''

''تم صحیح کہہ رہے ہو بلال۔ کیا مولوی صاحب کو بتا دیا جائے؟'' ملک مصطفیٰ علی نے بلال حمید کی طرف دیکھا۔

''مولوی ابراہیم فوراً اُمِ فروا کو اپنے گھر بُلا لیں گے اور اپنی حیثیت کا اندازہ کرتے ہوئے وہ کبھی بھی اُمِ فروا کا نکاح آپ سے نہیں کریں گے کیونکہ وہ بہت زیادہ مذہبی اور قناعت پسند انسان ہیں۔''

''پھر؟'' ملک مصطفیٰ علی نے اُسے دیکھا۔

''میں کچھ سوچ رہا ہوں۔''

''کیا؟''

''اُمِ فروا کو میں طلاق دے دیتا ہوں، عدت کے سوا چار ماہ تک کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوگی۔ اس کے بعد آپ اس سے عقد کرلیں۔'' یہ کہتے ہوئے کئی بار بلال حمید کے دل کا خون ہوا تھا۔ اندر سے کوئی اُسے کند چھری سے ذبح کررہا تھا۔ وہ اپنے ہاتھوں سے اپنی زندگی کسی اور کو سونپ رہا تھا۔ وہ ایسا کرنے پر مجبور تھا کیونکہ اُمِ فروا اس کے ساتھ نہیں رہنا چاہتی تھی۔ 'میں اگر اُسے اپنی تشنگی کی بھینٹ چڑھاتا رہتا یہ تو بے غیرتی ہوتی میری۔'

''بلال کیا سوچ رہے ہو۔'' ملک مصطفیٰ علی نے آہستگی سے بلال حمید کا کندھا دبایا۔

''خدا سے دعا کررہا ہوں۔ مالک میرے حصے کی خوشیاں بھی اُمِ فروا کا نصیب بنادے۔''

''بلال خدا تمہیں بھی بے شمار خوشیوں سے نوازے۔ خدا کے حضور تمہاری یہ نیکی انشاء اللہ قبولیت پائے گی۔ کیونکہ تم نے اپنے دل میں کہیں بھی کوئی کھوٹ نہیں آنے دیا۔ نیک نیتی سے تم نے اُمِ فروا کی بھلائی چاہی۔''

''میں طلاق کے پیپرز تیار کروالیتا ہوں۔''

''پہلے اُمِ فروا سے بات کرلو۔'' ملک مصطفیٰ علی بلال حمید سے مخاطب ہوئے۔

''پہلے پیپرز تیار ہوجائیں، پھر اُس سے بھی بات کرلیں گے۔ ان دونوں کی نگاہیں بیک وقت اُمِ فروا پر ٹھہریں جو نہا کر واش روم سے نکلی تھی۔ کپڑے دھونے کے بعد اُس نے ڈرائیر میں ڈال دیے تھے۔ اس وقت وہ فیروزی اور پنک پھولوں والے سوٹ میں بہت نکھری نکھری دکھائی دے رہی تھی۔ یک بارگی اُس کی سیاہ آنکھوں میں دبیز کہکشاں اتر آئی۔ گالوں پر منعکس ہوتے رنگ ان دونوں سے بھی چھپ نہ پائے۔ بلال حمید نے بغور ملک مصطفیٰ علی کی جانب دیکھا جن کے گلابی ہونٹ، بہت خاص مسکانوں کے بوجھ تلے دب رہے تھے۔ وہ نپے تلے قدم اٹھاتی ہال میں چلی آئی۔ بڑے سے دوپٹے میں اُس نے خود کو لپیٹ رکھا تھا۔

''اسلام علیکم۔'' اس نے اندر ہوتی مداخلت کو سرزنش کی۔

''وعلیکم السلام۔'' وہ عالمِ بے خودی میں ٹکر ٹکر اُسے دیکھ رہے تھے۔ وہ کچن کی طرف بڑھنے لگی تو بلال حمید نے اُسے پکارا۔

''اُمِ فروا دو کپ چائے بنادو۔''

''جی اچھا۔''

''تین کپ۔'' ملک مصطفیٰ علی نے مسکرا کر کہا۔ تب اُس نے اثبات میں مڑی پلکوں کو جنبش دی۔

تھوڑی دیر بعد وہ چائے کے ساتھ کیک اور نمکو رکھے ہال میں لے آئی۔ ملک مصطفیٰ علی نے کن انکھیوں سے اُمِ فروا کی طرف دیکھا۔ وہ دن بدن نکھرتی جارہی تھی۔ اُس کے چہرے پر اک انوکھا روپ اتر آیا تھا۔ وہ اپنا چائے کا کپ اٹھا کر اندر جانے لگی۔ تو بلال حمید نے اُسے پکارا۔

''اُمِ فروا تم سے کچھ بات کرنی ہے۔ اِدھر آکر بیٹھو۔'' وہ بنا کچھ کہے سائیڈ پر رکھے صوفے پر بیٹھ گئی۔ اور اپنی نگاہیں سامنے لگی پینٹنگ میں الجھالیں۔ بلال حمید نے ملک مصطفیٰ علی کو بات شروع کرنے کے لیے اشارہ کیا۔ ملک مصطفیٰ علی نے ہنکارا بھر کر گلا صاف کیا، گہرا سانس اندر لے جاتے ہوئے سرعت سے اُسے باہر کی طرف خارج کیا۔

''اُمِ فروا میں اور بلال چاہتے ہیں جلد تمہاری پریشانی ختم ہوجائے۔''

''ممنون ہوں۔'' اُس نے گھنیری دراز پلکیں اوپر اٹھائیں۔

''اُمِ فروا آپ کیا چاہتی ہیں۔ آپ بلا جھجک اپنی رائے بتائیں۔''

''میری رائے؟'' آواز کی پورپور میں نرمیاں گھل رہیں تھیں۔ ''آپ مجھے میرے پیرنٹس کے پاس پہنچادیں۔''

''اُمِ فروا اگر ایسا آسان ہوتا تو ہم آپ کو کب کا وہاں بھیج چکے ہوتے۔''

''اس میں مشکل کیا ہے۔''

''آپ کے والدین اتنا بڑا صدمہ سہہ پائیں گے؟'' ملک مصطفیٰ علی اُس سے پوچھ رہے تھے۔ ''وہ عزت دار لوگ ہیں۔ یہ سب سن کر ہی بے موت مرجائیں گے۔ تمام عمر اُنہوں نے اللہ اور اس کے رسول کی پیروی کی ہے۔ ہر اُٹھنے والا قدم پھونک پھونک کر رکھا ہے۔ اپنے ہر گزر جانے والے لمحے کا احتساب خود ہی کیا ہے۔''

''کبھی نہ کبھی اُنہیں یہ زہریلا سچ تو سننا ہی ہوگا۔ پھر دیر کرنے کا فائدہ؟''

''آپ جانتی ہیں سچ سننے کے بعد اُن کا ردِعمل کیا ہوگا؟''

''میں تمام عمر اُن کا سامنا کرنے کی خود میں ہمت نہیں کر پاؤں گی۔''

''اُمِ فروا یہ بھی تو ہوسکتا ہے آپ کے والدین جس محلے میں رہتے ہیں اُن لوگوں کا سامنا کرنے سے کترائیں۔ لوگوں کی باتوں سے پریشان ہوجائیں۔'' ملک مصطفیٰ علی نے اُمِ فروا کی طرف دیکھا۔

''آپ پلیز مجھے غلط نہ سمجھیں، نہ ہی میری بات کا بُرا منائیے گا۔ اگر آپ یہاں سے چلی جاتی ہیں۔ بلال آپ کو آزاد بھی کردیتا ہے۔ تب آپ کے والدین فوراً سے پہلے آپ کا نکاح کسی دوسری جگہ کردیں گے۔ بنا یہ سوچے کے لڑکا کیسا ہے۔ کیا کرتا ہے۔ شاید آپ کی برادری کا ہی کوئی شخص آپ اور آپ کے والدین پر احسانِ عظیم کرتے ہوئے آپ سے عقد کے لیے تیار ہوجائے۔ آپ کو یقین ہے وہ آدمی تمام عمر آپ کو چین سے رہنے دے گا؟ سوچیں پھر کیا ہوگا۔'' ملک مصطفیٰ علی کی باتوں سے اُمِ فروا مزید اُلجھ گئی تھی۔ مارے بے بسی کے اس نے اُن کی طرف دیکھا۔

''میں پھر آپ سے کہوں گا اچھی طرح سوچ لیں۔''

''پھر اس مسئلے کا کیا حل ہوسکتا ہے؟''

''اُمِ فروا واقعی آپ بلال کے ساتھ نہیں رہنا چاہتیں؟''

''ان کے ساتھ رہ کر نہ اُنہیں خوش رکھ سکوں گی نہ خود خوش رہ پاؤں گی۔'' اُمِ فروا نے نگاہیں جھکالیں۔

''اُمِ فروا میں خود بھی چاہتا ہوں جلدی تمہیں آزاد کردوں۔ ممکن ہے اس طرح میرے گناہوں کی کچھ تلافی ہوجائے۔ میں بس تمہیں خوش دیکھنا چاہتا ہوں۔ میں تمہیں بہت جلد آزاد کردوں گا۔ پھر اگر تمہارا دل مانے تو تم ملک صاحب سے نکاح کرلینا۔ ملک صاحب بخوشی تمہیں اپنانے کے لیے تیار ہیں۔ بلکہ تمہیں اپنے خاندان میں اعلیٰ مقام بھی دلائیں گے، جس کی تم مستحق ہو۔ یہ سب کی موجودگی میں تم سے نکاح کریں گے۔''

بلال حمید بول رہا تھا اور وہ گم صم سی سن رہی تھی۔ اُسے اپنی سماعتوں پر یقین نہیں آرہا تھا۔ وہ ایسا کچھ نہیں سوچ سکتی تھی۔ پہلے ہی وہ اپنے رب سے بہت شرمندہ تھی کہ ایک غیر محرم شخص کیونکر اس کے خیالوں میں آتا ہے، اس کے نہ چاہنے کے باوجود بھی۔

''میں اپنے والدین کی مرضی کے بغیر خود سے کوئی فیصلہ نہیں لے سکتی۔''

''دیکھیں اُمِ فروا وہ بعد میں ہر صورت مان جائیں گے۔ لیکن ابھی وہ قطعی نہیں مانیں گے۔ اگر آپ کہیں گی تو میں اپنے بھائی بھابی اور ماں جی کو آپ کے پیرنٹس کے پاس لے کر جاؤں گا لیکن نکاح کے بعد۔''

''میں اتنا بڑا فیصلہ والدین کے بغیر نہیں کر سکتی۔''

''ٹھیک ہے پھر آپ کی مرضی ہے۔ بلال آپ کو آپ کے والدین کے پاس چھوڑ آئے گا۔'' وہ اچانک زرد پڑ گئی۔ یہ دونوں جو کب سے اُسے سمجھا رہے تھے وہی سچ تھا۔ ابا جی فوری طور پر اس کا نکاح اس کی دور پار کی پھوپی زیتون کے بیٹے شبیر سے کر دیتے۔ اُمِ فروا کی منگنی کے ٹوٹنے کے بعد کافی بار شبیر کے لیے اُمِ فروا کا رشتہ مانگ چکی تھی۔ جس کی بیوی مر چکی تھی اور نو سالہ ایک بیٹی تھی۔ پھوپی زیتون مولوی ابراہیم سے ناراض تھیں۔

''کیا سوچ رہی ہیں۔'' وہ چونکی۔ ''آپ اچھی طرح سوچ لیں میں چلتا ہوں۔ کل آپ مجھے اپنے فیصلے سے آگاہ کر دیجیے گا۔'' بلال حمید اُنہیں دروازے تک چھوڑنے چلا گیا۔ اُمِ فروا چائے کے برتن سمیٹ کر کچن میں آ گئی۔

☆☆

دو دن سے وہ بہت بے چین تھی۔ وہ کسی فیصلے پر نہ پہنچ پا رہی تھی۔ وہ شدید الجھن کا شکار تھی۔ ہر طرف گتھیاں الجھی ہوئی دکھائی دیتی تھیں۔ جب اندر کی بے چینیاں حد سے بڑھ جاتیں تو وہ اُمِ زارا سے فون پر بات کرتی رہتی۔ ابا جی، بے بے جی اسماعیل سے بات کرتی۔ وہ اوپری کہتی آپ آ کر مجھے مل جائیں ورنہ وہ نہیں چاہتی تھی اُس کے میکے سے کوئی اسے ملنے آئے۔ وہ خوف زدہ تھی کہیں اس کے حالات کی کسی کو بھنک نہ پڑ جائے۔

جب اُداسیوں کے موسم اس کے اندر بے کلی پھیلاتے، وہ قرآن پاک کھول کر بیٹھ جاتی اور تفسیر کے ساتھ پڑھنے لگی۔ پھر وہ عبادت کے نوافل پڑھنے شروع کر دیتی۔ اس کے بعد قرار دل کو گویا گو سکون میسر آ جاتا، پریشان کن خیالات کے جزیرے اس سے کوسوں دور رہ جاتے۔ جب تھک جاتی تو آنکھیں بند کیے لیٹ جاتی۔ وہ سارا دن گھر پر تنہا ہوتی تھی۔

بلال صبح ملک مصطفیٰ علی کے ساتھ فیکٹری چلا جاتا اُس کی واپسی بھی ملک مصطفیٰ علی کے ساتھ ہوتی۔ کبھی آٹھ بجے تو کبھی نو بجے۔

☆☆

ویک اینڈ کی اس دوپہر بلال حمید مالی کو نئے پودے لگوانے کے متعلق کہہ رہا تھا، اچانک ملک مصطفیٰ علی چہل قدمی کرنے اس طرف نکل آئے۔

''آیئے ملک صاحب۔''

''بلال تمہارے لان میں تو خوب بہار آئی ہوئی ہے۔''

''جی۔'' اُس نے پھیکی مسکراہٹ پر اکتفا کیا۔ کیا بتاتا! بہاریں تو باہر ہیں۔ اس کے اندر تو خزاں نوحہ کناں ہے۔

''دھوپ کافی تیز ہے۔ اندر چل کر بیٹھتے ہیں۔'' وہ دونوں اندر آ گئے۔ اُمِ فروا پورے گھر کی صفائی کر چکی تھی۔ مالی صبح ہی اسے بہت سارے ریڈ روز دے گیا تھا۔ جو اس نے ہال میں کرسٹل واز میں ڈال کر رکھ دیے تھے۔ اب اس چھوٹی سی انیکسی کے در و بام سے گلابوں کی خوشبو ایک اچھا احساس پیدا کر رہی تھی۔

جونہی ملک مصطفیٰ علی اندر آئے اطراف میں پھیلی خوشبو نے اُن کا خیر مقدم کیا۔ چھوٹا سا سفید چھتوں اور ٹی کلر دیواروں والا گھر اُنہیں گہری طمانیت بخش گیا اور اس ڈول ہاؤس میں، دبے پاؤں گھومتی اک نازک اندام موم کی گڑیا جیسی لڑکی بہت سج رہی تھی۔ یہاں پر گلاس ونڈوز سے چھن چھن کر آتی سنہری دھوپ۔ اس وقت اُمِ فروا دیوار گیر کھڑکی کے قریب کھڑی تھی۔ اُنہیں اندر آتے دیکھ کر اس نے دوپٹا درست کیا۔

''السلام علیکم۔'' ملک مصطفیٰ علی نے سلام کرنے میں پہل کی۔
''وعلیکم السلام۔'' یکایک اُس کی آنکھوں میں گہری چمک عود آئی۔ جو بلال حمید نے صاف محسوس کی۔
''آپ چائے بہت اچھی بناتی ہیں، سوچا آج پھر آپ سے چائے کی فرمائش کی جائے۔''
اُمِ فروا نے اثبات میں بوجھل پلکیں نیچے گرائیں اور کچن میں چلی آئی۔ وہ دونوں ہال میں بیٹھ گئے۔ اسے دیکھتے ہی ادھورے لفظ ابھی تک مکمل نہ ہوئے تھے۔ ملک مصطفیٰ علی کی آنکھوں کی پتلیوں پر اتر آئے تھے۔ کیا وہ بھی مجھے میری ہی طرح سوچتی ہے۔ ''پتا نہیں، پتا نہیں۔'' اُن کے ہونٹ تھرتھرائے۔ تو بلال حمید نے چونک کر اُنہیں دیکھا۔ وہ جانتا تھا ملک مصطفیٰ علی بے خود کر دینے والے لمحوں کے بیچ میں اکثر رہتے ہیں۔
آج وہ پھر چائے کے ساتھ مختلف لوازمات رکھے ٹرالی ان کے قریب لے آئی تھی۔ جب بھی شام کو بلال حمید ملک مصطفیٰ علی کے ساتھ فیکٹری سے گھر کے لیے نکلتا تھا، تو ملک مصطفیٰ علی راستے سے گورمے کی بیکری سے کچھ نہ کچھ لیتے۔ ساتھ میں وہ بلال کے لیے بھی شاپر بنوا لیتے۔ ہر مرتبہ بلال حمید اُنہیں منع کرتا۔
''بلال تم خواہ مخواہ میرا شکریہ ادا نہ کیا کرو۔ کیا فرق پڑتا ہے اگر کچھ تمہارے لیے بھی لے لیتا ہوں تو۔'' بلال تو صبح آفس چلا جاتا فریج میں ایسے ہی بیکری کا سامان پڑا رہتا، اُمِ فروا کو کھانے پینے کا کچھ اتنا شوق نہیں تھا۔
''آپ بھی بیٹھیں۔'' ملک مصطفیٰ علی نے اُمِ فروا کی طرف دیکھا تو وہ اپنی مخصوص جگہ پر بیٹھ گئی۔
''اُمِ فروا اُس روز آپ سے جو بات کہی تھی، کیا سوچا آپ نے۔'' ملک مصطفیٰ علی چائے کا سِپ لیتے ہوئے بولے۔
''میں خود سے اتنا بڑا فیصلہ کیسے لے سکتی ہوں، بنا اپنے والدین کے۔''
''آپ کو ہمت تو کرنا ہوگی۔ اس کے بنا کوئی چارہ نہیں ہے۔ آپ سے وعدہ کرتا ہوں میں آپ کے والدین کو منالوں گا۔ بلکہ ہر طرح سے اُنہیں مطمئن کرنے کی کوشش بھی کروں گا۔ آپ کی بے گناہی اور مجبوری کی اُنہیں ہر ممکن یقین دہانی کراؤں گا۔ آپ قطعی فکر مند نہ ہوں۔'' اس وقت ملک مصطفیٰ علی نہیں جان سکتے تھے بلال حمید کی کیا حالت ہو رہی ہے۔ جب اُمِ فروا سے اس کے سبکدوش ہونے کا ذکر ہوتا تو اُسے لگتا جس سمت نظریں اٹھائے آسمان اُسے اپنے سر پر دکھائی نہ دیتا، تب پاؤں تلے سے زمین بھی سرکتی محسوس ہوتی۔
اُمِ فروا اُس سے بچھڑ جائے گی۔ اُمِ فروا تمہارے ہونے نے مجھے میرے پاک رب سے ملا دیا۔ تمہارے شوق میں میں نے نمازیں ادا کیں۔ کیا میرے یہ سجدے، میرے اور میرے رب کے درمیان تھے؟
کیا میرے یہ سجدے ادا بھی ہوئے تھے یا نہیں؟
اس کی جنبشِ لب میرا ذکر کیوں کر کرے گی۔ میں نے اسے اتنے دکھ دیے ہیں وہ کس کی طرح بار بار نہ مری ہوگی۔ مرنے جینے کا عمل اگر بار بار دوہرایا جائے تو بے حد تکلیف دہ ہوتا ہے۔ کیا میرے دل کے قریہ قریہ کو۔ یہ ابدی ویرانیاں سونپ جائیں گی۔
بلال حمید بے طرح چونکا ملک مصطفیٰ علی اُمِ فروا سے کہہ رہے تھے۔
''کیا بلال طلاق کے پیپرز تیار کروالے۔''
''ٹھیک ہے۔ اُمِ فروا نے آہستگی سے کہا۔ آنکھوں میں بھر آنے والے آنسو آخر بندھ توڑ کر باہر نکل ہی آئے۔ اُس کے۔۔۔ عارضوں پر ہیرے کی طرح چمکنے والے سفید آنسو دیکھ کر دونوں بے چین ہوا تھے۔

''اُمِ فروا ہمت سے کام لیں۔ روح کو اذیت پہنچانے والے لمحوں سے تو آپ کو گزرنا ہی ہوگا۔ دو تین دن تک بلال آپ کو اپنے نکاح سے آزاد کردے گا۔ اس کے بعد سوا چار مہینے عدّت کے ہوتے ہیں۔ عدّت پوری ہونے کے بعد جیسا آپ چاہیں گی ویسا ہی ہوگا۔'' اُمِ فروا پر کپکپی طاری ہوگئی تھی۔ اس کے لب کپکپا رہے تھے۔ اُس کی بربادی کا پروانہ سنایا جارہا تھا۔ وہ کتنی ہمت سے ان دو مردوں کے درمیان بیٹھی تھی۔ دونوں ہی اس کا حصول چاہتے تھے۔

''آپ کے ذہن میں یہ سوال اٹھ رہا ہوگا۔ اس دوران آپ رہیں گی کہاں؟ آپ اِدھر ہی رہیں گی۔ اگر آپ کہیں تو آپ کے لیے خادمہ کا انتظام کردوں۔''

''اس کی ضرورت نہیں ہے۔ میں کسی کے سامنے نہیں آنا چاہتی۔''

''ٹھیک ہے۔ بلال سے بھی پھر آپ کا زیادہ سامنا نہیں ہوا کرے گا یہ تو رہتا ہی انیکسی کے بغل والے کمرے میں ہے۔ میں کوشش کروں گا۔ پھر ان کے سامنے نہ آؤں۔''

اُس کی آواز رندھی جارہی تھی وہ اچانک تم سے آپ پر آچکا تھا۔ وہ اپنے کندھوں پر اپنی لاش اٹھائے بمشکل بیٹھا ہوا تھا۔ اُسے ایسا محسوس ہورہا تھا گھپ کالی رات کے دشت بھرے ریگ زاروں میں دیوہیکل غاروں میں وہ منہدم ہوتا چلا جارہا ہے، وقت کے قہر نے کتنی سفاکی سے بلال حمید کو اپنے ترکش میں جکڑ لیا تھا۔ لمحے اُس کے طرقہ سے بھربھری ریت کی مانند نکل چکے تھے۔ اب وہ بے کسی کے عالم میں بیتے لمحوں کو کیسے صدائیں دیتا۔ کون اس کی فریاد سنتا، اُسے اُس وقت کوئی کونہ کھدرہ نہیں مل رہا تھا جہاں چھپ کر رو لیتا تاکہ دو چار آنسو بہانے سے اس کے دل کا بوجھ اتر جاتا۔

ملک مصطفیٰ علی جاچکے تھے وہ کب سے یوں ہی صوفے پر بیٹھا ہوا تھا۔

اس وقت اُمِ فروا اپنے کمرے میں بین کرتیں دہائیوں سے گھبرا کر قرآن پاک کھول کر بیٹھ گئی تھی۔

اس کی سیاہ آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گر رہے تھے۔ اس کا گلا خشک تھا، جیسے اس میں کسی نے میخیں ٹھوک دی تھیں۔ آواز گلے کی گھور اندھیری کوٹھری میں ہی گم ہوچکی تھی۔ اس کے جسم پر رعشہ کی سی کیفیت طاری تھی۔ ''طلاق...... طلاق...... طلاق۔'' جیسے کوئی اس کے کانوں میں گرم لاوا اُنڈیل رہا تھا۔ اس کی سسکیاں گلے کے اندر دبی ہوئی تھیں۔

بلال حمید بے قراری سے اٹھا اور انیکسی سے باہر نکل گیا۔ وہ بھی پتلی سی کم چوڑی سڑک پر چلا جارہا تھا۔ اُسے کچھ معلوم نہ ہوسکا کہ وہ کہاں جارہا ہے وہ اس وقت چونکا جب وہ اُونچے گنبد والے مرکزی گیٹ کی بارہ دری کے تلے کھڑا تھا اور اندر سے گیٹ بند تھا۔ اُس نے اپنے گرد دیکھا وہ بے خیالی میں کہاں چلا آیا تھا۔ وہ تو اُمِ فروا کو بتا کر ہی نہیں آیا تھا، نہ ہی اُس نے باہر سے گیٹ بند کیا تھا۔ وہ واپسی کے لیے مڑا۔ اور تیز تیز قدم اٹھانے لگا۔

جب وہ واپس آیا تو ابھی تک اُمِ فروا جائے نماز پر بیٹھی تھی۔ اُس نے خدا کا صد شکر ادا کیا کہ اُمِ فروا خیریت سے تھی۔ فیری کی جانب سے اُسے اکثر دھڑکا لگا رہتا تھا۔ ملک مصطفیٰ علی نے فیری کو دو مرتبہ پیغام بھجوایا تھا کہ اگر تم اپنی سلامتی چاہتی ہو تو یہ شہر چھوڑ کر کہیں اور چلی جاؤ۔ اُمِ فروا نے جائے نماز طے کر کے رکھی اور ہال میں آگئی۔

''آپ کے لیے کھانا لاؤں۔''

''مجھے بھوک نہیں ہے۔ تم کچھ کھالو۔''

"مجھے بھی بھوک نہیں ہے۔" بلال حمید نے اُس کی آنکھوں کی طرف دیکھا جو لال ہو کر سوج رہی تھیں۔ وہ کافی دیر تک روتی رہی تھی اُس کی حالت دیکھ کر بلال حمید کا دل کٹ رہا تھا۔ وہ اُسے کیسے دلاسا دیتا، یہ کرم بھی تو اُسی کا کیا ہوا تھا۔ اُس کا دل چاہا وہ اُمِ فروا کے قدموں میں گر کر اُس سے معافی مانگ لے پھر اُسے خیال آیا ابھی تک یہ میرے نکاح میں ہے، مجھے اس کے پیروں کو نہیں چھونا چاہیے۔ شاید اس طرح ہم دونوں ہی گناہ گار بن جائیں کہ ابھی تک میں اس کا خدائے مجازی ہوں۔ جو کچھ میں نے اس کے ساتھ کیا، اس کی سزا مجھے تمام عمر پشیمانی کی صورت میں بھگتنا ہوگی۔ میرے مالک یہ سزا تو میرے لیے بہت کم ہے کہ میں ہمیشہ تڑپتا رہوں اور مجھے قرار نہ آئے۔

☆☆

فروری ڈھل چکا تھا، مارچ کے اوائل دن تھے، موسم بہت اچھا ہو گیا تھا۔ بلال حمید نے اُمِ فروا کی رضامندی سے اُسے طلاق کی سوغات سونپ دی تھی۔ وہ خاموش و گم صم تھی۔ آج کی شام اس پر شامِ غریباں بن کر اتری تھی، وہ بے یار و مددگار تھی۔ کوئی اس کا پُرسانِ حال نہیں تھا، نہ ہی اسے کوئی ایسا کندھا میسر تھا جس پر سر رکھ کر رو لیتی۔ اس کے تمام پیارے اُس سے دور تھے۔ وہ سب اسے شدتوں سے یاد آرہے تھے۔ وہ کتنی اکیلی تھی، دکھ کی اس گھڑی میں اپنوں کی کمی شدت سے محسوس کر رہی تھی۔ اس دشتِ بیاباں میں وہ تنہا تھی، کوئی خوشگوار لمحہ بھی اس کے قریب نہیں بھٹک رہا تھا، جسے وہ آواز دے کر رو لیتی۔

ابا جی اور بے بے جی کیا میری اس خطا کو معاف کر دیں گے یا۔

مولوی ابراہیم بخش کی بیٹی کی طلاق ہوگئی۔ اُس نے دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا لیا، سسکیاں روکنے کی کوشش میں اس کی ہچکیاں بندھ رہی تھیں۔

دوسرا دن بھی شروع ہو گیا، وہ کمرے سے باہر نہ نکلی۔ شدید نقاہت نے اس کے نازک اندام مومی سراپے کو دبوچ لیا۔ اس نے بیشتر وقت جائے نماز پر گزارا تھا۔ سورج غروب ہو رہا تھا۔ سرمئی شام درختوں کے پیچھے چلی گئی تھی۔ ملگجے اندھیرے ساکن ایستادہ کھڑے درختوں کے کندھوں پر جھکنے لگے تھے، کمرے میں گہری ہوتی تاریکی اس کے سراپے پر رینگنے لگی۔ اچانک موذن نے مغرب کی اذان دی۔ اللہ اکبر۔ اللہ اکبر۔ اللہ بہت بڑا ہے، اللہ بہت بڑا ہے، کی صدا ابھری۔ وہ بیڈ پر ٹیک لگائے گھٹنوں پر سر رکھے ہوئے تھی، اس نے گھٹنے سے پہاڑ جیسا وزنی سر اٹھایا، اُس نے بند آنکھیں کھولنا چاہیں جو رونے سے اس قدر سوج چکی تھیں کہ بمشکل تھوڑی سی کھل پائی تھیں۔ بیڈ سے اُٹھ کر اُمِ فروا نے پاؤں میں سلیپر ڈالے۔ مارے نقاہت سے اُس سے کھڑا نہیں ہوا جا رہا تھا۔ جسم ٹوٹ رہا تھا، اُس کا سر چکرانے لگا۔ کل سے اس نے کچھ نہیں کھایا تھا، وہ وضو کرنے واش روم کی جانب بڑھی۔ اس نے وضو کیا اور مغرب کی نماز ادا کرنے لگی۔ نماز سے فارغ ہی ہوئی تھی کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ وہ آہستگی سے چلتی دروازے تک آئی۔ دروازہ کھولا تو ہال میں جلتی تیز روشنی سے اُس کی آنکھیں چندھیا گئیں۔ بمشکل اُس نے بھاری پلکیں اوپر اٹھائیں، سامنے ملک مصطفیٰ علی جلوہ افروز تھے۔ سلام کرتے ہوئے اُمِ فروا نے ان سے نگاہیں چرائیں۔ وہ ایٹی کیٹس نبھاتے ہوئے یہ بھی نہیں پوچھ سکے۔ کیسی طبیعت ہے۔ اُمِ فروا کمرے میں بہت اندھیرا ہے ہال میں آجائیں۔ اب وہ کیا کہتی کہ اندھیرا تو تم لوگوں نے میری قسمت میں لکھ دیا ہے، اس ظاہری اندھیرے سے کیا فرق پڑتا ہے۔ وہ خاموشی سے اُن کے پیچھے ہال میں آگئی۔ بلال حمید اس وقت اپنے کمرے میں تھا۔ جب وہ صبح آفس گیا تھا تو باہر سے لاک لگا گیا تھا۔ جس کی ایک چابی اُمِ فروا کے پاس بھی ہوتی تھی۔ آج بلال حمید ملک

مصطفیٰ علی کے ساتھ جلدی فیکٹری سے آگیا تھا۔ واپسی پر بلال حمید کھانا باہر سے لے آیا تھا۔
"آپ کچھ کھالیں۔ آپ نے کل سے کچھ نہیں کھایا۔ بھوک تو مجھے بھی بہت شدید لگ رہی ہے۔ آپ ایسا کریں کھانا اِدھر ہی لے آئیں، میں بھی کچھ کھالوں گا۔" وہ اس کی سوجی آنکھیں دیکھتے ہوئے بولے۔ ملک مصطفیٰ علی چاہ رہے تھے اس طرح اُمِ فروا بھی کچھ کھالے گی۔
وہ خاموشی سے اٹھ کر کچن کی طرف چلی گئی۔ وہ اداسی سے اُسے جاتے ہوئے دیکھ رہے تھے۔ ملک مصطفیٰ علی اُس کی ایسی حالت دیکھ کر ڈسٹرب ہوگئے تھے۔
کل جب اُمِ فروا اور بلال حمید کے درمیان طلاق ہوئی تھی، ملک مصطفیٰ علی پاس ہی تھے۔ اُن دونوں کی حالت دیکھ کر اُنہیں بہت دکھ ہوا تھا۔ کیا وہ اُمِ فروا کی آزادی پر خوش تھے، اب تو اُنہیں اپنی محبت کی تکمیل کی امید ہو چکی تھی۔
"کیا میں بہت خوش ہوں۔" وہ خود سے سوال کرتے۔ اُمِ فروا اُن کا پہلا پیار تھی۔ وہ جانے کون سا لمحہ تھا جب وہ اُن کے دل کی مالک بن گئی تھی۔ اب وہ اُمِ فروا کو پاسکتے تھے۔ وہ اچھی طرح جانتے تھے، ماں جی اُسے دیکھتے ہی اُمِ فروا پر فدا ہو جائیں گی۔ وہ سوچ رہے تھے گھر والوں کے سامنے اس کی شادی اور طلاق کی بات گول کر جائیں گے۔ مولوی ابراہیم بخش کو بھی ابھی اُنہیں اعتماد میں لینا تھا۔ یقیناً وہ اُمِ فروا سے بھی خفا ہوں گے کہ اس نے اپنے حالات کے بارے میں اُنہیں بتایا کیوں نہیں۔ 'اُمِ فروا نے مجھ پر بھروسہ کیا ہے، میں انشاءاللہ اس کا بھروسہ کبھی ٹوٹنے نہ دوں گا۔ اس کو بہت اُونچا مقام و مرتبہ دوں گا تا کہ وہ گزر جانے والے تمام حادثات بھول جائے۔'
اُمِ فروا کھانا گرم کر کے لے آئی تھی اُس نے ٹرالی ملک مصطفیٰ علی کے سامنے کردی۔
"آپ بھی لیجیے۔"
"آپ لیں۔" ملک مصطفیٰ علی نے پلیٹ میں کھانا نکالا۔ تب اُمِ فروا نے ایک پلیٹ میں تھوڑے سے چائنیز رائس ڈالے، سائیڈ پر تھوڑا سا شاشلک رکھا۔
"آپ اُن کو بھی کھانے کے لیے بلالیں، میں اندر جا کر کھانا کھالیتی ہوں۔"
"بلال کو؟"
"جی۔"
"ٹھیک ہے میں اُسے بلالیتا ہوں۔" اُمِ فروا اپنے بیڈروم میں چلی گئی۔

.........☆☆.........

دُری کی باتوں پر ماہین پر خاصا اثر ہوا تھا۔ اس کے حالات اپنی باقی دوستوں کی نسبت بہت ہی اچھے تھے۔ ملک عمار علی ہمیشہ سے ماہین کا خیال رکھتے تھے۔ وہ اس کی بدتمیزیاں برداشت کر جاتے تھے۔ وہ اُن کی پھوپی کی بیٹی تھی۔ وہ فوزیہ پھوپی جن سے ملک عمار علی بہت محبت کرتے تھے۔ وہ چند ماہ کے تھے، جب فوزیہ پھوپی کی گود میں آگئے تھے۔ وہ عمار علی سے بہت پیار کرتی تھیں۔ مہر انساء عمار علی سے بے فکر ہوکر مراد محل کے اونچے چوباروں، بڑے گنبدوں والی حویلی اور اُن میں ہونے والے معاملات میں لگ گئی تھیں۔ بڑی بہو کی حیثیت سے یہ ذمے داری اُن کے سسر ملک مراد علی نے بڑی بہو کو سونپ دی تھی جو اکلوتی ہی تھیں۔ تب عمار علی فوزیہ پھوپی کے پاس رہنے لگے تھے۔ عمار علی کی تمام ذمے داری بخوشی اُنہوں نے لے لی تھی۔
میٹرک کے بعد فوزیہ نے چار سال لاہور میں اپنی لال حویلی میں گزارے تھے۔

عمار علی فوزیہ کی جان تھے۔ فوزیہ کی منگنی پانچ سال رہی کیونکہ اُن کے منگیتر اعلیٰ تعلیم کے لیے مانچسٹر چلے گئے تھے۔ وہاں اُنہوں نے کئی ڈگریاں حاصل کی تھیں۔ اُنہیں پڑھنے کا جنون تھا۔ یہاں فوزیہ اُن کا انتظار کرتی رہیں جب وہ ڈگریوں کا پلندہ لے کر واپس لوٹے تب فوزیہ سے اُن کی شادی ہوگئی۔ آتے ساتھ ایک مصروف ملٹی نیشنل فرم میں اُنہیں بہت بڑی جاب مل گئی تھی۔ وہ فوزیہ کے ساتھ اسلام آباد شفٹ ہوگئے، اُس وقت عمار علی دس سال کے تھے۔ شادی کے چار سال بعد فوزیہ کے ہاں ماہین ہوئی تھی۔ فوزیہ کے چلے جانے کے بعد عمار علی بہت اُداس رہنے لگے تھے۔ عمار علی کو لاہور پڑھنے کے لیے بھیج دیا گیا تھا۔ شروع کی کلاسیں تو ملک عمار علی نے جوہر آباد کے اسکول سے پڑھی تھیں۔ جو بہت بڑا صنعتی شہر ہے اور جہاں آباد کے کافی قریب تھا۔ اس دوران مہر النساء کی گود میں مصطفیٰ علی اور امل آچکی تھی۔ عمار علی سات سال کی عمر میں نماز پڑھنے لگے تھے۔ قرآن پاک بھی اُنہوں نے پڑھ لیا تھا۔ تمام بڑی حدیثیں بھی اُنہیں زبانی یاد تھیں۔ ملک عمار علی کا اب لال حویلی میں دل لگ چکا تھا۔

ملک عمار علی اب زیادہ وقت اپنے بیٹے حسان علی کے ساتھ گزارتے تھے۔ وہ اکثر اپنے سینے پر لٹا کر حسان علی سے کہتے۔ ''یار تمہارے آجانے سے ایک فائدہ تو ہوا ہے، تمہاری وجہ سے تمہاری ماں کے قریب رہنے کا موقع بھی مل جاتا ہے۔'' ملک عمار علی۔ حسان علی کے ننھے ننھے ہاتھ اپنی انگلیوں کی پوروں میں لیے اُس کے بازو جھلاتے تو سامنے بیٹھی ماہین مسکرا پڑتی۔ حسان علی کے آجانے سے ماہین کا دل بھی بہل گیا تھا۔ اُس کی ننھی ننھی قلقاریاں اُسے گوناگوں خوشی سے ہمکنار کر جاتیں۔

اکثر وہ خجل ہو کر سوچتی۔ اس بچے کو تو میں اس دنیا میں لانا ہی نہیں چاہتی تھی لیکن اللہ پاک نے اسے ہر صورت بھیجنا تھا تو بھیج دیا۔ ملک عمار علی حسان علی کی آمد سے اب کھل کر جی رہے تھے۔ ہر لمحہ اُن کے اندر باہر جل ترنگ بجتی رہتی۔ وہ سوچتے میرا اور ماہی کا رشتہ اب اور مضبوط ہو چکا ہے، ورنہ ہر وقت اُنہیں دھڑکا لگا رہتا ماہین اُن کی بے تحاشا محبتوں سے اُوب کر اُنہیں چھوڑ نہ جائے۔

اب اُن کا یہ خوف ختم ہو چکا تھا۔ ماہین کے رویے میں خاصا بدلاؤ، اُنہوں نے محسوس کیا تھا۔ وہ پہلے کی طرح اُن سے بیزار دکھائی نہیں دیتی تھی، وہ مہینے میں ایک چکر لال حویلی کا ضرور لگاتی۔ تمام دوستوں سے اُس کی ملاقات ہوتی، ماسٹرز مکمل کرنے کے بعد وہ زیادہ تر جہان آباد میں رہنے لگی تھی۔

کاشان احمد کے گھر بھی وہ ایک دو بار گئی تھی۔ اب وہ لاہور ہی میں رہ رہے تھے۔ تب وہ دونوں مل بیٹھ کر پرانی باتیں یاد کرتے رہے۔ کاشان ہمیشہ اچھے دوستوں کی طرح اُسے سمجھاتا۔

''ماہی اللہ پاک ہمارے لیے جو فیصلے کرتا ہے وہی ہمارے لیے بہتر ہوتے ہیں۔ ہم انسان اپنی طرف سے اندازے لگاتے خدا کے کاموں میں مداخلت کرتے ہیں یہ نہیں سمجھتے ہم گھاٹے کا سودا اپنے لیے کر رہے ہیں۔ دیکھو تو خدا نے تمہیں کتنا پیارا بیٹا عطا کر دیا ہے۔ بالکل شہزادہ ہے تمہارا بیٹا۔'' کاشان احمد کو حسان پر ٹوٹ کر پیار آرہا تھا۔ اُس نے اسے اپنے سینے سے چمٹا رکھا تھا وہ بھی سکون سے کاشان کے گلے میں بانہیں ڈالے ہوئے تھا۔

ماہین دیکھتی رہی۔ حسان علی کی آنکھیں آہستہ آہستہ بند ہو رہی تھیں۔ اک آسودہ مسکان حسان کے گلابی ہونٹوں کا احاطہ کیے ہوئے تھی۔ کاشان احمد بھی اس وقت گہری طمانیت محسوس کر رہا تھا۔ اُس کی آنکھوں میں ایک لامتناہی خوشی رینگ رہی تھی۔ اچانک سے ماہین کی آنکھوں میں گہری مسکان اتر چکی تھی۔ حسان اب بھی کاشان کی چھاتی سے چمٹا ہوا تھا۔ وہ ننھا فرشتہ بھی محسوس کر رہا تھا یہ آدمی ہمارا خیر خواہ ہے اور دل سے مجھ سے پیار کرتا

ہے۔ تھوڑی دیر بعد کاشان احمد نے حسان علی کو ماہین کی گود میں دے دیا تھا۔
''ماہی تم اکثر مجھے شدتوں سے یاد آتی ہو۔ تب ایک کمزور بے بسی خود پر مسلط کر لینے کے علاوہ میرے پاس اور کوئی چارہ نہیں ہوتا۔ تب میں سوچتا ہوں میں اگر تمہارے قابل ہوتا تو تم مجھے ہر صورت ملتیں۔ ماہی تم عمار علی ہی کی قسمت کا ستارہ تھیں۔'' وہ ایک دم سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

''سنو ماہی۔''

''بولو؟''

''ملک عمار علی شراب پیتے ہیں؟''

''نہیں۔ شان تم نے یہ کیسا سوال کیا ہے۔''

''کیوں نہیں پیتے وہ شراب؟''

''شان تم بھی ناں عجیب ہو۔ شراب کوئی اچھی چیز ہے یہ مسلمانوں پر حرام ہے، بلکہ شراب حرام چیز ہے۔''

''ماہی میں مسلمان ہوں۔ یہ بھی جانتا ہوں یہ حرام ہے۔ پر بھی میں کثرت سے پیتا ہوں۔''

''ریئلی۔''

''یس۔'' اُس نے سر کو زور سے ہلا کر جواب دیا۔

''ماہی تم نے بتایا تھا ناں ملک عمار علی نماز تہجد قرآن باقاعدگی سے پڑھتے ہیں؟''

''ہاں۔''

''لیکن میں نماز تک نہیں پڑھتا۔''

''شان عمار کی تربیت ایک بہت نیک خاتون نے کی ہے۔''

''ماہی میری بھی تربیت ایک نیک خاتون نے کی ہے جو میری ماں ہیں۔ صوم وصلوٰۃ کی پابند۔ یہ بھی درست ہے تربیت کا انسان کی زندگی میں گہرا عمل دخل ہوتا ہے۔''

''ہاں۔''

''سنو ماہی کسی غیر عورت سے اُس نے خاص ریلیشن رکھا؟''

''کسی سے نہیں۔''

''کبھی کسی سے کچھ سنا ہو؟''

''سبھی لوگ ہمیشہ اُن کی تعریف کرتے ہیں۔ آج تک کبھی کسی نے اُن کی بُرائی نہیں کی۔ لوگ تو جھولیاں اٹھا اٹھا کر اُنہیں دعائیں دیتے ہیں۔''

''یقیناً وہ اچھے انسان ہیں ورنہ مرد جب دوسری عورت کو بیوی کا شراکت دار ٹھہراتا ہے۔ بیوی کی چھٹی حس فوراً بھانپ لیتی ہے۔ مرد جب غیر عورت کے ساتھ وقت گزار کر رات کے جس بھی پہر چاہے وہ دبے قدموں سے ہی گھر میں داخل ہو، بیوی کو فوراً پتا چل جاتا ہے کیونکہ اُس وقت ایسے مرد کی آنکھوں میں اُس عورت کا نشہ شراب کی طرح چڑھا ہوتا ہے اک پُرکیف انداز میں اُس کی چال بھی اُس وقت کچھ اور ہوتی ہے۔ تم نے ایسا کبھی عمار علی کو نہیں ناں پایا۔''

''ہوں۔'' جیسے آئس برگ کا پہاڑ اس کے سر پر گر گیا تھا۔ وہ بے قراری سے کاشان احمد کو دیکھ رہی تھی۔ ''ماہی پلیز میری آنکھوں میں دیکھو۔'' ماہین نے یک بارگی کاشان احمد کی طرف دیکھا۔ دوسرے لمحے اُس نے نگاہیں

جھکالیں۔اب وہ اِدھر اُدھر نگاہیں گم کرنا چاہ رہی تھی۔
''ماہی دوبارہ میری آنکھوں میں جھانکو۔''
''پلیز کاشان۔'' ماہین نے ہاتھ کے اشارے سے اُسے منع کردیا۔
''میں غیر عورتوں کے پاس کثرت سے جاتا ہوں۔'' وہ حیرانی سے کاشان احمد کو گھور رہی تھی۔ ''ماہی ملک عمار علی نہایت ایمانداری کے ساتھ تم سے محبت کرتے ہیں۔ اتنی محبت کہ تم اُس سے اُوب جاتی ہو۔ یہی بات ہے ناں۔''
''ہوں۔'' وہ گنگ کیفیت میں تھی۔ وہ سوچ رہی تھی کاشان کو آج ہو کیا گیا ہے۔ ماہین کے دل پر عجیب سا بوجھ آن پڑا تھا۔
''ماہی عمار علی اس قدر اچھے ہیں پھر بھی تم اُن سے محبت نہیں کرتیں اور 'میں' جس میں کوئی اچھائی نہیں ہے۔ میرے جیسے لوفر کی خاطر اُس شخص سے تمہارے کئی رشتے جڑے ہوئے ہیں۔ الگ ہونے کے لیے تیار تھیں۔''
ماہین کی ریڑھ کی ہڈی میں دور تک چنگھاڑتی سنسناہٹ دوڑی۔
''کیا میرے ساتھ تم خوش رہ سکتیں؟ میں جانتا ہوں تم کبھی خوش نہ رہتیں میرے ساتھ۔ اُس بھیگی ہوئی چاندنی رات میں جب کاشان احمد تمہاری پرستشوں میں رویا تھا میں ایسے تڑپ کر رویا تھا کہ میری مانگ کا آخری بال بھی میرے ہی آنسوؤں میں ڈوب گیا تھا۔ وہ کاشان تم سے بہت محبت کرتا تھا۔ اب جو کاشان تمہارے سامنے بیٹھا ہے اب یہ وہ نہیں ہے۔ ماہی مجھے یہ سوچ کر صبر آ گیا تھا کہ میں نے تمہیں ٹوٹ کر چاہا۔ وہ میرا جنون تھا پھر تم عمار علی کی ہو گئیں۔ میرے جنون کے سامنے میرے رب کی مرضی آ گئی اور میرے رب کی مرضی ہمارے لیے بہترین انعام ہوتی ہے۔ میری چاہت تمہارے لیے جو تھی، وہ میرا ذاتی عمل تھا۔ میں اپنی مرضی سے جو چاہوں وہ سوچ سکتا ہوں کیونکہ مجھے اپنے آپ پر پورا اختیار ہے اور میں اپنی مرضی کا مالک ہوں۔ لیکن جو خدا کا حکم ہے وہ اٹل ہے۔ خدا نے تمہیں یہ خوبصورت بیٹا عطا کردیا۔'' کاشان احمد نے سوئے ہوئے حسان علی کی طرف دیکھا۔ یہ بھی خدا ہی کا حکم تھا۔ مجھے دری بتا رہی تھی تم نے تو بہت چاہا یہ دنیا میں نہ آئے۔ اس میں اللہ کی مرضی تھی تو دیکھ لو یہ آ گیا ناں دنیا میں۔ تم ناحق اپنے مقدروں سے شکوہ کرنے چلی ہو۔ ماہی اپنی ماں کی بتائی گئی اچھی باتوں میں سے صرف ایک اچھی بات میں نے اپنائی اور وہ ہے خدا کی ذات پر توکل۔'' کاشان سوئے ہوئے حسان کے سلکی بالوں میں انگلیاں سرسرا کر بولا۔ بے خبر سوئے چھاموکے چہرے پر ملکوتی مسکان کھلی جارہی تھی۔ وہ نیند میں ہنس رہا تھا۔
''ماہی دیکھو تو سہی تمہارا بیٹا فرشتہ ہے۔ کئی لوگ ترستے ہیں اولاد کے لیے اور تمہیں اُس رب نے بن مانگے دے دیا۔ سوچو ذرا وہ کتنا رحیم ہے، کریم ہے، رحمان ہے۔ ماہی میں تمہارے سامنے اب بھی اعتراف کرتا ہوں کہ تم میرا پہلا پیار ہو اور آخری بھی۔ محبتیں تو مجھے بار بار ہوئیں اور شاید آئندہ بھی ہوتی رہیں گی لیکن سچا پیار انسان کو زندگی میں صرف ایک بار ہوتا ہے۔'' وہ سانس روکے کاشان احمد کی باتیں سن رہی تھی، بے نام درد کے اژدھے اس کے جسم کے روم روم سے لپٹنے لگے تھے۔
حسان علی اب چار ماہ کا ہو چکا تھا۔ چھوٹے بڑے تمام عزیز و اقارب کی آنکھ کا تارا تھا۔ چھاموکے آجانے سے ماہین کی حیثیت میں مزید اضافہ ہو گیا تھا۔ سب اُسے ہاتھوں کا چھالا بنائے ہوئے تھے۔ ایسی محبتیں اُسے ہمیشہ سسرال میں ملی تھیں۔ لیکن پہلے اُس نے ان بے لوث محبتوں کے بارے میں کبھی سوچا ہی نہیں تھا۔ اب اُسے احساس ہو رہا تھا خوابوں کے سہارے زندگی نہیں گزاری جاتی۔ زندگی۔ زندگی تو زندگی کی حقیقتوں کے ساتھ

گزاری جاتی ہے اسی میں پائیداری اور دائمی خوشی پوشیدہ ہوتی ہے۔
اب وہ عمار علی کا بہت زیادہ خیال رکھنے لگی تھی۔ یہ احساس تو اسے دری اور کاشان احمد نے دلایا تھا۔ وہ سونے کا چمچ منہ میں لے کر پیدا ہونے والے لوگوں میں شمار ہوتی تھی، خداوند نے اسے ہمیشہ نوازا تھا۔ ہر جگہ ماہین نے پیار وصولا تھا۔ اُسے دوست بھی بہترین ملے تھے، جو صحیح معنوں میں اس کا خیال رکھنے والے تھے۔ وہ نمازیں تو پابندی سے پڑھتی تھی، اب قرآن پاک بھی تفسیر سے پڑھنے لگی تھی۔ کاشان کی کہی بات بار باراس کی سماعتوں سے ٹکرائی۔ ''ماہی اپنی ماں کی بتائی گئی اچھی باتوں میں سے صرف ایک اچھی بات میں نے اپنائی اور وہ ہے خدا کی ذات پر توکل۔''

☆☆

ملک قاسم علی کی ناگہانی موت کا خلا ابھی تک پُر نہیں ہو رہا تھا۔ مہر النساء ہر موقع ہر بات میں اُنہیں یاد کرتیں تھیں ملک قاسم علی کے ساتھ بتایا ایک ایک لمحہ فلم کی طرح اُن کی آنکھوں کے سامنے سے گزرتا۔ تب وہ آنکھیں نم ہونے سے نہ روک سکتیں۔ وہ اپنے پوتے کو دیکھتے تو کتنا خوش ہوتے۔ اگر اُن کی قسمت میں پوتا دیکھنا ہوتا تو ضرور دیکھتے۔
جس طرح جہان آباد کے لوگ ملک قاسم علی سے خوش تھے اور اُن کی وفات کے بعد فکر میں پڑ گئے تھے کہ جانے اب کیا ہوگا۔ حالانکہ ملک عمار علی بھی گاؤں کے تمام لوگوں سے حکیم لہجے میں بات کرتے تھے سب ٹھیک تھا لیکن بڑے ملک صاحب کی تو بات ہی اور تھی۔ ملک عمار علی اب باپ کی جگہ بھی سنبھال رہے تھے۔ یہاں کی رعایا کو اُنہوں نے بھرپور اعتماد بخشا تھا۔
''بڑے ملک صاحب چلے گئے ہیں لیکن وہ تم لوگوں کی ذمے داری کا فریضہ مجھے سونپ گئے ہیں۔''
واقعی ملک عمار علی نے اپنے والد کا کہا سچ کر دکھایا تھا۔ ریاست کے تمام معلومات پہلے بھی وہی سنبھال رہے تھے۔ اب مکمل طور پر تمام فرائض اُنہیں انجام دینے تھے۔ تمام کام ایمانداری اور وقت پر ہو رہے تھے۔ سبھی کے دلوں میں چھوٹے ملک کی عزت تھی، اُن کا ایک رعب اور دبدبہ بھی تھا۔ ملک عمار علی کم بولتے تھے ہر وقت چیخ چنگھاڑ و ہمزارعوں پر نہیں کرتے تھے۔ رعایا۔ پل پل ان کی درازعمر اور خوشیوں کی دعائیں دیتے۔
حسان علی کی پیدائش پر فوزیہ نہیں آسکی تھیں، آیان اور ارسل کی چھٹیاں نہیں تھیں۔ وہ سب بھی ماہین کے لیے بہت اداس تھے۔ اس روز انٹرنیٹ پر ممی اس سے کہہ رہی تھیں۔
''ماہی چند دنوں کے لیے تم ہی یہاں آجاؤ تمہیں دیکھے ہوئے عرصہ ہو گیا ہے اور پھر حسان کو دیکھنے کے لیے بہت دل چاہتا ہے۔ اس کی تصاویر سے تو گزارا نہیں ہو سکتا ناں۔ اُسے قریب سے دیکھنے کو جی چاہتا ہے۔ گود میں لینے کے لیے دل کرتا ہے۔ وہ کیسے تمہاری گود میں ہمکتا ہوگا، تب تمہارے چہرے کے رنگ کیسے ہوتے ہوں گے۔ یہ سب میں فیل تو کر سکتی ہوں پر اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہتی ہوں۔ اگر عمار علی نہیں آسکتا تو تم دونوں آجاؤ۔''
''ممی میں عمار سے بات کروں گی۔ وہ مجھے منع تو نہیں کریں گے لیکن اُن کے بغیر آنا مجھے اچھا نہیں لگتا۔''
''بیٹا یہ بھی اچھی بات ہے کہ تمہیں اپنے ماں کا اتنا خیال ہے۔ تم اب خوش ہو ناں عمار کے ساتھ۔ میں کہتی تھی ناں تمہیں ایڈجسٹ ہونے میں کچھ ٹائم چاہیے۔ اللہ کا بہت شکر ہے کہ تم خوش ہو۔ تمہارا بیٹا بہت قسمت والا ہے۔ خدا اُس کی عمر دراز کرے۔'' تب ماہین کے دل کی گہرائیوں سے نکلا تھا آمین۔
ملک عمار علی تھکے تھکے قدموں سے اپنی خواب گاہ میں داخل ہوئے۔ ماہین نے ابھی بھی چھاموکو دودھ پلا کر

اُس کے منہ سے نہایت آہستگی سے فیڈر نکال کر سائیڈ ٹیبل پر رکھا اور اُسے احتیاط سے اٹھا کر کاٹ میں لٹا دیا، اُس کا کمبل درست کرتے ہوئے ماہین نے عمار علی کی طرف دیکھا۔ وہ صوفے پر نڈھال سے بیٹھ گئے تھے۔

''کیا بات ہے۔ طبیعت تو ٹھیک ہے؟'' اُن کی بوجھل آنکھیں نیند کے خمار سے بھر رہی تھیں، چہرے پر تھکان کے آثار بھی نمایاں تھے۔

''آج بہت تھک گیا ہوں۔ کل سے پٹواری آیا ہوا ہے زمینوں کے حساب کتاب، آپا نے تمام فائلیں چیک کرنی پڑیں۔ اُسے زمینوں کے کھاتے سمجھانے پڑے۔ ابھی تو وہ دو دن اور رکے گا یہاں پر۔ ان لوگوں کو اپنے پیٹ کے دوزخ بھی تو بھرنے ہوتے ہیں ناں۔ کہہ رہا ہے تحصیلدار بھی عنقریب چکر لگانے والا ہے۔ وہ الگ سے کئی فردِ جرم کے کھاتے کھول بیٹھے گا۔ اشاروں کنایوں میں بھاری بخشش کی بات کر رہا تھا۔ شمال کی طرف کے گاؤں کے چوہدری بھاری قسم کی رشوت اُسے دیتے رہتے ہیں، اب وہ مجھ سے بھی امید لگائے بیٹھا ہے۔ پہلے والا پٹواری بہت ایماندار تھا۔ یہ شہر سے نیا آیا ہے۔ رمضان پٹواری کا تبادلہ بھی شو کے چوہدری نے کروایا تھا۔ کیونکہ وہ اُن کی غلط فرمائش پوری نہیں کرتا تھا۔ لوگوں کی مرلہ دو مرلہ زمین اِدھر اُدھر پیپروں میں نہیں کرتا تھا۔ یہ نیا پٹواری خاصا تیز لگ رہا ہے۔ اسے نکیل تو ہر صورت ڈالنی ہوگی۔''

''آپ اُسے کچھ پیسے دے کر معاملہ ختم کریں۔''

''ہرگز نہیں۔ میں بھی دیکھتا ہوں اس کی پہنچ کہاں تک ہے۔''

''سنیں۔'' ماہین اُن کے قریب آکر بیٹھ گئی۔ ''آج ممی سے بات ہوئی تھی۔ وہ چھاموکو دیکھنا چاہتی ہیں۔ میرے لیے بھی اداس ہیں۔ وہ آنہیں سکتیں کیونکہ آیان اور ارسل کی پڑھائی کا مسئلہ ہے۔ اگر آپ بھی چند روز کے لیے چلے چلیں تو ممی پاپا کو بھی اچھا لگے گا۔ صرف دو ہفتے کے لیے چلتے ہیں۔ عمار میں وہاں زیادہ رہنے کی ہرگز ضد نہیں کروں گی۔'' ملک عمار علی نے مسکرا کر ماہین کی طرف دیکھا اور اُس کے گال کو چھوتی لٹ اپنی انگشت شہادت پر لپیٹتے ہوئے اُسے آہستگی سے جھٹکا دیا تو ماہین کا سر اُن کے کشادہ سینے پر آٹکا۔

''عمار۔'' ہنستے ہوئے اُس نے ہاتھ کی مٹھی بنا کر آہستگی سے اُن کے چوڑے شانے پر ماری۔ وہ مسکرائے اپنی بیوی سے اپنی محبت کے عوض اس کے انہی ناز برداریوں کے تو وہ متمنی تھے کہ وہ اُن پر اپنی محبت کا حق جتائے، ان سے دلار کرے۔ اُن کے سینے پر سر رکھ کر دھیرے سے آنکھیں موندلے اور وہ اُس کے خوشبو بھرے ریشمی بالوں میں اپنی مضبوط لانبی انگلیاں سرسراتے چلے جائیں، وہ اسی طرح اُن کے سینے میں چہرہ چھپائے چاندنی بھرے لمحوں میں مقید ہو جائے تب وہ خود کو ان کی آنکھوں سے دیکھے اور ساعتیں اس کی چوری پر کھل کھلا اٹھیں۔ جانے کیوں وہ اب بھی اس کی جانب سے ڈستے لمحوں کی بے اعتباریوں سے خوف زدہ تھے۔

''اگر کبھی راہوں میں تم کھو گئیں تو؟؟'' ''نہیں تم میری محبت کے طلسماتی سفر میں ہر ہر پہر میرے ساتھ رہو گی۔ ماہی تم کو کھونے کا اب مجھ میں یارا نہیں ہے، بہت مشکلوں سے میں نے تمہیں پایا ہے، تمہاری محبت کی سرشاری مجھے گھمنڈی ہی تو بنائے دیتی ہے۔''

''کیا سوچ رہے ہیں مسٹر عمار علی۔'' ماہین نے اُن کی آنکھوں میں جھانکا جہاں اُسے اپنا ہی عکس دکھائی دیا۔

''تمہیں محسوس کر رہا ہوں۔'' اب ملک عمار علی اُس کی آنکھوں میں خود کو دیکھ رہے تھے۔ اس وقت اُنہیں اس کی آنکھیں ایسے دکھائی دیں جیسے دشت میں نیلے پانیوں والی کوئی جھیل بے حد سبک رفتاری سے بنا آہٹ نشیب

وفراز بھرے کٹھن راستوں سے گزر رہی ہو۔

''کیا ہوا ماہی۔'' ملک عمار علی نے اُسے دونوں کندھوں سے پکڑ کر پوچھا۔

''کہاں۔'' وہ حیرانگی سے اُنہیں دیکھ رہی تھی۔

''ماہی تمہاری آنکھوں میں کوئی خاص متبرک لمحہ آٹھہرا ہے۔''

''عمار آپ بھی ناں کمال کرتے ہیں۔''

''ماہی تمہاری آنکھوں میں میرے لیے کچھ ہے۔'' خوشی سے اُن کی آواز اُن کا ساتھ نہ دے پا رہی تھی۔

''اب ایسا ہے تو شکرادا کریں خدا کا۔'' ماہین نے اُن کی بات مذاق میں ٹالنا چاہی۔

''ماہی میں نے خدا سے ہمیشہ تمہارا دائمی ساتھ مانگا۔ بہت دعائیں کیں تم بھی مجھے میری ہی طرح سوچو۔ میرے کل کو تم نے اپنی روشنی سونپ کر میرا آج تابناک روشن و رنگین بنا دیا ہے۔ درد کی تمام صعوبتیں میں نے صرف اس لیے سہنا چاہی اور کوشش کی میری بابت تمہاری آنکھ میں کبھی بھی نمی نہ اترنے پائے۔ ماہی جان تمہارے بنا بھلا میرا جیون کیا ہے، بالکل ایسے جیسے گداگر کے ہاتھوں میں خالی کشکول۔'' وہ اُس کے روئی کے گالوں جیسے موی ہاتھ اپنے مضبوط ہاتھوں کے اندر چھپائے پل پل بعد آہستگی سے دباتے تو ماہین کی نیلی آنکھوں میں راج ہنس اترنے لگتے۔

''میرا دل چاہ رہا ہے آج تمہیں ایک بہت ہی میٹھی سی غزل سناؤ۔''

''آج آپ پکے عاشق مزاج شوہر لگ رہے ہیں۔''

''جانِ من وہ تو میں روزِ اول سے ہوں۔ اس چھوٹی سی گڑیا جیسی بیوی کا شوہر۔'' اُنہوں نے اس کی ٹھوڑی اپنی طرف کرتے ہوئے کہا۔ اس سے باتیں کر کے ملک عمار علی کی تمام تھکان اتر چکی تھی۔

''سنیں ملک عمار علی۔'' ماہین نے اُن کا ہاتھ آہستگی سے جھنجھوڑا۔ ''اب میں چھوٹی سی نہیں ہوں بلکہ چار ماہ کے ایک شیر بچے کی ماں ہوں۔''

''یہ بھی بولو ناں ملک عمار علی جیسے شیر کے بیٹے کی ماں۔''

''ہاں بھئی کوجے سے ملک عمار علی کے کوجے بیٹے کی ماں۔''

''ماہی کوجے نہیں۔ خوبصورت بیٹے کی ماں۔''

''ارے میں غلط بول گئی میں وہی تو کہہ رہی تھی کوجے باپ کے سوہنے بیٹے کی ماں۔'' وہ خود نہیں جانتی تھی آج وہ عمار علی سے ایسی باتیں کر کے کیوں اچھا فیل کر رہی ہے۔ ''وہ آپ کی غزل کہاں گئی۔ سنائیے میرا ابھی کچھ سننے کو موڈ بن رہا ہے۔''

''ایک شرط پر سناؤں گا۔''

''بولیں۔'' تب اُنہوں نے اُس کے کان میں کچھ کہا تو اُس کی بوجھل ہوتی پلکوں کے سائے میں بھرے بھرے عارض گلال ہو گئے۔

''بولو سناؤں غزل۔'' اُنہوں نے شرارت سے اس کے سامنے آئی لٹ پر زور سے پھونک ماری تو وہ سرسرا کر پھر گال پر آٹھہری۔

''ہاں سنو۔''

''ارشاد۔''

بند آنکھوں سے بھی اکثر دیکھتے رہنا اُسے
چاندنی میں بیٹھ کر بس سوچتے رہنا اُسے
رات کے پچھلے پہر کے خواب میں کھونا اُسے
اور دن میں ہر طرف سے ڈھونڈتے رہنا اُسے
یاد کرنا اُس کو اپنی زیست کے ہر موڑ پر
آنکھ میں بھرنا جمالِ یار کا پیکرِ دوام
اور پھر پلکوں پہ شب بھر تولتے رہنا اُسے
وہ ابھی بدلا نہیں یہ جاننے کے واسطے
اپنے بارے میں بھی اکثر پوچھتے رہنا اُسے

وہ خاموش ہو چکے تھے لیکن ماہین اب بھی ان کے شانے پر سر رکھے آنکھیں بند کیے ہوئے تھی۔

''ماہین یہ غزل تمہارے نام۔''

''کسی اور کی غزل آپ میرے نام کر رہے ہیں۔''

''بھئی شاعر نے بھی تو اپنی محبوبہ کے نام کی ہوگی ناں۔''

''عمار علی میں آپ کی محبوبہ نہیں بیوی ہوں۔''

''ماہی مانا کہ میں تمہارا شوہر ہوں لیکن تم ابھی تک میری محبوبہ ہی ہو۔''

''عمار محبوبہ اور بیوی میں بہت فرق ہوتا ہے۔''

''میں جانتا ہوں، تم نہیں چاہتیں کہ میں تمہیں ہمیشہ محبوبہ ہی بنا کر رکھوں۔''

''مسٹر عمار کہیں میں مغرور نہ ہو جاؤں۔'' ماہین نے اُن کے ترتیب سے جمے ہوئے بال ہاتھ سے بکھیر دیے۔

''میں تو چاہتا ہوں تم غرور کرو میری محبت پر۔''

''ایسے ہی رانجھا اور مجنوں بدنام تھے۔'' ماہین مسکرائی۔

''وہ ہیر کا رانجھا تھا میں ماہی کا رانجھا ہوں۔''

''واہ کیا خوب آپ نے تال میل ملائے ہیں'' توقف بعد وہ پھر بولی۔ ''سچے عاشقوں والے خصائل ہیں آپ میں۔''

''ماہی یہ سب خدا کی طرف سے ہوتا ہے بندے کا ذاتی طور پر اس میں عمل دخل نہیں ہوتا۔''

''اب اصل بات کی طرف آجائیں جناب عاشق صاحب۔ میں آپ سے امریکہ جانے کی بات کر رہی تھی۔''

''ماہی تم خود جانتی ہو ان دنوں میں کس قدر مصروف ہوں۔ فصل کی بوائی شروع ہے۔ ان دنوں سو اور کام بھی نکل آتے ہیں۔ جنوب والے دو باغوں کا پیسا ابھی ٹھیکیدار نے نہیں دیا پورا۔ ابھی بھی اُس کے پاس پچاس لاکھ ہے۔ جب وہ پیسے ملیں گے تو کھاد بیج آئے گا اور بھی کئی بکھیڑے ہیں۔ تم اور چھامو چلے جاؤ۔ پندرہ بیس دن رہ آؤ۔ نانا نانی اس سے ملنا بھی چاہتے ہوں گے۔''

''پہلی بار چھامو کے بعد ممی پاپا سے ملنے جا رہی ہوں۔ میں آپ ہی کے ساتھ جانا چاہتی ہوں۔''

''پھر تین چار مہینے ٹھہر جاؤ۔ میں تمہارے ساتھ چلوں گا۔''

''تین چار مہینے تو بہت ہیں۔ ممی ویسے ابھی نہیں آسکتیں۔'' ماہین نے ہونٹ لٹکا کر اُنہیں دیکھا۔

''مجبوری ہے یار، میں ابھی نہیں جاسکتا۔ ورنہ میں تمہارے ساتھ ضرور چلتا۔''

''ٹھیک ہے پھر میں ممی سے کہتی ہوں وہ میرا اور چھاموکا ویزا بھیج دیں۔'' ماہین نے ڈھیلا سا منہ بنایا۔

''ارے وہاں تم خوب انجوائے کرنا۔ سیریں کرنا اور ہاں مجھے نہ بھولنا۔''

''عمار آپ تو اِدھر رہتے ہیں، آپ کو کبھی نہیں بھول سکتی۔''

''کہاں؟'' ملک عمار علی کی آنکھوں میں خیرہ چمک عود آئی تھی۔

''یہاں۔'' ماہی نے دوبارہ دل کی طرف اشارہ کیا۔

''یہ تو بتاؤ کب سے یہ مکین وہاں ٹھہرا ہوا ہے۔'' ملک عمار علی نے اُس کے دل کی طرف اشارہ کر کے کہاں۔

''جناب عمار علی صاحب اب آپ بہت ذاتی باتیں پوچھنے لگے ہیں۔'' وہ اک ادا سے بولی۔

''ماہی مابدولت بھی تو آپ کی ذات کا حصہ ہیں۔ ماہی تم پہل ایسی کیوں نہیں تھیں؟''

''اب ہوگئی ہوں ناں تو خدا کا شکرادا کریں۔'' ماہین نے محبت پاش نگاہوں سے ملک عمار علی کی طرف دیکھا۔

''شکر تو میں اُس مالک کا ہر پل بجالاتا ہوں۔ ماہی کیا اس سلسلے میں تمہاری کسی نے ہیلپ کی؟'' وہ اس کا یوں اچانک بدلنا کیسے ہوا؟ وہ یہ جاننے کے لیے بضد تھے۔ جب سے حسان علی ہوا تھا ماہین یکسر بدل گئی تھی۔

''ہاں۔'' وہ سچائی سے بول گئی۔

''کس نے تمہاری مدد کی؟'' اُن کی آنکھیں پُرشوق تھیں۔

''چھامونے۔ میرے چند دوستوں نے۔''

''مثلاً؟'' وہ ہر صورت جاننا چاہتے تھے کہ کس اچھے انسان نے اُن پر اس قدر مہربانی کردی کہ ماہین بالکل تبدیل ہوگئی اور اُس کی بے اعتنائی محبت میں بدل گئی۔

''آپ جانتے ہیں میرے اُن دوستوں کو۔''

''میرے اُن خیرخواہوں کے نام تو بتاؤ گی تو مجھے پتا چلے گا ناں کہ کس نے مجھ پر اتنا بڑا احسان کر کے مجھے اپنا مقروض کرلیا۔''

''اریبہ، دُرِشہوار اور کاشان احمد نے مجھے بار بار سمجھایا۔ خاص طور پر کاشان احمد نے۔ اُس نے میرے سامنے قسمیں کھائی ہیں کہ آپ بہت ہی اچھے انسان ہیں۔ مجھے آپ کی قدر کرنی چاہیے۔''

''ممنون ہوں میں اُن سب کا یقیناً اُن سب نے تمہیں نیک نیتی سے سمجھایا ہوگا۔ اس لیے تو اُن کے سمجھانے کا تم پر اثر ہوا۔''

''واقعی عمار وہ سب بہت اچھے لوگ ہیں۔ کبھی آپ اُن سے ملیں تو آپ کو اندازہ ہوگا۔''

''کبھی موقع ملا تو اُن سے ضرور ملوں گا اور اُنہیں تھینکس کہوں گا۔''

''وہ سب بھی آپ سے مل کر بہت خوش ہوں گے۔ ہم سب جب بھی آپس میں مل بیٹھتے ہیں تو آپ کا ذکر ضرور ہوتا ہے۔ وہ سب بھی آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔''

''تم اگر پہلے ذکر کرتیں تو اُن سے مل لیتا۔ لاہور تو اکثر جاتا ہی رہتا ہوں۔ لال حویلی ہی میں گیٹ ٹوگیدر کرلیتے۔''

''پہلے میں آپ سے اتنی فری نہیں تھی ناں۔'' ماہین نے آنکھوں میں شرارت بھرے۔ اُن کے بالوں میں

آپ بھی لکھاری بن سکتے ہیں!!

آیئے! سچی کہانیاں کے قلم قبیلے میں شامل ہو جایئے۔

یہ کارواں آپ کو خوش آمدید کہتا ہے......

خود کو منوایئے، اپنے قلم سے......

اگر آپ کا مشاہدہ اچھا ہے۔

اگر آپ کو اپنے آس پاس ہوئے، انہونے اور لرزا دینے والے واقعات یاد رہتے ہیں اور آپ چاہتے ہیں کہ ان واقعات سے دوسرے بھی سبق سیکھیں، تو پھر فوری طور پر ان واقعات وحادثات کو صفحہ قرطاس پر ڈھال کر ہمیں بھیج دیجیے۔
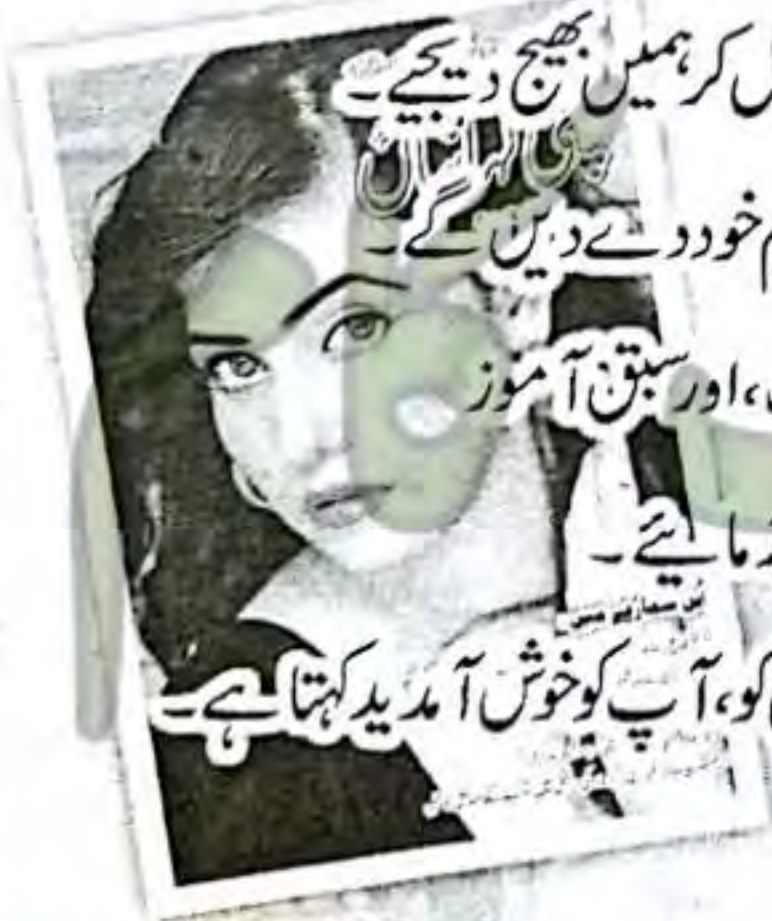
نوک پلک سنوار کر اُسے کہانی کی شکل ہم خود دے دیں گے۔

تو پھر قلم اٹھایئے اور کسی بھی عبرت ناک، اور سبق آموز سچ کو کہانی میں ڈھالنے کی صلاحیت کو آزمایئے۔

ماہنامہ سچی کہانیاں آپ کی تحریروں کو، آپ کو خوش آمدید کہتا ہے۔

تحریر بھیجنے کے لیے ہمارا پتا:

88-C II فرسٹ فلور۔ خیابانِ جامی کمرشل۔ ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی۔ فیز-7، کراچی

ای میل :pearlpublications@hotmail.com

زور سے انگلیاں چلائیں۔ آج ملک عمار علی دل سے مسکرا رہے تھے۔
''اچھا اب مجھے سونے دو۔ بہت نیند آ رہی ہے۔'' وہ چینج کرنے ڈریسنگ روم کی طرف بڑھ گئے۔

............☆☆............

ماہین نے پھوپی ماں کو بتایا تھا وہ اور حسان علی امریکہ جا رہے ہیں۔ پھوپی ماں اداس ہو گئیں۔
''پتر میں تو اداس ہو جاؤں گی تمہارے اور حسان علی کے بغیر۔ پہلے تمہارے ماموں ہوتے تھے تو میرا دل لگا رہتا تھا۔ تمہارے جانے کے بعد تو میں بالکل تنہا پڑ جاؤں گی۔'' وہ آبدیدہ ہو رہی تھیں۔
''مصطفیٰ علی لاہور میں ہے، عمار علی پورا دن باہر رہتا ہے۔ امل اپنے گھر والی ہے۔'' مہرالنساء ایک دم افسردہ ہو گئیں۔
''پھوپی ماں آئیڈیا۔'' ماہین نے مسکرا کر اُن کی طرف دیکھا۔ ''آپ بھی میرے ساتھ چلیں۔ آپ بھی مما پاپا سے مل لیں گی۔ وہ بہت خوش ہو جائیں گے۔ ویسے بھی میں اکیلی جاتے ہوئے کچھ گھبرا رہی ہوں۔ ساتھ چھا موہے اس لیے بہت عجیب لگ رہا ہے اکیلے جانا۔''
''پتر میں کیسے جا سکتی ہوں؟''
''ارے آپ کیوں نہیں جا سکتیں۔ وہاں بھی مجھے آپ فکر لگی رہے گی۔ ہم ساتھ چلتے ہیں، پندرہ بیس دن تک واپس آ جائیں گے۔ بس اب میں اور کچھ نہیں سنوں گی۔ میں ممی کو فون کرتی ہوں کہ آپ کا ویزا بھی بنوا لیں۔ پھوپی ماں خوب مزہ آئے گا۔ ہم سب مل کر خوب گھومیں گے۔ پاپا وہاں مختلف شہروں کی سیر کرائیں گے۔'' وہ بچوں کی طرح خوش ہو رہی تھی۔
''پتر میں نہیں جا سکتی۔ مجھے جہاز میں بیٹھنے سے گھبراہٹ ہوتی ہے۔''
''ہرگز گھبراہٹ نہیں ہوگی آپ کو۔ بس آپ نے میرے ساتھ چلنا ہے۔'' ماہین کے اونچا بولنے سے سویا ہوا حسان علی اٹھ گیا تھا۔ وہ اُسے چینج کرانے اندر لے گئی۔
''یہ لڑکی بھی ناں۔ خدا سلامت رکھے میرے بچوں کو۔ یوں ہی ہمیشہ خوش رہیں۔'' پھوپی ماں خود کلامی سے گویا تھیں اور پھر وہ آیت الکرسی پڑھ کر تصور میں اپنے بچوں پر پڑھ کر پھونک رہی تھیں۔ ماہین حسان علی کو اپنے گلے سے چمٹائے بوسے دیتی اندر لے آئی تھی۔

............☆☆............

اُمِ فروا اب بلال حمید کے سامنے نہیں جاتی تھی۔ وہ گھر پر رہتا ہی کتنا تھا۔ اب اُس نے ہال میں بھی آنا چھوڑ دیا تھا۔ صبح جب اُمِ فروا سو رہی ہوتی تو وہ خود اپنا ناشتا تیار کر لیتا اور پھر تیار ہو کر آفس چلا جاتا۔ وہ اپنے کمرے کے باہر والے دروازے سے ہی دروازہ لاک کر کے نکل جاتا تھا۔ رات کو وہ اکثر باہر سے کھانا کھا کر آتا تھا۔ وہ آتا بھی باہر کے دروازے سے ہی تھا اس لیے اُمِ فروا کو اس کے آنے جانے کا علم نہیں ہوتا تھا۔ وہ فجر کی نماز پڑھنے کے بعد قرآن پاک پڑھ کر سو جاتی۔ پھر وہ دس بجے اٹھتی وہ اپنا ناشتا بناتی یا فریج میں کچھ پڑا ہوتا تو وہ چائے کے ساتھ لے لیتی۔
کچن کے تمام میلے برتن دھو کر کچن صاف کرتی۔ بلال حمید اپنے برتن خود دھو کر جاتا تھا۔ وہ کچن کی صفائی کر کے ہال میں چلی آتی۔ وہ کوشش کرتی پرانی باتیں اُسے ہرٹ نہ کریں، فرسٹریشن اس کے نزدیک نہ آئے، اب وہ اپنے ایموشنز پر کنٹرول پانا چاہتی تھی۔ جو ہونا تھا وہ تو ہو گیا، بار بار وہی باتیں یاد کر کے اپنے مندمل ہوتے

زخم دوبارہ سے نہ کریدتے۔ تب وہ آواز با بلند قرأت کرتی یا نعتیں پڑھنی شروع کردیتی۔

سوا چار مہینے گزرنے کے بعد اُس کے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔ وہ یہ نہ جانتی تھی۔

ملک مصطفیٰ علی اب فیکٹری سے جلدی آنے لگے تھے۔ عشاء کی نماز کے بعد وہ کبھی کبھار اس کے ہاں چکر لگا لیتے۔ تھوڑی دیر بیٹھ کر وہ چلے جاتے۔

اتوار کی اس دوپہر وہ اس کی طرف آئے تو اُن کے ہاتھوں میں بہت سارے شاپرز تھے۔ جن میں اُمِ فروا کے لیے کچھ کپڑے اور کھانے پینے کا سامان تھا۔ اس وقت اُمِ فروا نے سی ڈی پلیئر پر اپنی آواز میں ریکارڈ کی ہوئی نعت لگا رکھی تھی اور خود کپڑے استری کررہی تھی۔

دروازے پر بیل ہوئی۔ اُمِ فروا نے سوچا شاید بلال حمید دروازہ کھول دے لیکن وہ اپنے کمرے سے نہ نکلا۔ شاید واش روم میں ہو یا ویک اینڈ کی وجہ سے سو رہا ہوگا۔ سوچ کر وہ دروازے پر آگئی۔

''کون؟''

''مصطفیٰ ہوں۔'' تب دروازہ کھول کر وہ سائیڈ پر ہوگئی۔ تو وہ اندر آگئے۔

''السلام علیکم۔''

''وعلیکم السلام۔'' ملک مصطفیٰ علی نے مسکرا کر اس کے سلام کا جواب دیا۔ اور شاپرز ہال کے سینٹر ٹیبل پر رکھ دیے اور خود صوفے پر بیٹھ گئے۔

''ایسے تکلفات آپ نہ کیا کریں۔''

''کیسے یہ تکلفات نہ کیا کروں۔'' مسکراتے ہوئے وہ ہونٹوں کو دانتوں تلے دبا کر بولے، اُن کی براؤنش آنکھوں کے زاویے اس کے چہرے پر مرکوز تھے۔ اُمِ فروا کو اُن کا یوں پلک جھپکائے بغیر دیکھنا ذرا اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ وہ آج خاصی اُلجھی ہوئی تھی۔ اس کی روح بے نام بے کلی سے نڈھال ہوئی جارہی تھی۔ تھکن بھرے پیروں میں حالات کے نشیب و فراز نے چھالے بھر دیے تھے۔ گریہ زاری اس کے چہرے سے عیاں تھی۔ رت جگوں سے بھاری ہوئی آنکھیں بتا رہی تھیں آج رات پھر وہ اپنے آپ سے خوب لڑی ہے۔

''آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے۔'' ملک مصطفیٰ علی نے اُمِ فروا کو مخاطب کیا۔

''ٹھیک ہوں۔''

''آپ اکیلی بور تو ہو جاتی ہوں گی؟''

''اسیری میں بوریت تو ہوتی ہی ہے۔'' شکوہ اُس کے ہونٹوں پر پھسلا۔ وہ مسکرائے۔ اُمِ فروا کا پہلی بار یوں شکوہ کرنا اُنہیں اچھا لگا۔ ''اُمِ فروا ان تمام اسباب میں آپ کی مرضی کو مقدم رکھا گیا تھا۔''

''جی۔'' اُس نے اثبات میں پلکوں کو جنبش دی۔

''چند دن آپ اپنے والدین کے پاس رہ آتیں لیکن عدت کے دن آپ کو ایک ہی جگہ پر پورے کرنے ہیں۔''

''جی۔'' اس وقت بے بسی کا عالم ایسا تھا اُس کا دل پارہ پارہ ہو رہا تھا۔ ایک لمحے کے لیے اس کی نگاہیں سراپا سوال بن کر مصطفیٰ علی کی جانب اٹھیں۔

(عشق کی راہداریوں میں، زندگی کی سچ بیانیوں کی چشم کشائی کرتے اِس خوبصورت ناول کی اگلی قسط، انشاء اللہ آئندہ ماہ اپریل میں ملاحظہ کیجیے)

انتخابِ خاص

مرزا حامد بیگ

گرامو فون

آج صبح حسبِ معمول اپنے دفتر میں بیٹھا فائلیں نمٹا رہا تھا کہ خصوصی طور پر محض مجھی کو مطلع کرنے گاؤں سے ایک بھلا مانس چلا آیا۔ معلوم ہوا کہ حویلی بیک وقت اجڑی اور پھر سے آباد بھی ہوگئی۔ ''وہ کیسے؟'' میں نے بے تاب ہو کر پوچھا۔ ''جی کل رات......

دل میں یادوں کی ہوک جگاتا ایک یادگار انتخاب

وہ میرا لڑکپن تھا اور ہمارے گھر کے قریب بہنے والی گدلے پانی کی نہر کے دونوں اطراف میں دور تک پھیلے ہوئے شاداب علاقے، گرمیوں کی طویل دوپہروں کی پناہ گاہ تھے۔ آموں کے گھنے باغات میری گزرگاہیں تھیں اور باغوں کے رکھوالوں کے ہاتھوں میں گھومنے والی غلیلیں اور ہر پل طوطوں کے جھنڈ کے جھنڈ۔

مجھے اُدھر جانا تھا لیکن بروقت جا نہیں سکا۔

گدلے پانی کی نہر کے رخ پر، اس اجاڑ حویلی تک، جو میرے بچپن اور لڑکپن کی سرحد پر آباد تھی اور جسے میری جوانی سے بڑھاپے تک کے سفر نے اجاڑ کر رکھ دیا۔

بس وہی دن تھے، جن میں نے پہلی بار بیک وقت نہر کے گدلے پانی میں تیر کر آتی ہوئی کٹی پھٹی انسانی لاشیں دیکھیں اور شام کو آبادی میں چھڑکاؤ گاڑی کے گزر جانے کے بعد ایک ایک کر کے روشن ہوتے ہوئے لیمپ پوسٹ اور سینما والوں کی بگھی کا پھیرا۔ اس کے بعد یہ سب معمول کا حصہ بن گیا۔

سارا دن اسی آوارگی میں گزر جاتا۔ رات گئے گھر کو پلٹتا تو سب گھر والے سوئے ہوئے ملتے اور نیم غنودگی کی کیفیت میں ڈوبا اردلی کھانا گرم کر دیتا۔ بس یہی میرا گھر سے رشتہ تھا۔ میں بھی کھانا کھا کر سو رہتا اور میرے گرداگرد، سوتے جاگتے، گدلے پانی میں کٹی پھٹی انسانی لاشیں تیرتی رہتیں۔

ایک روز رات کو والد صاحب قبلہ نے تھانیدار کی وردی اتار کر کھونٹی پر ٹانگتے ہوئے فرمایا:

''یہ ملعون تھے ہی اس قابل۔ ان کا کون ہے رونے والا؟ لیکن میہڑ پولیس نے اپنی حدود سے انہیں اس طرف ہانک کر ہمیں مشکل میں ڈال دیا۔ یہ آموں کے باغات نہ ہوتے اور اتنی بہت سی سوکھی ٹہنیاں نہر تک نہ جھک آتیں تو آگے جا کر سڑتے، کتے کے پلے۔''

اگلے روز عصر کے وقت میونسپل کمیٹی کی چھڑکاؤ گاڑی گزر گئی تو ان سڑتی ہوئی لاشوں کو نہر کے

گدلے پانی میں سے نکال کر پوسٹ مارٹم کے لیے بھیج دیا گیا۔

گھڑیال والے چوک میں لیمپ پوسٹ روشن ہو گئے تو حسب معمول سینما والوں کی بگھی گزری۔ بگھی کے چھجے کے ساتھ فلم کے قدِ آدم اشتہار جھول رہے تھے اور ہچکولے کھاتی نشست پر گراموفون دھرا تھا۔ سینما والوں کا مستعد کارندہ بگھی رکوا کر پہلے ساؤنڈ بکس کی سوئی بدلتا اور پھر سہج سہج گراموفون ریکارڈ تبدیل کرتا جاتا۔ کچھ دیر چوک میں رک کر اور گھماؤ غلیل کی طرح ٹھہری ہوئی زندگی کو نئی کروٹ دے کر بگھی آگے بڑھ گئی اور میں سڑتی ہوئی لاشوں کے ساتھ گدلے پانی میں تنہا رہ گیا۔

بس وہی دن تھا جب کٹی پھٹی لاشوں کے ساتھ سوکھی ہوئی شاخوں کا سہارا لیے ہوئے گراموفون کے حصول کی چینک دل میں جاگی۔

معاف کیجیے، میں شاید پھر بہک گیا۔ یا وہ گوئی کے ضمن میں ہمیشہ سے مطعون چلا آیا ہوں لیکن بخدا، حاشیہ آرائی مقصود نہیں۔

میری مشکل یہ ہے کہ آموں کے باغات میں گدلے پانی کی نہر کے رخ پر ایک ویران حویلی بھی تھی اور جب میں نے عصر کی اذانوں کے ساتھ پہلی بار اس حویلی میں قدم رکھا تھا تو حویلی کے وسیع و عریض صحن میں ایک باوقار خاتون مٹی کے کوزے بھر بھر کر چھڑکاؤ کرنے میں مصروف تھی۔

میں حد بندی کی اوٹ میں چپ چاپ، دم سادھے، اسے اس کام میں مشغول دیکھتا رہا۔ چھڑکاؤ کے بعد اس نے صحن میں ایک ایک کر کے دو آرام کرسیاں لا کر رکھیں۔ بالکل آمنے سامنے۔ پھر وہ دونوں کرسیوں کو تا دیر کھڑی تکتی رہی۔ اس کے بعد وہ ایک تپائی اٹھا لائی اور تپائی پر اس نے گراما فون لا کر سجا دیا۔

گراموفون کو اچھی طرح جھاڑ پونچھ کر، وہ ایک بار پھر اندر گئی اور پیتل کی اونچی سماوار اور دو پیالیاں اٹھا لائی۔ سماوار میں بھری گرم سبز چائے کی خوشبو لپٹیں لے رہی تھی۔ پھر اس نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے اپنے برابر کی تپائی پر رکھے گراموفون کو کھولا۔ اس میں چابی بھری، ساؤنڈ بکس کو پھونک مار کر صاف کیا، اس کی سوئی بدلی اور دیر تک باریک تیلیوں کی پٹاری میں رکھے ریکارڈ الٹتی پلٹتی رہی۔

شام کی اذانوں تک وہ جیسے کسی کی منتظر رہی اور میں اسے چھپ کر دیکھتا رہا۔ شام کے سرمئی اندھیرے کے پوری طرح چھا جانے تک وہ تنہا بیٹھی رہی تھی اور اس کے بعد اسی ترتیب کے ساتھ اس نے صحن میں رکھی جملہ اشیاء کو ایک ایک کر کے اندر پہنچایا تھا۔

وہ کسی کی آمد کی منتظر تھی۔ وہ کون تھا جس نے آنا تھا، پر نہیں آیا۔ بس یہی کچھ جاننے کی خاطر میں نے اپنی شامیں اس حویلی کی حد بندی میں دم سادھے، چھپ کر گزار دیں لیکن آنے والے نے نہیں آنا تھا نہ آیا، پر وہ تھا کون جس کا اسے انتظار تھا؟

میں نے کسی سے پوچھا نہیں۔ پوچھتا بھی تو کس سے۔ کسی کو اتنی فرصت کہاں تھی جو میرے بے معنی سوال پر توجہ دیتا۔ گھر میں کھونٹی پر ٹنگی تھانیدار کی وردی تھی اور باہر آموں کے گپ چپ باغات۔ ہریل طوطوں کے جھنڈ اور گھماؤ غلیل کی سنسناہٹ اور یا پھر نہر کے گدلے پانی میں تیرتی ہوئی کٹی پھٹی لاشیں، چھپڑ کاؤ گاڑی کے مصروف کارندے اور سنیما والوں کی بگھی کا پھیرا۔

بس یوں ہی گزر گئی۔

پھر ہم لوگ شہر چلے آئے اور کئی برس تک ادھر جانا ہی نہیں ہوا لیکن گراموفون کے حصول کی خواہش دل میں ویسی کی ویسی رہی۔ کئی برس گزر گئے۔

☆......☆

میں کالج میں پڑھ رہا تھا۔ جب ایک دن گھر والوں کے ساتھ، شاید کسی عزیز کی فوتگی پر ادھر جانا ہوا۔ پرسا دینے اور دعائے مغفرت کے بعد میں یوں ہی نکل کھڑا ہوا۔

عصر کا وقت رہا ہوگا جب میں یونہی گھومتا گھماتا اس حویلی کی طرف نکل گیا۔ حد بندی گزار کر میں نے دیکھا کہ حویلی کا وسیع وعریض صحن بالکل خالی تھا۔ نیم تاریک برآمدے اور لالٹین کی مدھم روشنی میں، میں نے اسے پہچان لیا۔ وہ بہت بوڑھی ہوگئی تھی اور آہستگی کے ساتھ جھک کر چلتے ہوئے اس وقت وہ زمین پر بکھرے ہوئے برتن سمیٹ رہی تھی۔

میں اس روز بلا جھجک اور بلا اجازت برآمدے تک چلا آیا تھا۔ پکی اینٹوں کے فرش پر اٹھتے ہوئے میرے قدموں کی آہٹ پر اس نے پلٹ کر دیکھا۔ اپنی ہتھیلی کو آنکھوں پر لاتے ہوئے اس نے مجھے پہچاننے کی کوشش کی اور حیرت کے ساتھ کچھ دیر مجھے تکتی رہی۔

''میں حامد ہوں۔''

''حامد!'' اس نے نہ پہچانتے ہوئے میرا نام دہرایا۔

''تھانیدار کا بیٹا حامد...... میں شہر سے آیا ہوں۔ اب ہم وہیں رہتے ہیں۔''

''بسم اللہ...... آؤ...... آجاؤ حامد...... ادھر آؤ۔ میں نے ٹھیک طرح کبھی تمہیں دیکھا ہی نہیں۔''

میں آگے بڑھا تو اس نے جھک کر لالٹین اٹھالی اور میرے چہرے تک لاتے ہوئے دیر تک اپنی دھندلائی ہوئی آنکھوں کے ساتھ مجھے تکتی رہی۔ پھر اس نے مجھے ماتھے پر بوسہ دیا اور بولی:

''ماشاء اللہ، جوان ہو گئے۔ تمہارا ابا کیسا ہے؟''

''ٹھیک ہیں جی، بس کچھ بوڑھے ہو گئے۔ گزشتہ سال تک تو بالکل ٹھیک ٹھاک تھے پر اب

گھٹنوں میں تکلیف رہتی ہے۔ انہیں چلنا پھرنا بہت کم ہو گیا ہے۔''

''ہاں...... تم بھی تو جوان ہو گئے۔''

''بس جی، آپ کے سامنے ہوں۔''

''خدا تمہیں لمبی عمر دے۔ باپ کا سایا قائم رکھے۔ مجھے اب دکھائی نہیں دیتا۔ آپریشن کروایا تھا۔ پہلے ایک آنکھ کا، پھر دوسری کا لیکن نظر ٹھہرتی نہیں۔ ڈھور ڈنگر سنبھالے نہیں جاتے تھے۔ اس لیے بیچ دیے۔ اب گوالے تک جانا پڑتا ہے دودھ کی خاطر۔ ابھی ابھی لوٹی ہوں اُدھر سے۔ تمہارا بابو چاچا تو ادھر ہوتا ہے نا۔ نیک بخت ہے وہ۔ لوگ اسے آنے ہی نہیں دیتے اِدھر۔ اب تو سنا ہے بیمار رہتا ہے۔ ایک خط آیا تھا۔ اس سال، ساون بھادوں میں چھٹی ملے گی تو آئے گا۔''

اس روز مجھے پہلی بار معلوم ہوا کہ انتظار کی عمر اتنی طویل بھی ہو سکتی ہے۔

''بیٹھ جانا اِدھر، موڑھے پر۔ سنا کیسے آیا تھا۔ خیر تو ہے نا؟''

''وہ...... ماں جی ہم سب ادھر آئے تھے موہن پورہ میں، دعا کے لیے۔ شام کو واپس چلے جانا ہے ہم نے۔ میں نے سوچا ادھر سے بھی ہوتا جاؤں۔''

''ہاں بیٹا اچھا کیا۔ خون کی کشش ہوتی ہے، کھینچتا ہے اپنی طرف۔''

''وہ ماں جی......''

مجھ سے زیادہ دیر رہا نہیں گیا۔

''وہ ایک گراموفون تھا آپ کے گھر میں......''

''ہاں...... رکھا ہے۔ تمہارے بابو چاچا کبھی لائے تھے۔ اندر پڑا ہے۔ مجھ سے تو سنبھالا نہیں جاتا۔''

''ماں جی...... اب تو بابو چاچا بھول بھال گئے ہوں گے اسے......''

''ہاں بھول گیا۔ تجھے چاہیے؟ تُو لے جا۔''

''ہاں ماں جی مجھے اچھا لگتا ہے۔''

تو لے لے نا۔''

میں بے تاب ہو کر اٹھ کھڑا ہوا۔

''وہ اندر رکھا ہے۔ نیچے پٹاری میں ریکارڈ بھی ہوں گے لیکن اتنے پرانے ریکارڈ اب تجھے کیا بھائیں گے۔ نئے لے لینا شہر سے۔''

یہ سن کر میں وہاں مزید کتنی دیر رکا۔ کچھ یاد نہیں۔ بس اتنا یاد ہے کہ میں نے نیم تاریک سیلن زدہ کمرے سے اسے اٹھا لیا، پرانے ریکارڈوں کی پٹاری سمیت۔

☆......☆

پھر شہر کیا آیا، بس یہیں کا ہو کر رہ گیا۔ کالج، کالج سے یونیورسٹی۔ پہلے حصولِ تعلیم کے سلسلے میں جکڑا رہا۔ پھر طویل بے روزگاری کاٹی۔ ملازمت ملی تو شادی اور گھرداری کے اجھیڑوں میں پڑ گیا۔ گراموفون پر گرد جمتی چلی گئی۔

ایسا نہیں کہ ادھر جانے کا خیال نہیں آیا۔ بس یکے بعد دیگرے الجھتا چلا گیا۔ یہ زندگی کا پھیلاؤ مار گیا۔ بہت اجھیڑے ہیں۔ چھوٹے چھوٹے کام، بظاہر بہت معمولی، غیر اہم لیکن انہیں کیے بغیر چھٹکارا بھی نہیں۔ بہت سے کام نمٹا چکا۔ تب بھی ٹیلی فون کے بل کا جھگڑا ابھی باقی ہے۔ سوئی گیس کے بل کی درستگی اور پراپرٹی ٹیکس کا مسئلہ، پے بل کو کمپیوٹرائز کروانے کے لیے اکاؤنٹس آفس کا چکر ابھی رہتا ہے اور اسی میں تاخیر ہو گئی۔

ادھر سے وقفے وقفے کے ساتھ اپنے کاموں کے سلسلے میں شہر آئے ہوئے افراد سے ملاقات ہوتی تو جی چاہتا کہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر نکل جاؤں۔ کئی بار سوچا کہ بڑے بیٹے کو سختی سے کہوں کہ ادھر سے چکر لگا آئے۔ یہ معلوم کر آئے کہ اب حویلی کے شب و روز کیسے ہیں لیکن اسے وقت ہی نہیں ملتا۔ جانے

کہاں رہتا ہے۔ ہمیشہ کہتا رہا کہ ابو کالج میں بہت معروفیت ہے۔ ایک دن کے لیے بھی غیر حاضر نہیں رہ سکتا۔ اس نے کبھی ادھر جانے سے انکار نہیں کیا لیکن گیا بھی نہیں۔

شہر کے اپنے معاملات ہیں۔ ادھر جاتا تو تاخیر سے آنے پر معذرت کرلیتا۔ یہی کچھ سوچتا آیا ہوں۔

لیکن آج معاملہ ہی کچھ ایسا آن پڑا کہ خجالت کے احساس نے کہیں کا نہیں رہنے دیا اور میں سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر اطلاع ملتے ہی نکل کھڑا ہوا ہوں۔

وہ ایک اطلاع، جس کا مجھے ہمیشہ دھڑکا لگا رہا۔

آج صبح حسبِ معمول اپنے دفتر میں بیٹھا فائلیں نمٹا رہا تھا کہ خصوصی طور پر محض مجھی کو مطلع کرنے گاؤں سے ایک بھلا مانس چلا آیا۔ معلوم ہوا کہ حویلی بیک وقت اجڑی اور پھر سے آباد بھی ہو گئی۔

''وہ کیسے؟'' میں نے بے تاب ہو کر پوچھا۔

''جی کل رات چالیس برس بعد بابو چاچا حویلی لوٹ آئے ہیں لیکن جب آئے ہیں تو ماں جی گزر گئیں۔''

''آخری دنوں میں آپ کو یاد کرتی تھیں۔''

''مجھے؟ مجھے یاد کرتی تھیں؟؟''

''میرے گرد اگرد سڑتی ہوئی لاشوں کے انبار لگتے گئے۔ ایک کے بعد ایک، گدلے پانی میں بہہ کر آتی ہوئی۔

''دیکھتے نہیں کتنی تاریکی ہے۔ کمیٹی والے آج لیمپ پوسٹ روشن کرنا بھول گئے کیا؟''

''جی...... جی میں تو آپ کو اطلاع کرنے آیا تھا۔ آپ آرہے ہیں نا؟''

''ہاں...... ہاں آرہا ہوں۔''

یہ دیکھنے کے لیے کہ اب اس حویلی کا واحد مکین کس حال میں ہے۔ وہ، جس نے اپنی جوانی میں شادی کے بعد شاید دو راتیں بھی اس حویلی میں نہ گزاری تھیں۔

یہ سب پرانی باتیں ہیں اور اس وقت جب کہ میں بڑھاپے کی دہلیز پر قدم رکھ چکا تو مجھے ادھر جانا ہے اور اسے دیکھنا ہے، جو اتنی مدت بعد پلٹا تو اسے حویلی خالی نہیں ملی۔ دو دھندلائی ہوئی منتظر آنکھوں نے اسے خوش آمدید کہا اور ہمیشہ کے لیے مندتی چلی گئیں۔

پھر میں چلا آیا، سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر۔ اسی نیم تاریک سیلن زدہ کمرے میں، جہاں سے میں نے گراموفون اٹھایا تھا، پرانے ریکارڈوں سمیت۔

حویلی میں بابو چاچا اور میں آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ انہوں نے مجھے نہیں پہچانا۔ پہچانتے بھی تو کیسے۔ انہوں نے کچھ بھی تو جواب میں نہیں کہا یا شاید میں نے کوئی سوال ہی نہیں کیا تھا۔

''آپ کو دیکھنے اور ماں جی کے لیے دعا کرنے حاضر ہوا تھا۔''

''ہاں بیٹا! موت برحق ہے اور یہ ایک رسمی کارروائی کیے لیتے ہیں۔'' دعا کے بعد میں نے پوچھا۔

''اب آپ اس حویلی میں اکیلے ہیں۔ کیا محسوس کرتے ہیں ان کے چلے جانے کے بعد؟''

وہ تادیر خاموش رہے۔ پھر بولے:

''میں اس کا گناہ گار ہوں۔ یہ تسلیم لیکن میں قابلِ نفرین تھا، اسے جوانی میں اکیلا چھوڑ کر نکل گیا۔ پھر بھی اس نے مجھ سے کبھی نفرت کا اظہار نہیں کیا۔ ایسا کرتی تو میں بخدا بہت پہلے لوٹ آتا۔ انتظار وہ کرتی رہی اور ہلاک میں ہوتا رہا۔ پر اب، جب کہ مجھے اس کی ضرورت تھی تو وہ گزر گئی۔''

بابو چاچا بولتے رہے اور میں بیٹھا سنتا رہا۔

واپسی پر آموں کے باغات میں نہر کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے میں نے دیکھا کہ گدلے پانی پر جھکی ہوئی سوکھی شاخیں کاٹ دی گئی تھیں اور بہہ کر آنے والوں کو تھامنے کے لیے وہاں کچھ بھی نہیں رہ گیا تھا۔

☆☆☆

دوشیزہ میگزین

- رنگِ کائنات
- دوشیزہ گلستاں
- نئے لہجے، نئی آوازیں
- یہ ہوئی نا بات
- لولی وُڈ، بولی وُڈ
- نفسیاتی اُلجھنیں اور اُن کا حل
- کچن کارنر
- حکیم جی!
- بیوٹی گائیڈ

دوشیزہ گلستان

اسماء اعوان

فرمانِ الٰہی

اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے
بے شک جو لوگ ہماری نازل کی ہوئی راہ بتانے والی روشن تعلیمات اور واضح ہدایات کو چھپاتے ہیں' باوجود اس کے کہ ہم انہیں سب انسانوں کی رہنمائی کے لیے اپنی کتاب میں بیان کرچکے ہیں' ایسے لوگوں پر اللہ بھی لعنت کرتا ہے اور تمام لعنت کرنے والے بھی ان پر لعنت بھیجتے ہیں۔
(سورۃ البقرہ ۲۔ ترجمہ آیت ۱۵۹)

حکایت

جناب شیخ فرماتے ہیں کہ ایک خوش مزاج شخص شہد فروخت کیا کرتا تھا اور لوگ اس کے اچھے اخلاق کے گرویدہ تھے۔ کسی بدنیت اور بداخلاق شخص نے اس کے کاروبار کو دیکھا تو حسد کا شکار ہوگیا لہٰذا اگلے روز اس نے بھی شہد کا مٹکا اٹھایا اور فروخت کرنے کے لیے نکل کھڑا ہوا لیکن پورے دن پھیرے لگانے کے باوجود کسی نے اس سے شہد نہیں خریدا۔ وہ رات کو گھر پہنچا تو اس کی بیوی نے اسے مایوس دیکھ کر کہا کہ کڑوی باتیں کرنے سے تو شہد بھی کڑوا ہوجاتا ہے۔''
شیخ سعدی علیہ الرحمتہ فرماتے ہیں کہ اس آدمی کا کھانا چکھنا بھی حرام ہے جس کے ماتھے پر دسترخوان کی طرح شکنیں پڑی ہوئی ہوں۔
(حکایاتِ سعدیؒ بوستان۔ نمبر ۹)

رُوحِ قائد

آج ہم یہاں ایک حقیر اجتماع کی صورت میں اُس عظیم المرتبت انسان کی بارگاہ میں خراجِ عقیدت اور نذرانۂ محبت پیش کرنے کے لیے جمع ہوئے ہیں جس کی تقدیس و تکریم کے جذبات بے پایاں سے بے شمار لوگوں کے قلوب سرشار رہے ہیں بلکہ دنیا کے تمام بڑے بڑے لوگوں نے بھی اپنے سروں کو پورے اعزاز و اکرام کے ساتھ اس بارگاہ میں خم پایا ہے تو پھر مجھ جیسا حقیر بے نوا' ایسی عظیم المرتبت شخصیت کے حضور نذرانۂ عقیدت و محبت پیش کرے بھی تو کیا کرے۔
ہمارے رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وسلم عظیم الشان معلم تھے' عظیم الشان مقنن تھے' عظیم الشان مدبر تھے اور عظیم الشان فرماں روا تھے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ بہت سے لوگ ایسے بھی موجود ہیں کہ جب ہم لوگ اسلام کی گفتگو کرتے ہیں تو اس کی قدر و منزلت اور اہمیت ان کی سمجھ میں نہیں آتی۔ اسلام صرف مناسک و رسوم کا' روایات کا اور رُوحانی تعلیمات کا کوئی مجموعہ نہیں ہے۔ اسلام ضابطۂ حیات بھی ہے ہر ایک

مسلمان کے لیے۔
(کراچی: بار ایسوسی ایشن میں جلسہ میلاد النبی ﷺ کے موقع پر تقریر......۱۹۴۸ء)

ماں

ماں!
تیرے جانے سے
میرا میکہ موتی موتی ٹوٹ رہا ہے۔
سب میں اُلفت اب ہے کم کم،
پیار کی باتیں خواب ہوئیں
اب وہ میل ملاقاتیں نایاب ہوئیں
اب 'میں' کی ہے گردان لگی
سب کو اپنی اپنی پڑی ہے۔
پیاری ماں!
ملکِ عدم سے لوٹ آ دوبارہ
اور پھر سب کو باندھ دو،
ان ہی پیار کی زنجیروں میں۔
شگفتہ شفیق کی شاعری سے متاثر۔صبوحی کاظمی کا حسن نظر

عورت

"آپ عورت کے ساتھ کتنی بھی علم و دانش کی بات کریں، کیسے بھی دلائل کیوں نا دیں اگر اس کی مرضی نہیں ہے تو وہ اس کی منطق کو کبھی نہیں سمجھے گی۔ اس کے ذہن کے اندر اپنی منطق کا ایک ڈرائنگ روم ہوتا ہے۔ اور وہ اسے روشن کرنے کے لیے باہر کی روشنی کی محتاج نہیں ہوتی۔ اس لیے وہ کسی عقل و دانش اور دلائل کے معاملے میں مانگے کی روشنی پر ایمان نہیں رکھتی۔ اس نے جو فیصلہ کرلیا ہوتا ہے وہی اس مسئلے کا واحد اور آخری حل ہوتا ہے۔"
اشفاق احمد کی زاویہ سے معصومہ رضا کا انتخاب

سنہری باتیں

1- اُستاد بادشاہ نہیں ہوتا مگر وہ بادشاہ بناتا ہے۔
2- والدین وہ 'درخت' ہیں جو 'پھل' دیں نہ دیں سایہ ضرور دیتے ہیں۔
3- عورت کو کوئی کام کبھی تھکا نہیں پاتا، البتہ رویے تھکا دیتے ہیں۔
مرسلہ: انجم علی نواز۔ گلستان جوہر۔ کراچی

بس ڈرائیور

بس ڈرائیور کی سیٹ کے پیچھے لکھا تھا:
"اگر رب نے چاہا تو منزل تک پہنچادوں گا،
اور
اگر آنکھ لگ گئی تو رب سے ہی ملوادوں گا۔"
مرسلہ: زرین زبیر۔ کراچی

لوکر لوگل

لڑکی: میری امی کو تم بہت پسند آئے ہو۔
پٹھان: (شرماتے ہوئے) کچھ بھی ہو ہم شادی تم ہی سے کرے گا۔
مرسلہ: ارسلان۔ کراچی

انمول باتیں

1- زندگی کو ہمیشہ مسکرا کر گزارو کیونکہ تم نہیں جانتے کہ ابھی کتنی باقی ہے۔
2- اچھے دوست کو کبھی نہ آزماؤ، شاید وہ کسی مجبوری کے تحت تمہاری آزمائش پر پورا نہ اتر سکے۔
3- لوگوں کی توقع پوری کرو، لیکن کسی سے توقع مت کرو۔
4- جھوٹ بولنے کا اثر گہرے زخم سا ہے، جس کے بھر جانے کے بعد بھی نشان باقی رہتا ہے۔
5- خوبصورتی اور بدصورتی کا معیار کردار کی عظمت پر ہے۔
6- خوبصورت سیرت خوبصورت چہرے سے بہتر ہے۔

7- بے انصافی برداشت کرنے سے خود بے انصافی کرنا زیادہ بہتر ہے۔

8- انسان علم کے بغیر اللہ تعالیٰ کو نہیں پہچان سکتا۔

9- بہترین قول ذکر ہے، بہترین فعل عبادت ہے، بہترین خصلت علم ہے۔

10- جب کسی عالم سے لغزش ہوتی ہے تو ایک عالم لغزش میں پڑ جاتا ہے۔

11- وہ علم ضائع ہے جس پر عمل نہ کیا جائے۔

12- آسمان کا بہترین اور آخری تحفہ ماں ہے، اس کی دل سے قدر کرو۔

مرسلہ: مسز نگہت غفار۔ کراچی

حسن کے نام

چٹھی نہ کوئی سندیس
جانے وہ کون سا دیس
اس دل کو لگا کر ٹھیس
کہاں تم چلے گئے
ہر چیز پہ اشکوں سے
لکھا ہے تمہارا نام
یہ رستے گھر گلیاں
تمہیں کر نہ سکے سلام
ہر دل میں رہ گئی یہ بات
جلدی سے چھڑا کر ہاتھ
کہاں تم چلے گئے

حسن انتخاب: ندیا مسعود۔ کراچی

چھوٹی سی بات

مسکرایا کیجیے، مسکرانے سے آپ کا کچھ نقصان نہیں ہوگا۔ دکھ سکھ زندگی کا حصہ ہوتے ہیں، غم اور اداسی تو ایک آکاس بیل ہیں جو انسان کو اندر ہی اندر چاٹ لیتی ہیں مگر مسکراہٹ، مسکراہٹ ایک روشنی ہے، زندگی ہے، طویل العمری ہے۔ یاد رکھیں کہ حد سے زیادہ سنجیدگی بھی چہرے کو بگاڑ دیتی ہے۔

مرسلہ: سائرہ چوہدری۔ لاہور

آنکھیں

☆ آنکھیں...... گناہ کی پہلی سیڑھی اور حیا کی پہلی زینت ہیں۔

☆ دیکھنے کی حس ماند پڑ جائے تو باقی حسیں زیادہ محتاط ہو جاتی ہیں۔

☆ لاشعوری تخلیق، ظاہری آنکھ کی محتاج نہیں ہوتی۔

☆ دل کو پُرسکون رکھنا چاہتے ہو تو اپنی پلکوں کے نیچے شرم و حیا کا بسیرا کرلو۔

☆ ظاہری آنکھ سے عشق کی ابتدا نہیں ہوتی۔

انتخاب: نرگس اشرف + طاہرہ پیر۔ کراچی

خیال اپنا اپنا

دیہات کی سیر کے دوران ایک شہری نے لہلہاتے سرسبز کھیتوں، جھومتے درختوں وغیرہ کو دیکھ کر بے اختیار بڑے رشک سے کہا۔ "واہ، کیا خوبصورت نظارہ ہے۔"

قریب کھڑا دیہاتی کاشتکار بولا۔ "اگر آپ کو یہ نظارہ تیار کرنے کے لیے کڑکڑاتی سردی میں صبح اٹھ کر کھیتوں میں پانی دینا پڑے، گوڈی کرنی پڑے، کھاد ڈالنی پڑے، اسپرے کرنا پڑے، چلچلاتی دھوپ میں فصل کاٹنی پڑے، عشر، آبیانہ اور دوسرے ٹیکس دینے پڑیں تو پھر آپ کو یہ نظارہ بہت عام سا لگے گا۔"

مرسلہ: شعبان کھوسہ۔ کوئٹہ

مختصر مختصر

شکر کرو، نعمت محفوظ ہو جائے گی، دسترخوان کشادہ کر دو، رزق بڑھے گا۔ سجدہ کرو، تقرب ملے گا۔
عزت کرو، عزت ملے گی۔ صدقہ دو، بلائل

جائے گی۔ توبہ کرو، گناہ معاف ہو جائیں گے۔

انسان جس کیفیت اور عقیدے میں مرے گا اسی میں دوبارہ اُٹھایا جائے گا۔ دعا کریں کہ وقتِ رخصت کلمہ نصیب ہو۔

جو شخص اس لیے اپنی اصلاح کر رہا ہے کہ دُنیا اس کی تعریف و عزت کرے، اس کی اصلاح نہیں ہوگی۔ اپنی نیکیوں کا صلہ دنیا سے مانگنے والا انسان نیک نہیں ہو سکتا۔ ریاکار اس عابد کو کہتے ہیں جو دنیا کو اپنی عبادت سے مرعوب کرنا چاہے۔

واصف علی واصف کی کتاب سے
کرن شہزادی۔ راولپنڈی کا انتخاب

ستارے

انگلستان کے مشہورِ زمانہ سراغ رساں شرلاک ہومز اپنے معاون اور دوست ڈاکٹر واٹسن کے ساتھ بستر پر محوِ استراحت تھے کہ اچانک اُٹھے، اور ڈاکٹر واٹسن سے کہا "ڈاکٹر! تم جانتے ہو کہ آسمان میں کتنے ستارے ہیں؟"

واٹسن نے آسمان کی طرف بہ غور دیکھا، اور کہا کہ آسمان میں کھربوں ستارے ہیں، اور لاتعداد کہکشائیں ہیں......"

ہومز نے بات کاٹی "بے وقوف......!" اور ٹھنڈی سانس بھر کے کہا، "کوئی ہمارا خیمہ چوری کر کے لے گیا ہے۔"

مرسلہ: نگہت منیر۔ اوکاڑہ

سیاست

دنیا میں صرف وہ قوم راج کرتی ہے۔
جو دلیل سے قائل ہو جاتی ہے۔
جو عذر کو قبول کر لیتی ہو۔
جو اختلافِ رائے کو محفل کا حُسن گردانتی ہو۔
جو تحقیق کی مداح ہو۔
جو تجربے کو ہمدم و ہم نشین رکھتی ہو۔
جو سر پہ عزتِ نفس کا کلمہ باندھتی ہو۔
جو کوشش کے جوتے پاؤں سے لپٹائے رکھتی ہو۔
جو قانون کو زیور کی طرح عزیز رکھتی ہو۔
جو مذہب کی مشعل ہاتھ میں لے کر چلتی ہو۔
جو ہر دفاع کو سوچنے اور ہر ہاتھ کو مثبت کام کرنے کی آزادی دیتی ہو۔
جو جید لوگوں کو حکمران رکھتی ہو۔

مرسلہ: شازیہ ظہیر۔ ساہیوال

سوا سیر

ایک چھوٹی سڑک پر دو کاریں آمنے سامنے کھڑی ہو گئیں۔ دونوں میں سے کسی کا بھی ڈرائیور پیچھے ہٹنے کو تیار نہیں تھا۔ ایک ڈرائیور نے یہ ظاہر کرنے کے لیے کہ اس کا پیچھے ہٹنے کا کوئی ارادہ نہیں، اخبار پڑھنا شروع کر دیا۔

یہ دیکھ کر دوسرے ڈرائیور نے کھڑکی سے منہ نکال کر کہا۔

"اگر معمے والا صفحہ نہیں پڑھ رہے ہو تو وہ مجھے دے دو تاکہ میں اتنی دیر میں معمہ حل کر لوں۔"

مرسلہ: علوینہ رشید۔ حیدرآباد

ورزش

دفتر کے جنرل منیجر کی کاہلی مثالی تھی۔ ایک روز اچانک انہوں نے یہ اعلان کر کے سب کو حیران کر دیا۔ "بھئی آج میں جمنازیم ضرور جاؤں گا۔"

"بہت خوب......!" ایک صاحب نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔ "آخر آپ کو ورزش کا خیال آ ہی گیا۔"

"ورزش کرنے کو کون کمبخت جا رہا ہے......"

جی ایم منہ بنا کر بولا۔ "مجھے تو اپنی ممبر شپ کینسل کروانے کے لیے جانا ہے۔"

مرسلہ: شاہانہ احمد۔ کراچی

نئے لہجے نئی آوازیں

امن کی تلاش

وہ فاختہ بھی
ناداں، پاگل تھی کتنی
موسم کی سازش
باتوں میں آکر
فریب کھا بیٹھی
شکاری کی راہ گزار میں
گھونسلہ اپنا بنا بیٹھی!!!

معاویہ عنبر وٹو۔ ہڑپہ سٹی

غزل

زندگی بھر میرے دل میں تو یہ حسرت ہی رہی
کاش حقدار کو حق اُس کا دلادیں ہم لوگ
چاند کی طرح ستاروں کی طرح جو چمکیں
ایسے انسانوں کو شاہکار بنادیں ہم لوگ
گھپ اندھیرا ہے جہاں پر اسے روشن کردیں
راہ میں ایسی ہی کچھ شمعیں جلادیں ہم لوگ
جو بھی طوفان ہے گزرنا ہے گزر جائے گا
جو بھی ہیں قیمتی موتی وہ بچالیں ہم لوگ
اپنے کردار سے دنیا پہ یہ ثابت کردیں
شان اسلاف کی ہم سے ہے بتادیں ہم لوگ
جگنو بن جاؤں میں شب بھر کے لیے ہی اِنزاء
جو بھی بھٹکے ہوں انہیں راہ دکھادیں ہم لوگ

سیّدہ اِنزاء نقوی۔ کراچی

یہ کیسی محبت ہے تیری

ہم نے تو سنا تھا
محبت خوشی دیتی ہے،
اک سکون دیتی ہے
تو پھر یہ کیسی محبت ہے تیری
جو مجھے عجیب سی اذیت سے دوچار رکھتی ہے
تیرے کھوجانے کا احساس ہر پل رہتا ہے
تیرے بچھڑ جانے کے خوف سے ہمکنار رکھتی ہے
یہ کیسی محبت ہے تیری

نوشین اقبال نوشی۔ گاؤں بدر مرجان، کھاریاں

غزل

ایک مہتاب سجا آنکھوں میں
پھر ہوئی رات سزا آنکھوں میں
جب دریچے میں دِکھا چاند کوئی
پھر کوئی عکس سجا آنکھوں میں
پھر تری یاد کی خوش بُو آئی
پھر کوئی پھول کھلا آنکھوں میں
جب سرِ شاخ کھلا پھول کوئی
آگیا روپ ترا آنکھوں میں
پھر دریچے میں جلا دیپ جمالؔ
پھر کوئی آن بسا آنکھوں میں

سمیع جمال۔ کراچی

مجھے تم سے محبت ہے

میری آنکھوں کی بے چینی
میرے جذبوں کی سچائی
اگر تم جان بھی جاؤ
تمہیں محسوس بھی ہوگا
میرے لفظوں کے اندر تم
کہیں پر گنگناتے ہو

کہیں پر رقص کرتے ہو
میری یہ شاعری ساری
تمہارا ورد کرتی ہے
اگر میری یہ نظمیں بھی
تمہارے نام ہوتی ہیں
تو پھر اس کا یہ مطلب ہے
کوئی گہری عقیدت ہے
مجھے تم سے محبت ہے

فریدہ فری یوسف زئی۔ لاہور

میری ماں

بانہوں میں لے کر جھولا جھلایا
انگلی پکڑ کر ہے چلنا سکھایا
جھلستی ہوئی کڑی دھوپ میں
ٹھنڈی میٹھی ہے اُس کے آنچل کی چھایا
لگے ڈر تو بانہوں میں اپنی چھپائے
لوری دے کر وہ مجھ کو سلائے
چہرے سے چھلکتا ہے جس کے نور
مجھے لگتی ہے وہ کوئی جنت کی حُور
گود میں اس کی سر جب بھی رکھا
جنت کا انوکھا مزا میں نے چکھا
لبوں پر شفیق سی مسکان ہے
میری ہر ادا پہ وہ قربان ہے
کبھی کہیں خالہ، کبھی کہیں تایا
یاسمین تُو لگتی ہے اپنی ماں کا سایا

یاسمین اقبال۔ سنگھ پورہ۔ لاہور

ورق ورق

مجھے اپنے ضبط پہ ناز تھا سرِ بزم آج یہ کیا ہوا
میری آنکھ کیسے چھلک گئی مجھے رنج ہے یہ برا ہوا
جو نظر بچا کر گزر گئے میرے سامنے سے ابھی ابھی
وہ میرے ہی شہر کے لوگ ہیں، ہے گھر سے گھر ملا ہوا
مجھے آپ کیوں نہ سمجھ سکے، یہ خود اپنے ہی دل سے پوچھیے
میری داستانِ حیات کا ہے ورق ورق کھلا ہوا
مجھے راستے میں پڑا ہوا کسی بدنصیب کا خط ملا
تھا خونِ دل سے لکھا ہوا اور آنسوؤں سے مٹا ہوا

خواجہ مختیار حسین۔ خیر پور ٹامیوالی۔ پنجاب

دلِ ویران

بند کمرہ جالے بھری دیواریں
بکھری میز، دیمک لگے دروازے
خشک سیاہی دان، دھول میں اٹی کتابیں
اک ویرانی، اور ہُو کا عالم
بے چین دل، ویران آنکھیں
مچلتے جذبات، ڈگمگاتے قدم
لرزتا وجود، جھپکتی پلکیں
یہ ہی تو ثبوت ہے تم سے بچھڑنے کا
اور......اور......انتظارِ جاناں ہے

مسز نگہت غفار۔ کراچی

غزل

کچھ بھی تو اہتمامِ بہاراں نہ کر سکے
دل کو جلایا پھر بھی چراغاں نہ کر سکے
دنیا میں جیسے آئے چلے جائیں گے اک دن
قائم ہو نام جس سے وہ ساماں نہ کر سکے
انسانیت کا دعویٰ تو ہم سب کو ہے مگر
وہ کام کر رہے جو سلطاں نہ کر سکے
میرے جنونِ شوق نے میدانِ عشق میں
وہ وہ کیے ہیں کام جو طوفاں نہ کر سکے
حیوان آدمی ہے وہ انساں نہیں جلیسؔ
اپنی خودی کو خود جو نمایاں نہ کر سکے

سید خورشید علی جلیسؔ۔ کراچی

یہ ہوئی نا بات

سوال آپ کے.....
جواب زین العابدین کے!!

اس ماہ عظیم انصاری۔ گجرات کا سوال انعام کا حق دار ٹھہرا۔ انہیں اعزازی طور پر دوشیزہ گفٹ ہیمپر روانہ کیا جارہا ہے (ادارہ)

عارفہ ذکی۔ کراچی
☺ زین بھائی! انسان اور آدمی میں کیا فرق ہے؟
✍ وہی جو ہونا چاہیے سب کچھ تھوڑی بتاتے ہیں۔

یاسمین اقبال۔ سنگھ پورہ۔ لاہور
☺ جیب زیادہ گرم ہوتی ہے یا مٹھی؟
✍ جیب گرم ہوتی ہے تو مٹھی خود ہی گرم ہوجاتی ہے۔

☺ منہ دکھائی ہمیشہ دُولہا ہی کیوں دیتا ہے حالانکہ دولہن بھی تو دولہے کا منہ دیکھتی ہے؟
✍ قیدی سزا پاتے ہی جج کو کسی بھی صورت رشوت دیتا ہے۔

نور بانو۔ حیدرآباد
☺: بھیا کیا وجہ ہے کہ شرم سے پانی پانی ہو جانے کے باوجود انسان کے کپڑے گیلے نہیں ہوتے ہیں؟
✍: چونکہ پانی خود شرمندہ ہوتا ہے اس لیے کپڑے گیلے نہیں کرتا۔ آخر اس کی بھی تو کوئی عزت ہوتی ہے۔

اصفیہ انصاری۔ کراچی
☺: اگر ہمارے نام نہ ہوتے تو ہم ایک دوسرے کو کیسے بلاتے؟
✍: اے بھائی، اے بہن، اے اماں، اے ابا، وغیرہ وغیرہ۔

اریبہ۔ بورے والا
☺: پاگل انسانوں میں سب سے بڑی خوبی کیا ہوتی ہے؟
✍: جو کہتا ہے سچ کہتا ہے۔ سچ کے سوا کچھ نہیں کہتا۔

پروین گل۔ مانسہرہ
☺ زین بھیا! چاند پر سیر کرنے کے لیے جانا چاہتی ہوں بھلا بتایئے کون سے نمبر کی بس جاتی ہے؟
✍ ویسے تو 420 جاتی ہے مگر بی بی آپ نے اپنے شہر کے تمام علاقے دیکھ لیے ...... جو چاند پر جانے کے ارادے باندھ رہی ہیں۔

فائزہ۔ جہلم
☺ زین جی یہ تو بتائیں طوطے جی نگاہیں پھیرنے میں کیوں بدنام ہیں؟
✍ صنف قوی سے جو تعلق رکھتے ہیں۔

حاجرہ۔ گوادر

☺ زین جی ہم نے حج پر جانے سے پہلے کسی سیانے سے پوچھا تو وہ بولے۔ ''تمہارے نو سو چوہے ہیں ابھی پورے نہیں ہوئے۔'' یہ کیا بول دیا انہوں نے......؟

الفت جہاں۔ کراچی

✍ اگر کسی سیانے نے کہا ہے تو درست ہی کہا ہوگا۔

☺ زین جی کبھی کبھی دل چاہتا ہے کہ میں چاند پر جا کر بڑھیا......؟

✍ ہاں ہاں بھئی بڑھیا کی جگہ سنبھال لو جا کر بے چاری تھک گئی ہوگی۔

عظیم انصاری۔ گجرات

☺ زین جی گوشت کے ساتھ محاورہ بلی والا سنتے آئے ہیں۔ اب لگتا ہے انسانوں کو بھی خواب میں......؟

✍ انسانوں کو تو ہمیشہ ہی سے اچھا اچھا سوجھتا ہے وہ تو خیالی پلاؤ پکانے اور کھلانے میں اور سبز باغات کی سیر کروانے میں ماہر ہیں۔

منیب الرحمن۔ خانیوال

☺ زین بھیا! عورت اور مرد میں جھوٹ زیادہ کون بولتا ہے؟

✍ خواتین!! کیوں کہ ان کی تعداد 52 فیصد ہے۔

نور افگن۔ لاہور

☺ زین جی! دنیا کریلے کی طرح کڑوی اور املی کی طرح کھٹی کیوں ہے؟

✍ آپ کو شاید یہی دو ذائقے چکھنے کے لیے ملے ہیں جب ہی کہہ رہی ہیں۔

حفصہ۔ ملتان

☺ زین بھیا! اس شعر کا جواب شعر میں دیں۔

ٹوئنکل ٹوئنکل لٹل اسٹار

ہاؤ آئی ونڈر واٹ یو آر

✍ اب تم بڑی ہوگئی ہو۔ نرسری رائمز پڑھنا چھوڑ کر

گھر کے کام سنبھالو۔

عائشہ۔ پتوکی

☺ چوٹ لگتی ہے تو درد کیوں ہوتا ہے۔ سکون کیوں نہیں ملتا؟

✍ ارے ہر دفعہ ایسا نہیں ہوتا۔ کیا آپ نے وہ شعر نہیں سنا۔

رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں

گل رعنا۔ اورنگی ٹاؤن

☺ باغ کا پتا پتا، بوٹا بوٹا حال ہمارا جانے ہے۔ جانے نہ جانے وہ ہی نہ جانے۔ بتایئے کون؟

✍ ...... وہی ...... جس کو آپ وہ کہتی ہیں۔

اللہ رکھی۔ پڈعیدن

☺ زین بھیا! میں اکثر سوچتی ہوں اگر میں پاکستان کی صدر بن جاؤں تو......؟

✍ پہلے ہی زندگی میں کم عذاب ہیں جو صدر بننا چاہ رہی ہو۔

فاخرہ بتول۔ سکھر

☺ زین جی! ایک عورت اگر اکیلی ہو تو چپ رہ سکتی ہے اگر دو عورتیں ہو تو چپ کیوں نہیں رہ سکتیں بتایئے بھلا کیوں؟

✍ نہ بولنے کی صورت میں دوسری گونگی جو کہلائے گی۔

اُم حبیبہ۔ اسلام آباد

☺: زین بھیا! اگر آپ سے کوئی کہے کہ چوبیس گھنٹے ایک ٹانگ پر کھڑے رہیں تو؟

✍: کیا پچیسویں گھنٹے پر تم انجام دیکھنے آؤ گی۔

انجلی۔ کراچی

☺: زین بھیا! راس آتی نہیں تنہائی بھی
اور ہر شخص سے بے زار بھی ہیں

بتاؤ کیا کروں؟

✍: بس ہماری طرح خوش رہو۔

سمیعہ فاطمہ۔ کھوکھراپار

☺: زین جی! رخصتی کے دلہن کی سہیلیاں اسے آنسوؤں کے ساتھ رخصت کرتی ہیں، دولہا کے دوست اس وقت کیا کرتے ہیں؟

✍: کھانا کھاتے ہوئے انہیں کچھ کرنے کی فرصت نہیں ہوتی۔

سین۔ چیچہ وطنی

☺: زین بھیا! سنا ہے آپ روتے بہت ہیں؟

✍: جی نہیں، غلط سنا ہے۔ بس سوتے بہت ہیں

کمال دین۔ عارف والا

☺: زین جی آپ نے کبھی رشوت لی ہے؟

✍: یہ کیا ہوتی ہے۔ ☆☆

یہ ہمارا مقابلہ

کوپن برائے

اپریل 2015ء

نام: ____________________

پتا: ____________________

رضیہ سجاد ظہیر

جلّو خالہ

جلّو خالہ کے سے دانت میں نے کسی عورت کے نہیں دیکھے۔ مسی سے بھرے رنگوں کے بیچ ایسے چمکتے تھے جیسے اودے بادلوں میں کوندا لپکے۔ ان کا سارا وجود ہنستا تھا۔ ماتھے کے نیچے بڑی بڑی آنکھوں میں ہنسی کی شبنم' چھوٹی سی پتلی ناک' ہنستے وقت......

ایک ایسی تحریر جو آپ کو مسکرانے پر مجبور کردے

میں اپنے رشتے کی جن خالہ کا حال آپ کو بتانے والی ہوں' ان کو سب جلّو کہتے تھے' ویسے ان کا اصلی نام جلیل فاطمہ تھا مگر میں آپ کو یہ نہیں بتا سکتی کہ وہ جلیل فاطمہ سے جلّو کب ہوئیں؟ ظاہر ہے' بچپن میں ہوئی ہوں گی اور ان دنوں میرا وجود کہاں تھا' البتہ جب میں نے ان کو دیکھا تو بڑے سب ان کو جلّو کہتے تھے اور چھوٹے اس میں خالہ' ممانی یا چچی وغیرہ کا دم چھلا بھی لگا دیتے تھے۔

کچھ کردار ایسے ہوتے ہیں جنہیں ہم اپنے بچپن میں دیکھتے ہیں اور پھر کبھی بھول نہیں پاتے' زمانے کی تہیں جمتی جاتی ہیں' وقت کی دھول پڑتی جاتی ہے' عمر کی دھند گہری ہوتی جاتی ہے مگر ان کے متعلق جب بھی سوچیے تو ان کی تصویر پہلے سے زیادہ صاف اور ان کی شخصیت کی لکیریں اور بھی زیادہ روشن محسوس ہوتی ہیں اور اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ ان کرداروں میں کوئی ایسی بات ہوتی ہے جو ان کو ہزاروں دوسرے کرداروں سے ممتاز کر دیتی ہے۔

اب میری عمر یا دن' ترپن سال کی ہو رہی ہے مگر میں نے اپنی زندگی میں اس طرح ہنسنے والا کردار نہیں دیکھا جیسے جلّو خالہ تھیں۔ موقع بے موقع جب دیکھو ٹھٹھے لگ رہے ہیں۔ خود ہنس رہی ہیں' اوروں کو ہنسا رہی ہیں۔ جب کوئی ان کو ٹوکتا تو کہتیں۔ "اب کیا کروں بھنو! میرے بس کی بات نہ ہے' ہنسی نگوڑی چلی آوے ہے۔"

ان کا یہ جملہ اتنا مشہور ہو گیا تھا کہ بچے ان کو دور سے آتا دیکھ کر پکارتے۔

"جلّو خالہ......جلّو آپا......! نگوڑی چلی آوے ہے۔"

وہ ہنستی ہوئی بچوں کے پیچھے بھاگتیں۔

"دیکھ لے اختری! بھنو تیرے لونڈے نہ مانتے' ایک سے ایک شیطان کا پوت......"

میں جب چھوٹی سی تھی تو ایک بار میں نے اپنی اماں سے پوچھا کہ جلّو خالہ کے میاں کہاں ہیں؟ کیونکہ میاں قسم کی کوئی چیز کبھی ان کے پاس نہیں دکھائی دیتی تھی۔ میری اماں ہنسنے لگیں' پھر میں نے بڑی خالہ سے پوچھا' وہ بھی ہنسنے لگیں۔ چھوٹی مامی نے بھی میرا سوال سن کر ایک قہقہہ لگایا۔ شام کو جلّو خالہ کسی کام سے آئیں تو بڑی خالہ بولیں۔

"ارے جلّو! افن کی دھی پوچھے تھی' تمہارے میاں کاں ہیں؟"

جلّو خالہ نے آنکھ دبا کر میری طرف دیکھا پھر اپنی پیٹھ پر لٹکی ہوئی لمبی ناگن ایسی چوٹی کا جوڑا لپیٹتے ہوئے بولیں۔

"پورا قصہ سنے گی؟" جوڑا بنا کے انہوں نے میری بانہہ پکڑی اور جس پلنگ پر بیٹھی تھیں' اسی کی ادوائن پر مجھے بٹھاتے ہوئے کہا۔

"یہاں بیٹھ' تجھے پورا قصہ سناؤں۔ گرمی کے دن تھے' صبح ہی صبح کمری پہن' دھوتی باندھ کھیت پر گیا۔"

"کون جلو خالہ؟" میں نے پوچھا۔

"ارے وہی تیرا خالو اور کون؟ ململ کا کرتا اتار کر کیل میں کوتا ٹنگ گیا' ہواں سے شام کو آیا' اچھے خاصے نہا دھو کے پجامہ پہن کے نکلا' میں ہوئیں آنگن میں پیڑھی پر بیٹھی روٹی پکاؤں تھی' گرمی کے مارے باہر اینٹوں کا چولہا بنا لیا تھا تو بھنو! میں نے کہیا بھی کہ گرم گرم روٹی ہے گی' کھالیو' بولا ابھی نہ کھانے کا ہوں' میرا کرتا لا کے دے' میں کنوئیں پر جارہا ہوں پنچایت سننے۔"

"پنچایت کس کی تھی جلو؟ مجھے یاد نہ رہا۔" بڑی خالہ آلو چھیلتے ہوئے بولیں۔

"اے وہی' شبراتی کی لونڈیا نہ بھاگ گئی تھی۔ فضلو دادے کے ہیاں جو ملوایا تھا' اس کے ساتھ۔ کیا کچھ بھلا سا نام تھا دین پہ۔"

"وہی تھا کرم دین۔" میری اماں نے بتایا۔

"ارے ہاں ہاں' کرم دین...... تو بس بٹی! میں نے کرتا لا کے اس کو پکڑا دیا پھر پیڑھی پر آ بیٹھی اور اتے لوئی بنا کے چنگیر بناؤں تھی کہ کیا دیکھوں ہوں کہ مردوا آنگن بھر میں ناچتا پھر رہا ہے' ایسا ایسا اچھل رہا کہ جیسے وہ سرکس میں جوکر اچھلے ہے نا اور میں کم بخت ہنسنے لگی' بس اور لگا چیخنے۔"

"پر ہوا کیا تھا جلو خالہ......؟"

"ارے بٹی! گرمیاں آ چلی تھیں نا تو گرمیوں میں ہی تو گے بھڑیں اپنا چھتہ بنانے یاری باری پھریں ہیں تو اس کرتے میں کہیں ایک بھڑ بیٹھی تھی میرے نصیب کی' اب ان نے نہ دیکھا نہ بھالا' چٹ کرتا گلے میں ڈال لیا تو وہ کاٹے ہی کاٹے' وہ پھنس گئی اس میں اور وہ اسے اتارے نہ' بس کودے اچھلے اور مجھے گالیاں دے اور......"

"اور تم ہنسو...... ایں؟" اماں نے لقمہ دیا۔

"تو بھنو! اب تو ہی انصاف سے بتا' ہنسی نگوڑی تو چلی ہی آوے ہے' جب آنگن بھر میں کوئی ناچتا پھرے گا تو ہنسی نہ آوے گی۔ وہ تو خیر ہوئی جو چولہے میں نہ جا پڑا' پھر اسی بات پر ان نے مجھے طلاق دے دی' ویسے کیا پڑھی نہ ہوں' میں نے کیا' مجھے لکھا پڑھی سے کچھ نہ لینا' کیا تجھ سے مہر مانگنا ہے' مجھے کہ دوسرا خصم کرنا ہے' سو گے ہوا۔" پھر میری پیٹھ پر دھپ مار کے بولیں۔

"وہ ہے گا اب تک دوسری شادی بھی ان نے نہ کی' داڑھی رکھ لی' مولوی ہو گیا۔ رات دن نمازیں پڑھے ہے۔ یہاں تیرے نانا کی مسجد میں تو آوے ہے روز' دیکھ لیجیو کسی روز۔"

"واہ جلو آپا...... اے بھلا ساتھ رہتیں تو دو ایک بال بچے ہی ہو جاتے۔" میری اماں بولیں۔

وہ سنجیدہ منہ بنا کے بولیں۔

"ہی تو شکر ہوا بھنو! دیکھوں ہوں نا کہ اچھی خاصی بجلی پاری لونڈیں اور آج کو شادی ہوئی اور کل کو مہترانی بن گئیں' ساری جوانی پوتڑے دھوتے گزر رہی ہے۔"

سب عورتیں قہقہہ مار کر ہنسنے لگیں۔

☆......☆

جلو خالہ کے سے دانت میں نے کسی عورت کے نہیں دیکھے۔ مسی سے بھرے ریخوں کے بیچ ایسے چمکتے تھے جیسے اودے بادلوں میں کوندا لپکے۔ ان کا سارا وجود ہنستا تھا۔ ماتھے کے نیچے بڑی بڑی آنکھوں میں ہنسی کی شبنم' چھوٹی سی پتلی ناک' ہنستے وقت بانسے کے قریب دونوں طرف سے سکڑ جاتی جیسے ادھ کھلی کلی' چھوٹے چھوٹے ہاتھ اکثر منہ کو ڈھانپ لیتے' پتلی پتلی انگلیوں کی درازوں میں سے ہنسی کی لہریں باہر گرتی ہوئی محسوس ہوتیں۔ کانوں میں پڑے ہوئے بالی پتے ہلکورے لے کر رخساروں کے گڑھوں کو گدگداتے...... اور دلکشی کا یہ عالم اس وقت تھا جب عمر چالیس کو چھو رہی تھی۔ سوچ لیجیے جوانی میں کیا روپ رہا ہوگا۔

وہ ہر بیاہ' ہر محفل' ہر جمگھٹ کی رونق ہوا کرتی تھیں۔ لڑکی کی رخصتی ہے' بابل گایا جارہا ہے' سسرال والے تک رو رہے ہیں' میکے والوں کا تو پوچھنا ہی کیا' جلو خالہ تھوڑی دیر ضبط کریں گی پھر کوئی اشغلر چھوڑیں گی۔

"اے لوگو! ذرا کوئی باہر جا کر دولہا کو تو دیکھو' کانا تو نہ ہے کبھی سہرے میں کسی کو نظر نہ آیا ہو' آخر یہ کاہے کا رونا ہو رہا ہے؟"

کوئی ہنستا' کوئی ان کو کوستا' کوئی بڑا بوڑھا ڈانٹتا' بچے کھلکھلاتے' بہرحال موڈ سب کا بدل جاتا۔

محرم کے زمانے میں بھی ان کا یہی حال رہتا تھا۔ کمال تو اس وقت کرتی تھیں جب کسی مجلس میں ان کو بیچ رونا نہ آتا اور دوپٹہ منہ پر رکھ کر اس غضب کی ایکٹنگ کرتیں کہ سب دنگ رہ جاتے مگر ہماری نانی کو اس وقت ان پر واقعی

غصہ آ جاتا۔ چپکے سے کہتیں۔

"اے ہٹاؤ' کوئی اس اللہ ماری کو مجلس کی رقت بگاڑ رہی ہے گی۔"

جلو خالہ چپکے سے اٹھ کر کھسک لیتیں۔

☆......☆

ہماری ایک رشتے کی نانی بہری تھیں' بالکل بہری' عمر بھی ان کی بہت تھی۔ ان کا نام حسینن تھا اور عالم ان کا یہ تھا کہ چونکہ وہ کچھ سنتی نہیں تھیں اس لیے دیکھتی رہتی تھیں کہ پڑھنے والی کا منہ کب کھلتا ہے۔ ادھر مرثیہ خواں نے ہونٹ کھولے اور ادھر انہوں نے رونا شروع کر دیا۔ اس سے بحث نہیں کہ فضائل ہو رہے ہیں کہ مصائب' رباعی کہ منقبت۔

جلو خالہ ان کو خوب آڑے ہاتھوں لیا کرتیں۔

"مت اترا بہت سا جلو' میں کیا سدا کی بہری ہوں' کبھی ستوں نہ تھی۔ مجھ بڑی ٹھنڈی سے مذاق کرے ہے۔ خدا سمجھے' جناب امیر کی مار پڑے۔"

مگر جلو خالہ کو تو ایسی بوڑھیوں کی گالیاں سننے میں بڑا مزہ آتا تھا۔ وہ ڈٹی رہتیں۔

"تو کیا اگلا پچھلا سب سنا ہوا یاد کر کے رو رہی ہو؟"

پھر ہماری نانی ان کو آنکھیں دکھاتیں' ان کا وہ بہت رعب مانتی تھیں۔

جلو خالہ میں ایک خاص بات یہ تھی کہ مردوں کے سامنے کبھی نہیں ہنستی تھیں۔ اس زمانے میں باہر کے مرد تو آتے ہی نہیں تھے' سخت پردہ ہوتا تھا اس لیے غیر مردوں کے سامنے ہنسنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا مگر خاندان کے مردوں میں سے کسی نے گھر میں قدم رکھا کہ جلو خالہ کے منہ پر مہر لگ گئی۔ ایسی چپکی ہو جاتیں کہ جیسے کوئی ان سے بولے گا تو کاٹ ہی کھائیں گی' کہتیں۔

"اے میں مردوں کو منہ نہ لگاتی' ذرا ان سے ہنس کر بولا کوئی کہ اپنے کو جنے کیا سمجھنے لگے ہیں گلفام اور سوچیں ہیں ہمیشہ اپنے مطلب کی؟ ہیں مردئے میں سب جانوں ہوں۔"

جلو خالہ کی زندگی میں کیا تھا' ایک اکیلی کوٹھری' اس کے آگے ذرا سا آنگن' یہ گھر انہیں اپنی ماں کی طرف سے ملا تھا' تھوڑی سی زمین تھی جس سے ان کو بس کھانے بھر کے گیہوں اور دانے مل جاتے تھے۔ خاندان کا کارندہ جب سب کا اناج لاتا تو ان کا بھی تلوا لاتا' کبھی کبھی وہ میری نانی سے اس کی شکایت کرتیں۔

"سیدہ خالہ! اس اللہ مارے بفاتی سے بس اتا کہہ دیتیں کہ بھیے' میرے حصے کے گیہوں میں کنکر ملائیو تو ذرا بڑے بڑے ملائیو' چھوٹے چھوٹے کنکر بینتے بینتے تو مجھ دکھیا کا ناک میں دم آ جاوے ہے۔"

کنبے کے چھوٹے موٹے کام کر کے وہ کچھ پیسے بھی کما لیتی تھیں' کسی کا جہیز ٹانک دیا' کسی کے لیے چکی میں دلیہ بنا دیا' کسی کا کرتا کاڑھ دیا' گاجر کا حلوہ پکا دیا' دوپٹے رنگ چن دیے۔ اسی سے وہ چراغ کا اور سر کا تیل' دیا سلائی' گڑ خریدتیں' پان اور چوڑیوں کا خرچ پورا کرتیں' مجلس میں تبرک بانٹتیں' کپڑے وہ خود کبھی نہیں بناتی تھیں۔ ان کی کوٹھری میں زیادہ تر تالا پڑا رہتا تھا' لوگ ان کی خوش دلی کی بدولت ان کو اپنے اپنے گھر گھسیٹ کر لے جاتے' مہینوں مہمان رکھتے' کپڑا لتا بھی بناتے اور ضرورتیں بھی پوری کرتے۔ ضرور تیں کیا تھیں' گنتی کے حساب سے پیسوں آنوں کے اندر اندر......

اب میں کبھی جلو خالہ کو یاد کرتی ہوں تو مجھے خیال آتا ہے کہ ہمارے ادب میں آج کل ایک لفظ کا بہت فیشن ہو گیا ہے۔ فرسٹریشن' دھڑا دھڑ ایسے کردار پیش کیے جا رہے ہیں جو فرسٹریٹڈ ہیں اور اپنی محرومیوں کی بدولت اپنی اور دنیا کی جان ایک کیے ہوئے ہیں۔ کیا جلو خالہ کی زندگی میں آسودگی تھی؟ یقیناً نہیں تھی پھر کیا وجہ تھی کہ ان کے منہ سے ہمیشہ یہی سنائی دیا کرتا تھا کہ ہنسی نگوڑی چلی آوے ہے۔

جلو خالہ کی عمر بڑی لمبی ہوئی' ابھی حال ہی میں ان کا انتقال ہوا اور جب میں نے ان کے متعلق یہ سطریں لکھنی شروع کیں تو مجھے سلاواکیہ کے ایک شہید انقلاب کا آخری خط یاد آیا۔ اس نے اپنے لیے پھانسی کا حکم جاری ہونے کے بعد اپنی بیوی کو یوں لکھا تھا۔

"تم میرا سوگ نہ منانا' میری یاد کو غم سے آلودہ نہ کرنا' تم میرے لیے آنسو نہ بہانا کیونکہ میں خوشی کے لیے جیا تھا۔ میری زندگی میں وہ کچھ نہیں تھا جسے لوگ عیش کہتے تھے پھر بھی میں ہنستا تھا' اس لیے کہ میں چاہتا تھا کہ لوگ میرے ساتھ ہنسیں۔ میرا گناہ یہی تھا کہ میں سب کو خوش دیکھنا چاہتا تھا' میں چاہتا تھا کہ میں ہنسوں تو اس دکھ بھری دنیا کا غم تھوڑی دیر کو ہی' کچھ کم ہو جائے۔"

☆☆☆

لولی وڈ بولی وڈ

ڈی۔ خان

نصیرالدین شاہ ان کراچی

بولی وڈ کے لیجنڈ اداکار نصیرالدین شاہ ان دنوں پاکستان کے دورے پر ہیں۔ لاہور ادبی میلے میں شرکت کے بعد وہ کراچی پہنچے۔ آرٹس کونسل پاکستان کی جانب سے ایک تھیٹر ورک شاپ کا انعقاد کیا گیا جس میں نصیرالدین شامل تھے۔ نصیرالدین نے اس موقع پر کہا کہ تھیٹر لوگوں کے رابطے کا ذریعہ ہے جو کبھی بھی ختم نہیں ہوسکتا۔'' اس موقع پر آرٹس کونسل کی طرف سے انہیں تاحیات آرٹس کونسل کی ممبر شپ دینے کا اعلان بھی کیا گیا۔

خانز۔ بی جے پی کے عتاب میں

بھارتی حکمران جماعت BJP نے اپنی تنگ نظری کی جرچا کرنا شروع کر دی ہے۔ انڈین سینما کے سب سے زیادہ بکنے والے اداکار مسلمان ہیں۔ عامر، سلمان اور شاہ رخ انڈین سینما کے ستون ہیں۔ ان کی شہرت سے خائف ہو کر متنازع BJP خاتون رہنما سادھوی پراچی نے کہا ہے کہ ہندوؤں کو تینوں خانز کی فلموں کا بائیکاٹ کر دینا چاہیے اور اپنے گھر کی دیواروں سے ان اداکاروں کی تصویروں کو ہٹا دینا چاہیے کیوں کہ بچے ان خانز کی فلموں سے غلط چیزیں سیکھ رہے ہیں۔ اس بیان سے سادھوی کو کچھ دن خبروں میں رہ کر شہرت تو مل سکتی ہے مگر سادھوی خانز کا بال بھی بیکا نہیں کر سکتی۔

روینہ ٹنڈن بے نظیر کے روپ میں

پچھلے ماہ ہم نے آپ کو خبر دی تھی کہ ودیا بالن کو بے نظیر بھٹو کا کردار ادا کرنے کی آفر کی گئی ہے جسے انہوں نے قبول بھی کر لیا ہے مگر لگتا ہے بات بنی نہیں

سونم کے اسپتال منتقل ہونے کے بعد فی الحال فلم کی شوٹنگ رُک گئی ہے۔

اس لیے عرصہ دراز بعد پھر سے سلور اسکرین پر بے نظیر بھٹو جیسے مضبوط کردار کے ذریعے روینہ ٹنڈن کی کم بیک انٹری ہو رہی ہے روینہ بولی وڈ کی نیشنل ایوارڈ یافتہ اداکارہ ہیں امید ہے یہ کردار وہ اپنی اداکاری سے امر کر دیں گی۔

پریانکا 2015 کی خوبصورت ترین اداکارہ

بولی وڈ پریانکا چوپڑا کو بھارت میں کیے گئے ایک عوامی سروے میں لوگوں نے سب سے زیادہ پرکشش اور حسین ترین اداکارہ قرار دیا ہے۔ اس سروے کے مطابق دوسرے نمبر پر دیپیکا پڈوکون، تیسرے نمبر پر سونم کپور، چوتھے نمبر پر شردھا کپور اور پانچویں نمبر پر کنگنا رناوت قرار پائی ہیں۔ واضح رہے پریانکا نے 2000ء میں عالمی ملکہ حسن کا تاج اپنے نام کیا تھا۔

سونم کپور کے بعد سلیمان خان کو بھی سوائن فلو

بولی وڈ کے دبنگ خان نے سونم کپور میں سوائن فلو کی تصدیق کے بعد خود بھی سوائن فلو کا ٹیسٹ کرانے کا فیصلہ کیا ہے۔ یاد رہے کہ دونوں اداکاران دنوں اپنی فلم 'پریم رتن' کی شوٹنگ میں مصروف تھے۔

ملیکہ شرافت

لیجیے ساتھیو! ایک چٹ پٹی خبر، مرڈر سے دلوں کو گھائل کرتی ملیکہ شراوت نے نئی آنے والی فلم ڈرٹی پالیٹکس میں ساتھ کام کرنے والے ورا سٹائل اوم پوری نے کہا ہے ملیکہ شراوت کے ساتھ مذکورہ فلم میں کام کرنے کے بعد ان کے خیالات بدل گئے ہیں حالانکہ انہوں نے ملکہ کے بارے میں بہت کچھ سن رکھا تھا۔ ملیکہ ایک انتہائی معصوم اور سادہ لڑکی ہے اس کا نام ملیکہ شراوت کے بجائے ملیکہ شرافت ہونا چاہیے تھا۔
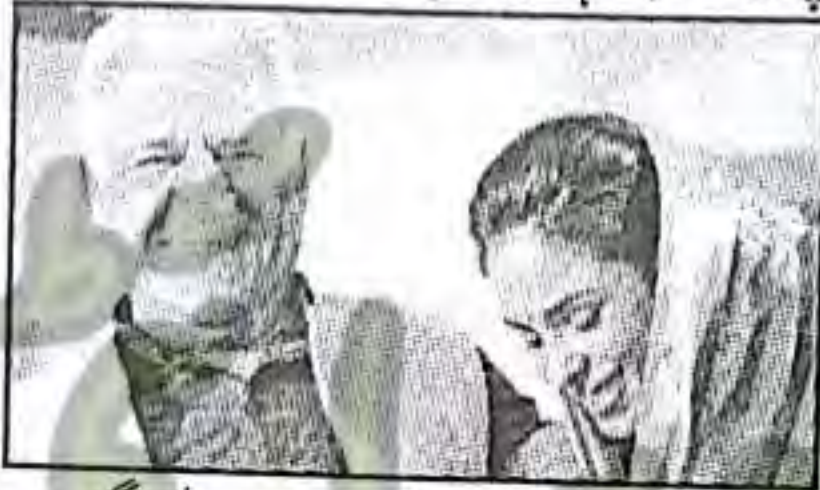
انوشکا شرما کی 'این ایچ ٹین'

بولی وڈ سپر اسٹار انوشکا شرما کی تازہ ترین فلم 'این ایچ ٹین' کی ریلیز کو مؤخر کر دیا گیا ہے بھارتی سنسر بورڈ نے فلم کے چند ڈائیلاگز پر بہت اعتراض

اٹھایا ہے۔ جس پر انہیں فوری طور پر فلم سے نکال لینے پر غور کیا جارہا ہے۔ اس فلم کے چند سین بھی سنسر کی قینچی کی زد میں آئے ہیں۔ مذکورہ فلم ایک تھرلر، کرائم ڈرامہ ثابت ہوچلے۔

نام قائم رکھنا، بہت مشکل

بولی وڈ کی جیکولین فرنینڈس نے اس بات کا برملا اظہار کیا ہے کہ فلم انڈسٹری میں بقا بہت مشکل کام ہے۔ اعتماد یا ثابت قدمی دو اہم عناصر ہیں جو فلم انڈسٹری میں بقا مدد دیتے ہیں۔ فلم انڈسٹری میں آنا میرا اپنا انتخاب تھا اور میں اپنے کام میں نکھار پیدا کرنے کے لیے محنت کر رہی ہوں کیوں کہ میرے لیے سب سے اہم چیز میرا کیریئر ہے۔ اسی پر میری تمام تر توجہ مرکوز ہے۔ جیکولین کی تازہ ترین ریلیز ہونے والی فلم رائے ہے، جس میں شائقین نے ان کے کردار کو بہت پسند کیا ہے۔

پرینیتی چوپڑا فارغ

پرینیتی چوپڑا دعوتِ عشق اور کل دل کی ناکامی کے بعد فی الحال فارغ ہیں اور اس فراغت کے دنوں میں ان کا مشغلہ صرف فلم بینی رہ گیا ہے۔ ایک ہفتہ کے دوران پرینیتی نے نو فلمیں دیکھ ڈالیں۔ جن میں ان کی اپنی فلمیں بھی شامل تھیں۔

ہم شکلز، بدشکلز فلم کی کیٹگری میں فٹ

2014ء میں ساجد خان کی ہدایتکاری میں بننے والی فلم ہم شکلز کو بدشکلز، سوری بدترین فلم کیٹگری میں شامل کرلیا گیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی اجے دیوگن کی ایکشن جیکسن فلمیں بھی سی کیٹگری میں شامل ہے۔

راک آن 2

تقریباً سات برس قبل فرحان اختر کی فلم راک آن نے ٹھیک ٹھاک بزنس کر کے بطور پروڈیوسر فرحان اختر اور رتیش کا حوصلہ بڑھایا تھا۔ اس فلم کے سیکوئل کی تیاریاں شروع ہورہی ہیں۔ پارٹ ٹو میں فرحان کے ساتھ ارجن رام پال اور پراچی ڈیسائی تو ہوں گے ہی مگر شردھا کپور بھی ان کے ساتھ جلوہ گر ہوں گی۔ یاد رہے اس کردار کے لیے پہلے عالیہ بھٹ کو کاسٹ کیا گیا تھا۔

سیف خان اور کنگنا ایک ساتھ

نواب خان اور ریوالور رانی ریما کگادی کی اس لو اسٹوری فلم میں کام کررہے ہیں۔ جاپانی ناول سے ماخوذ اس فلم کو کچھ عرصہ قبل سیف نے پروڈیوسر سے اختلافات کے باعث چھوڑا تھا۔ مگر اب پھر سے آمد

یہ بتاتی ہے کہ فلم واقعی خاص ہے۔ کہانی مختصراً یہ ہے کہ کنگنا اپنے سابق شوہر کو قتل کر دیتی ہے اور اس قتل کی تحقیقات سیف علی خان کرتے ہیں۔ اپریل سے شوٹ پر جانے والی فلم کو تا حال کوئی نام نہیں دیا جا سکا ہے۔

یوراج سنگھ سے کوئی تعلق نہیں

بولی وڈ کی ڈمپل گرل۔ پریتی زینٹا اسکرین سے بھلے ہی غائب ہیں لیکن خبروں میں ان ہیں۔ بھارتی کھلاڑی یوراج سنگھ کے ساتھ ان کا نام بار بار لیا جا رہا ہے۔ پریتی ان خبروں کی تردید کرتے کرتے تھک چکی ہیں۔ پریتی نے تازہ ترین ٹوئٹ پر لکھا ہے کہ۔ پلیز یہ لکھنا بند کر دیں کہ میرے اور یوراج کے ایک دوسرے سے تعلقات تھے۔" واضح رہے یوراج سنگھ آئی پی ایل میں پریٹی زینٹا کی ٹیم کنگز الیون کا حصہ رہ چکے ہیں۔ پریتی سے قبل بھی یوراج کا نام متعدد اداکاراؤں کے ساتھ آ چکا ہے۔ اب بتائیں بھلا یہ پریتی کے ٹوئٹ کو کس حد تک سچ مانا جائے؟؟

اب تک چھپن 2

نانا پاٹیکر اب تک چھپن کی شاندار کامیابی کے بعد اب تک چھپن کا سیکوئل 27 فروری کو ریلیز ہوگا۔ اس فلم میں نانا انڈر ورلڈ سے برسرپیکار ایک ریٹائرڈ پولیس آفیسر کا کردار نبھا رہے ہیں۔ یہ فلم ہندوستان میں کرپشن اور سیاست پر مبنی ہے۔ جسے لوگوں نے پذیرائی بخشی ہے۔

ایئر لفٹ میں نمرت کپور

بولی وڈ کی نئی اداکارہ نمرت کپور آنے والی فلم ایئر لفٹ کا آغاز کر دیا گیا ہے۔ فلم میں ان کے مدمقابل اکشے کمار ہیں۔ جب کہ ہدایت کاری راجہ کرشنا مینن کی ہیں اب دیکھتے ہیں۔ ایئر لفٹ نمرت کپور کو کتنا اوپر تک لے کر جاتی ہے۔

شارخ خان پنجاب ایکسپریس میں

چنائی ایکسپریس کے بعد روہیت شیٹھی شاہ رخ کو لے کر پنجاب ایکسپریس شروع کر رہے ہیں۔ چنائی ایکسپریس 2013 میں بلاک بسٹر فلم ثابت ہوئی تھی۔ اب دیکھتے ہیں پنجاب ایکسپریس کیا دھمال ڈالتی ہے۔ فی الحال شاہ رخ کے علاوہ فلم کی کاسٹ فائنل نہیں کی گئی ہے۔

نفسیاتی اُلجھنیں اور اُن کا حل

مختار بانو طاہرہ

زندگی اپنے ساتھ جہاں بہت ساری خوشیاں لے کر آتی ہے وہیں بہت سارے ایسے مسائل بھی جنم لیتے ہیں جو اس زندگی کو مشکلات کے شکنجے میں جکڑ لیتے ہیں ان میں سے بیشتر الجھنیں انسان کی نفسیات سے جڑی ہوتی ہیں اور انہیں انسان از خود حل کر سکتا ہے۔ یہ سلسلہ بھی اُن ہی الجھنوں کو سلجھانے کی ایک کڑی ہے۔ اپنے مسائل لکھ بھیجیں، ہماری کوشش ہوگی کہ آپ ان مسائل سے چھٹکارہ پالیں۔

ابوحذیفہ۔ اسلام آباد

✪ باجی میں ان دنوں ایک بہت پیچیدہ مسئلے میں گرفتار ہوں۔ مختصر بات یہ ہے کہ میرے دوست کی بہن کو طلاق ہو چکی ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ اب اس کی بہن کی شادی کسی اچھے لڑکے سے ہو جائے۔ میں نے گھر میں ذکر کیا مگر کسی نے کوئی توجہ نہ دی۔ اتفاق سے میری ملاقات اس لڑکے سے ہوگئی جس نے اسے طلاق دی تھی۔ میں نے وجہ پوچھی تو وہ کہنے لگا لڑکی نفسیاتی مریضہ ہے۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر بے ہوش ہو جاتی ہے۔ اس لیے میرے گھر والوں نے کہا اسے چھوڑ دو۔ میں نے ایسا ہی کیا۔ اب سوچتا ہوں وہ بری نہیں تھی۔ میں نے اس کو چھوڑ کر اچھا نہیں کیا۔ باتوں باتوں میں وہ میرا دوست بن گیا مگر میں نے پہلے والے دوست کو کچھ نہیں بتایا۔ اب سوچ رہا ہوں اگر وہ میرے گھر آ کر بھی اسی طرح بے ہوش ہوئی تو میرے گھر والے بھی ناراض ہوں گے۔ کہیں میں اس سے شادی کر کے نا پچھتاؤں اور ویسے بھی گھر والے ایک طلاق یافتہ لڑکی کو قبول نہ کریں گے۔

☆ شادی کے بعد زندگی بھر کا ساتھ ہوتا ہے۔ یہ فیصلہ کہ کس سے شادی کی جائے، کسی پر ترس کھا کر نہیں کیا جاتا بلکہ دل میں خوشی شامل ہونا ضروری ہے۔ اگر آپ نے لڑکی کو دیکھا ہے، تو اس کے حوالے سے فیصلہ کرنا زیادہ آسان ہوگا۔ یہ بھی خیال رکھیں کہ اگر لڑکی کے حوالے سے کسی طرح منفی انداز میں سوچ رہے ہیں تو اس وقت تک اس کے حق میں گھر والوں سے بات نہیں کرنی چاہیے۔ جب تک سوچ مثبت نہ ہو۔ مثلاً اس کی بے ہوشی کے حوالے سے صحیح معلومات ہوں، لیکن پچھتاوے کا خوف ہے تو اس کو اپنانے کے بارے میں نہ سوچیں۔

سید شعبان رشید۔ کراچی

✪ باجی مجھے اتنی عقل آ گئی ہے کہ میرے والد جن لوگوں سے ملتے جلتے ہیں وہ اچھے لوگ نہیں۔ ایک دفعہ انہوں نے والد کو جیل بھجوانے کا کام کر لیا تھا۔ مگر چچا نے سب معاملات سنبھال لیے۔ بہت ہی دکھی ہو جاتا ہوں، جب ان کے بارے میں سوچتا ہوں۔

☆ ہم سب لوگوں کی نظر میں والدین کا مقام بلند ہوتا ہے۔ ان کے حوالے سے برا خیال لانے کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا ہے۔ لیکن جب حقیقت کچھ اور ہو اور والدین ہمیں ایسی سرگرمیوں میں مبتلا نظر آئیں، جن سے وہ اپنی اولاد کو روکنا چاہتے ہوں اور جو اخلاقی طور پر خراب ہوں۔ اس وقت دل و دماغ کی حالت بہت عجیب ہو جاتی ہے۔ تب خود کو سمجھانا ناممکن نظر آتا ہے۔ ایسے موقع پر صرف اتنا سوچنے کی ضرورت ہے کہ والدین بھی عام انسان ہوتے ہیں۔ ایسا انسان جو کمزور ہے، اس سے غلطیاں سرزد ہو جاتی ہیں۔ کوشش کریں کہ آپ کا کچھ وقت اپنے والد کے ساتھ گزرے۔ اس دوران

ان لوگوں کو ناپسند کریں جوان کے ساتھ ہوتے ہیں۔ان سے دوری اختیار کرتے جائیں۔ایسا وقت بھی آئے گا جب والد ان لوگوں سے بیزار ہو جائیں گے اور اپنی غلطی محسوس کرلیں گے۔

صفیہ حسین۔ٹنڈو آدم

✿:ہم نے بہت مشکلات میں زندگی گزاری۔ شوہر اکثر بے روزگار رہتے، میں ہی ملازمت کرتی، صبح گھر سے نکل کر رات کو آتی۔اس دوران بچوں کا جو حال ہوتا، وہ بھی نا قابل بیان ہے۔ ہمارا حال دیکھ کر ایک رشتے دار نے انہیں اپنے ساتھ کاروبار میں لگالیا۔اب ان کی آمدنی بھی اچھی ہوگئی جس کی کوئی امید نہ تھی۔ مجھ سے کہتے ہیں تم گھر پر رہا کرو۔ مگر مجھے تو کام کرنے کی عادت ہوگئی ہے۔اس دوران یہ بات بھی سننے میں آئی ہے کہ ان کی کسی لڑکی سے دوستی ہوگئی۔ میں ڈرتی ہوں کہیں دوسری شادی نہ کرلیں، پھر تو میرا کوئی بھی نہ ہوگا۔ بچے پہلے کے مقابلے میں سمجھدار ہورہے ہیں۔ ان کے سامنے کوئی ایسی ویسی بات ہوتی ہے تو بہت محسوس کرتے ہیں۔

☆اپنے ذہنی سکون کی خاطر شوہر کی دوسری شادی کا خوف نہ کریں۔ کیونکہ ابھی انہوں نے ایسا نہیں کیا۔ وہ اس وقت صرف آپ کے ہمدرد ہیں، اسی لیے گھر پر رہنے کے بارے میں کہہ رہے ہیں۔ایک طرف آپ نے ملازمت کا بوجھ اٹھایا ہے تو دوسری طرف شوہر کی طرف سے بے اطمینانی کا احساس ہے۔ سنی سنائی باتوں پر توجہ نہ دیں تاکہ گھر میں اختلاف نہ ہو، بچے سمجھدار ہورہے ہیں، ان کے ذہنوں پر اختلافی باتیں برا اثر ڈالیں گی۔ اگر کوئی شخص دو شادیاں کرتا ہے اور وہ دونوں کے درمیان انصاف سے بھی کام لیتا ہے تو کیا وہ اس شخص سے بہتر نہیں جو سارا دن گھر میں رہے، کوئی کام نہ کرے اور اس کی بیوی سارا دن گھر سے باہر گزارے، ملازمت کا بوجھ اپنے کمر اور کندھوں پر ڈالے۔ آپ صرف اپنے حقوق کا تحفظ کریں، اپنے بچوں کے اخراجات کے حوالے سے سوچیں۔ یہ ساری ذمہ داریاں ڈالی جائیں گی اور انہیں معلوم ہوگا کہ آپ بھی اب مستقل گھر پر ہی ہونے کے ساتھ ان کے آرام وسکون کا مکمل خیال رکھتی ہیں تو پھر شاید ہی وہ کسی دوسری لڑکی یا عورت سے دوستی نبھا سکیں۔

ناز پروین۔اوکاڑہ

✿:میری بیٹی کی شادی ہوئی، ایک سال بعد بچی کی پیدائش ہوئی' اس کی بیٹی بہت خوبصورت، گوری اور نیلی آنکھوں والی تھی۔ میرے داماد نے میری بیٹی پر طرح طرح کے الزامات لگانے شروع کردیے۔ دراصل وہ سارے لوگ بہت سانولے اور بدصورت ہیں۔ شاید میں ان کے لیے ایسے الفاظ استعمال نہ کرتی مگر انہوں نے میری بیٹی کے ساتھ زیادتی کی، وہ بیمار رہنے لگی، مگر شوہر کا گھر نہ چھوڑا۔ اس کی بچی کو نمونیہ ہوگیا تو باپ اسپتال لے کر نہیں گیا۔ بچی دو ہفتے میں اللہ کو پیاری ہوگئی۔اس کے بعد سے بیٹی میرے گھر پر ہے، ہر وقت روتی ہے، بہت دبلی ہوگئی ہے۔ سسرال کے نام سے ڈرتی ہے، شوہر آتا ہے تو چھپ جاتی ہے۔وہ کہتا ہے کہ اگر گھر نہیں آؤ گی تو طلاق دے دوں گا۔

حـ:ایک ایسا شخص جس کے دل میں رحم نہ ہو جو اپنی اولاد کو اپنا ماننے پر تیار نہ ہو، بیوی کو طلاق کی دھمکی دے رہا ہو، کسی بھی طرح اس قابل نہیں کہ اس کے ساتھ ساری عمر گزاری جائے۔ آپ کی بیٹی کی ہمت تھی جو اتنا وقت بھی گزار لیا۔ آپ ہمت کریں اور انہیں بتادیں کہ تم ذہنی طور پر ٹھیک نہیں ہو۔ جب تک تم ٹھیک نہیں ہوجاتے ہم اپنی بیٹی کو نہیں بھیج سکتے۔ بیٹی کو اطمینان دلائیں کہ اس کے ساتھ زبردستی نہیں کی جائے گی۔ وہ نہیں جانا چاہتی تو نہ جائے، اسے اتنی ہمت دیں کہ وہ چھپنے کے بجائے مشکل حالات کا مقابلہ کرنے کے قابل بن جائے۔

☆☆☆

کچن کارنر

نادیہ طارق

قارئین! اس ماہ ہم آپ کے لیے کچھ ایسے منفرد اور لذیذ کھانوں کی ریسیپیز کچن کارنر میں لے کر حاضر ہوئے ہیں، جو آپ کو یقیناً نئے ذائقوں سے ہم کنار کریں گی۔ اُس ماہ کا کچن کارنر آپ کو کیسا لگا، آپ کی رائے کا انتظار رہے گا۔ اب ان ڈشز کو بنایئے اور اہلِ خانہ سے داد پایئے۔

ایزی چکن کڑاہی

اجزاء

تیل	حسبِ ضرورت
چکن	1 کلو
ٹماٹر	6عدد
پیاز	3عدد
لہسن، ادرک کا پیسٹ	1 کھانے کا چمچ
کالی مرچیں (پسی ہوئی)	آدھا چائے کا چمچ
ادرک (کٹا ہوا)، لال مرچیں	حسبِ ذائقہ
ہلدی، ہرا دھنیا	حسبِ ضرورت

ترکیب:

ایک کڑاہی میں گرم تیل کر کے کٹی ہوئی پیاز ڈال کر پیاز کو تھوڑا براؤن کرلیں پھر اس میں چکن شامل کر کے حسبِ ضرورت نمک ڈالیں اور جب چکن اچھی طرح گولڈن ہوجائے تو لہسن، ادرک کا پیسٹ، ہلدی اور لال مرچیں ڈال کر اس میں دہی شامل کریں اور ساتھ ہی ٹماٹر ڈال دیں۔ پھر اس میں چمچ چلائیں اور ڈھکن ڈھک دیں جب پانی خشک ہونے لگے تو پسی ہوئی کالی مرچیں ڈال دیں اور جب کڑاہی بھون جائے تو ادرک اور ہرے دھنیے کے ساتھ گارنش کریں۔

(یہ ترکیب صدف زہرا میتلو نے کراچی سے بھیجی ہے)

ہانڈی کوفتہ

اجزاء

قیمہ	آدھا کلو
نمک	1 چائے کا چمچہ
مرچ پاؤڈر	ڈیڑھ چائے کا چمچہ
پیاز پسی ہوئی	2عدد
لہسن پسا ہوا	آدھا چائے کا چمچہ
بھنا چنا پسا ہوا	2 کھانے کا چمچہ
گرم مسالا پاؤڈر	1 چائے کا چمچہ
جائفل جاوتری	1 چوتھائی چائے کا چمچہ
ادرک پسی ہوئی	ڈیڑھ چائے کا چمچہ
گھی	ایک کپ
خشخاش پسی ہوئی	2 کھانے کے چمچہ

ترکیب:

سارے مسالے نمک، لال مرچ، پیاز، ادرک، لہسن، خشخاش، بھنا چنا، گرم مسالا، جائفل جاوتری کو باریک پیس لیں۔ قیمہ بھی باریک کرلیں اور سب کو اچھی طرح مکس کر کے پھر ایک بار پیس لیں 12۔ عدد کوفتے بنالیں اور ہانڈی میں گھی گرم کریں۔ اس میں کوفتے ڈال دیں اور ہلکی آنچ تک آدھے گھنٹے تک پکائیں۔ تھوڑی دیر تک ہلاتے رہیں۔ تیار ہونے پر گرما گرم سرو کریں۔

چکن چنا پلاؤ

اجزاء

مرغی	آدھا کلو
سفید چنا	ایک پیالی
میٹھا سوڈا	1/4 چائے کا چمچہ
گھی یا آئل	ایک پیالی
نمک	حسب ذائقہ
ثابت گرم مسالا	1 کھانے کا چمچہ
پیاز	1 عدد
لہسن ادرک پیسٹ	2 کھانے کے چمچے
زردے کا رنگ	1/4 چائے کا چمچہ
یخنی کے لیے	
نمک	1 چائے کا چمچہ
پیاز ثابت	1 عدد
لہسن	10 سے 12 عدد
ثابت الائچی	4 سے 6 عدد
ثابت دھنیا، سونف	1-1 کھانے کا چمچہ
پانی	2 گلاس

ترکیب:

مرغی میں نمک پیاز، لہسن، سبز الائچی، سونف مکس گرم مسالے ثابت اور پانی ڈال کر یخنی تیار کر لیں۔ یخنی چھان لیں اور مرغی الگ کر لیں۔ دیگچی میں تیل گرم کریں، پیاز لائٹ براؤن کر لیں۔ پیاز لائٹ براؤن ہونے پر لہسن ادرک کا پیسٹ ڈال کر دو منٹ تک ہلکی آنچ پر بھون لیں۔ اب گرم مسالا نمک اور مرغی ڈال کر ایک منٹ تک تیز آنچ پر بھون لیں۔ اب چنے یخنی اور چاول دال کر پکنے کے لیے چھوڑ دیں۔ چاول کا پانی خشک ہونے پر دس منٹ کے لیے دم پر رکھ دیں۔ سلاد اور رائتے کے ساتھ سرو کریں۔

چکن کوکونٹ قورمہ

چکن، 8 ٹکڑے کرلیں	1 عدد
لیمن جوس اور نمک	1-1 چائے کا چمچہ
نمک	1 چائے کا چمچہ
پیاز باریک کٹی ہوئی	3 عدد
لونگ (پسی ہوئی)	2 عدد
کڑی پتا	حسب ضرورت
ناریل پانی سمیت، پسا ہوا	1 عدد

ترکیب:

چکن کو لیمن جوس اور نمک میں ڈال کر اس پر اچھی طرح ملیں اور پھر 15 منٹ کے لیے اس میں ہی چکن کو پڑا رہنے دیں۔ تیل گرم کریں اور اس میں پیاز کو اچھی طرح براؤن کریں۔ پھر اس میں پسا ہوا گرم مسالا ثابت مسالے میں ملائیں اور اس کڑی پتا اور لیموں لگا کر چکن کو شامل کر لیں۔ اب اس آمیزے کو چند منٹ کے لیے پکائیں اور پھر اس میں پسا ناریل معہ ناریل کے پانی کے ڈال دیں۔ چمچہ چلاتی رہیں۔ جب تک کہ چکن گولڈن ہوا اور گریوی گاڑی ہو کر تیل چھوڑ دے اور مہک آنے لگے، آپ کا لذیذ چکن قورمہ تیار ہے۔ سلاد پودینہ، دھنیا کے ساتھ گارنش کر کے سادے یا تل والے نان کے ساتھ کھائیں۔

چکن حیدرآبادی

اجزاء

چکن درمیانی بوٹی	آدھا کلو
پیاز درمیانی کٹی ہوئی	2 عدد
لہسن ادرک پیسٹ	ایک کھانے کا چمچہ
لال مرچ	ایک کھانے کا چمچہ
ہری مرچ	4 عدد
دہی	ایک کپ
کڑی پتا	6 پتا

نمک	ایک چائے کا چمچ
کالی مرچ، سفید زیرہ	1 چائے کا چمچ
تیل	آدھی پیالی
تل، خشخاش، (بھون کر پیس لیں)	دو کھانے کے چمچے
ہلدی	1/4 چائے کا چمچ
ہرا دھنیا	ایک کھانے کا چمچ
املی کا رس	1 کھانے کا چمچ

ترکیب:

ایک ساس پین میں تیل گرم کریں۔ اس میں پیاز براؤن کریں۔ اب اس میں چکن ادرک، لہسن، گرم مسالا ثابت ڈال کر بھون لیں۔ کڑی پتا شامل کردیں۔ تھوڑا بھوننے کے بعد باقی مسالے اور دہی شامل کر کے بھونیں، تھوڑا سا پانی ڈال کر گلنے دیں۔ چکن گل جائے تو املی کا رس اور ہری مرچ شامل کر کے پانچ منٹ پکائیں اور دم پر رکھ دیں۔ ہرا دھنیا گارنش کریں۔

فش کڑاہی قورمہ

اجزاء

مچھلی (بڑے قتلے دھو کر خشک کرلیں)	375 گرام
دہی	3/4 کپ
چینی	آدھا چائے کا چمچ
گھی	3 کھانے کے چمچ
کری پتا الائچی	2.2 عدد
دار چینی	1 انچ کا ٹکڑا
پیاز (باریک کٹی ہوئی)	3 عدد

(مندرجہ ذیل اشیاء کو گرائنڈ کر کے پیسٹ بنالیں)

ادرک	ایک ڈیڑھ انچ کا ٹکڑا
سالم سرخ مرچ سرخ	3 عدد
پیاز بڑی	1 عدد
نمک	حسب ذائقہ

ترکیب:

گرائنڈ کیے ہوئے مسالا پیسٹ میں دہی، نمک چینی، نمک ور مچھلی ملائیں اور اچھی طرح مکس کرلیں تاکہ مچھلی پر مسالا کے بھرپور تہہ چڑھ جائے۔ ڈھانپ کر مچھلی کو 20 منٹ کے لیے میری نیٹ ہونے کے لیے رکھ دیں۔ ایک نان اسٹک کڑھائی میں گھی گرم کریں اس میں کڑی پتا، الائچی، لونگ اور دار چینی ملا دیں، چند منٹ تک چمچہ چلاتی رہیں، پھر پیاز کے سلائس ملا دیں۔ پیاز کو تیز گولڈن براؤن ہونے تک فرائی کریں، میری نیٹ مچھلی کو اس میں شامل کردیں اور ہلکی آنچ پر اس وقت تک پکنے دیں جب تک مچھلی تیار نہ ہو جائے۔ مسالا چیک کرلیں اور چاولوں کے ساتھ گرما گرم پیش کریں۔

بیکڈ پمفرٹ

اجزاء

پمفرٹ	دو عدد (وزن آدھا کلو)
نمک	ایک چائے کا چمچ
لال مرچ پاؤڈر	ایک چائے کا چمچ
ہلدی پاؤڈر	آدھا چائے کا چمچ
زیرہ پاؤڈر	ایک چائے کا چمچ
گرم مسالا پاؤڈر	ایک چائے کا چمچ
لیموں کا جوس	ایک چائے کا چمچ
کالی مرچ پاؤڈر	آدھا چائے کا چمچ
تیل	حسب ضرورت

ترکیب: پمفرٹ کو دھو کر خشک کرلیں۔ اس پر نمک اور جوس لگا کر کٹس لگا دیں۔ لال مرچ پاؤڈر' ہلدی پاؤڈر' زیرہ پاؤڈر' گرم مسالا پاؤڈر' کالی مرچ پاؤڈر اور تیل مکس کر کے مچھلی پر لگا دیں۔ اس کو بیس منٹ کے لیے میری نیٹ کرنے کے لیے رکھ دیں۔ اوون کو گرم کرلیں۔ مچھلی کو بیکنگ ڈش میں ڈال کر بیک کرلیں۔ اچھی طرح بیک ہو جائے تو اوون سے نکال لیں۔ لیموں کی قاشوں' ٹماٹر اور کھیرے کے ساتھ سرو کریں۔

☆☆

حکیم جی!

محمد رضوان حکیم

ساتھیو! اکثر ہمیں کسی ایسی بیماری سے سامنا کرنا پڑتا ہے جس کے لیے ہمیں سمندر کی تہہ یا آسمان کی بلندیوں، جنگل بیابانوں یا پہاڑوں تک پر جانا پڑ جاتا ہے مگر...... جان ہے تو جہان ہے۔ خدا اگر بیماری دیتا ہے تو اُس نے شفا بھی دی ہے۔ قدرت کے طریقۂ علاج کا آج بھی کوئی مول نہیں۔ حکمت کو آج بھی روزِ اول کی طرح عروج حاصل ہے۔ اسی لیے طبیب اور حکیم صاحبان کو خدائی تحفہ کہا جاتا ہے۔ آپ کی صحت اور تندرستی کے لیے ہم نے یہ سلسلہ بعنوان 'حکیم جی' شروع کیا ہے۔ اُمید ہے ہمارے مستند اور تجربہ کار حکیم صاحب آپ کی جملہ بیماریوں کے خاتمے کے لیے اہم کردار ادا کریں گے۔ نیا سلسلہ حکیم جی! آپ کو کیسا لگا؟ اپنی آراء سے ضرور آگاہ کیجیے گا۔

ہر طرح کی بواسیر کے لیے

بواسیر دراصل پھولی ہوئی رگیں ہوتی ہیں۔ جو مسّوں کی صورت اختیار کر لیتی ہیں۔ بواسیر دو طرح کی ہوتی ہے، ایک بادی اور دوسری خونی۔ بادی بواسیر میں مسّے سوج جاتے ہیں۔ جن میں شدید درد اور خارش ہوتی ہے۔ بالخصوص بیٹھنے اور چلنے سے تکلیف میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ ان مسّوں سے خون نہیں نکلتا جبکہ خونی بواسیر میں خون کا اخراج ہوتا ہے۔ دورانِ اجابت شدید چبھن، درد اور جلن ہوتی ہے۔ مریض تکلیف کے خوف سے

اجابت کو نہیں جاتا جو مرض میں مزید پیچیدگیوں کا باعث بنتی ہے۔ خونی بواسیر میں اخراج خون کی وجہ سے جسم میں خون کی کمی ہو جاتی ہے۔ جس کے باعث مریض میں اعصابی جسمانی اور ذہنی کمزوری پیدا ہو جاتی ہے اور دیگر مسائل بھی پیدا ہو جاتے ہیں۔ اس مرض میں عمر اور جنس کی کوئی قید نہیں ہوتی۔ یہ مرض نہایت عام ہے۔ لیکن اس مرض کی تکلیف ہر فرد میں مختلف ہوتی ہے۔

اس مرض کی وجوہات میں زیادہ دیر بیٹھے بیٹھے کام کرنا، ورزش اور چہل قدمی سے دور رہنا، اسہال کی زیادتی (کیونکہ اسہال کی زیادتی کے باعث خراشیں پڑ جاتی ہیں۔ جو بواسیر کے پیدا ہونے کا سبب بن سکتی ہیں)۔ تیز مرچ مسالا دار اور بادی اشیا کا زیادہ استعمال، جلاب آور ادویات کا زیادہ استعمال، بالخصوص قبض کا ہونا کیونکہ دوران اجابت زور لگانے سے رگوں پر بوجھ پڑتا ہے۔ جس کی وجہ سے وہ سوج کر باہر کی طرف نکل آتی ہیں، جو مسّے بن جاتے ہیں۔

مندرجہ ذیل نسخہ تین طرح سے فائدہ مند ہے۔

1- خونی بواسیر سے متعلقہ زخموں کو جلد مندمل کرتا ہے۔

2- مسّوں میں سوزش و جلن کو فوری آرام پہنچانے میں انتہائی مؤثر ہے۔

3- مسّوں میں درد و سوجن کو رفع کرتا ہے، اس کے مسلسل استعمال سے مسّے ختم ہو جاتے ہیں۔

نسخہ

بکائن	10 گرام
تخم نیم	10 گرام
گلِ ارمنی	10 گرام
انجبار کی لکڑی	10 گرام
آملہ	10 گرام
پوست ہڑلہ زرد	10 گرام
پوست بہڑا	10 گرام
اجوائن خوراسانی	10 گرام
رسوت	10 گرام
مصبر	10 گرام
سنگ جراحت	10 گرام
تخم گندنہ	10 گرام
گوگل	10 گرام

ترکیب: ان تمام اجزاء کا سفوف بنا کر صبح و شام ایک چائے کا چمچہ پانی سے کھائیں۔

پرہیز: تمام گرم اور بادی چیزیں استعمال نہ کریں۔☆

جائفل یا جائے پھل

یہ گھروں میں استعمال ہونے والا ایک عام مسالا ہے۔ جائفل نظام قلب کو متحرک رکھنے کا ایک قدرتی ذریعہ ہے۔ اسے گاؤٹ (Gout) کے باعث پیدا ہو جانے والی جوڑوں کی سوزش کے علاج کے لیے بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ تاہم اس مسالے کو استعمال کرتے ہوئے بہت زیادہ احتیاط کی ضرورت ہے کیونکہ اس کی زیادہ بڑی خوراک زہریلے اثرات بھی پیدا کر سکتی ہے۔ حاملہ ماؤں اور بچوں کو ہربل علاج کی غرض سے جائفل کا استعمال نہیں کرنا چاہیے۔

جائفل پیچش کے علاج کے لیے بھی مفید ہے۔ ایک چائے کے چمچے کے آٹھویں حصے کے برابر پسے ہوئے جائفل کو گرم دودھ میں ملائیے اور اسے پی لیجیے۔

جائفل کی ذرا سی مقدار کو جو مٹر کے دانے کے برابر ہو، روزانہ دن میں ایک بار ایک طویل عرصے تک استعمال کیا جاتا ہے (چھ ماہ سے ایک سال تک کے عرصے کے لیے) یہ علاج قدیم اعصابی تکالیف نیز خون کی خراب گردش کے نتیجے میں پیدا ہونے والی قلب کی تکالیف کے لیے مفید ہوگا۔

جائفل کو اگر دودھ اور بیک کیے ہوئے پھلوں میں ملا کر استعمال کیا جائے تو اس سے ہاضمے میں مدد ملتی ہے اور نیند نہ آنے کی شکایت دور ہوتی ہے۔ تاہم، اس بات کا خیال رہے کہ بڑی خوراک زہریلے اثرات پیدا کر سکتی ہے اور حاملہ خواتین کے لیے انتہائی مضر ثابت ہو سکتی ہے۔

بیوٹی گائیڈ

آپ کے جانے پہچانے اسکن اسپیشلسٹ ڈاکٹر خرم مشیر

ہر ماہ آپ کی بیوٹی سے متعلقہ مسائل کے حل کے ساتھ

اچھے قارئین! آج ہم آپ کو میک اپ سیکھنے کے لیے بہترین اور آسان طریقے بتائیں گے۔ آپ میک اپ سیکھیے اور یاد رکھیے۔ ایک ایسی خاتون بھی پروفیشنل ہو سکتی ہیں جو اس ہنر مندی سے واقف نہ ہو۔ میک اپ صرف چہرے پر رنگ بکھیرنے کا نام نہیں ہے بلکہ سچ پوچھیے تو بدنما میک اپ کر کے تقریب میں شرکت کرنے سے بہتر ہے کہ آپ صاف ستھرا، سادہ چہرا لیے تقریب میں شریک ہو جائیں یعنی میک اپ اگر کیا جائے تو اسی صورت میں کیا جائے کہ آپ کی شخصیت کا ہر رنگ نکھر آئے اور چہرے کے بدنما داغ دھبے چھپ جائیں، نقوش بہتر طور پر نمایاں ہوں اور یہ تمام باتیں یکجا ہو کر آپ کے حسن میں اضافہ کریں۔

میک اپ کا صحیح اور قابل توجہ تاثر صرف اس وقت قائم ہوگا جب آپ اپنی عمر، رنگت، جلد، تقریب اور لباس چیزوں کو ذہن میں رکھتے ہوئے رنگوں کا استعمال کریں گی۔ میک اپ کے کئی اہم اجزاء ہیں جن میں سے بنیادی قسم کے چار اجزاء مندرجہ ذیل ہیں۔

1) بیس رفاؤنڈیشن
2) آئی میک اپ یعنی آنکھوں کا میک اپ۔
3) بلش آن اور چہرے کا خط
4) لپ اسٹک

ان اجزاء کی اہمیت پر روشنی ڈالنے کے لیے ان کی ضروریات اور طریقہ کار کو ہم ذرا تفصیل سے بیان کرتے ہیں:

1) بیس یا فاؤنڈیشن

فاؤنڈیشن سے مراد ہے بنیاد۔ یہ میک اپ کی بنیاد ہے آپ کے چہرے کی بیس جو نہ صرف چہرے کے داغ دھبوں، حلقوں اور جھائیوں سے پاک نظر آنے میں اہم کردار ادا کرتی ہیں۔ بلکہ رنگت کے اجلے اور نکھرے ہونے کا بھی تاثر دیتی ہے۔ میک اپ بیس بہت سی اقسام میں مارکیٹ میں دستیاب ہیں جیسا کہ۔

1) آئل بیس (Oil Base) یا لیکویڈ بیس (Liquid Base) اس قسم کی بیس خشک جلد پر خشک موسم میں استعمال کی جاتی ہے۔ چکنی جلد پر استعمال کی صورت میں جلد کی چکنائی اور بیس کی چکنائی مل کر دھبہ بن سکتا ہے۔ اگر آپ آئل بیس کا استعمال کرنا چاہتی ہیں تو اس کی چکنائی کو کم کرنے کے لیے پانی ملالیں اور میک اپ پف استعمال کیے بغیر انگلیوں کی مدد سے بیس کو جلد میں جذب کروائیں۔ آخر میں فیس پاوڈر سے پوری بیس کو Cover کریں۔

پین کیک

یہ پانی کے ساتھ اسپنج کی مدد سے لگایا جاتا ہے اور صرف چکنی جلد کے لیے مناسب ہے۔ لیکن یہ بیس اتنی خشک ہوتی ہے کہ جلد پر اس کے استعمال کے بعد دراڑیں ابھرنے لگتی ہیں اور یہ جلد پر لگنے کے بعد رنگت تبدیل کر سکتی ہے۔ اس لیے اس بیس کا استعمال صرف گرمیوں کے موسم میں نمی کی صورت میں ایسی جلد پر کیا جائے جو بہت چکنی ہو۔

اسٹک بیس

اسٹک بیس بہت چکنی اور گاڑھی ہوتی ہے۔ اسی لیے واٹر پروف بھی ہوتی ہے۔ لیکن پسینہ آنے کی صورت میں دھبے بن سکتے ہیں۔ گلیسرین میں بنی ہوئی اسٹک بیس نارمل اور خشک جلد پر پانی کے ساتھ استعمال کی جاتی ہے اور

بخوبی جلد میں جذب ہو کر ملائم اور شفاف جلد کا تاثر دیتی ہے۔اس قسم کی اسٹک سے دھبہ بننے کا خطرہ بھی کم ہوتا ہے لیکن گلیسرین میں چکنائی کی موجودگی کے باعث چکنی جلد پر اس کا استعمال مناسب نہیں۔

واٹر بیس کیک

یہ بہترین بیس ہے جسے ہر قسم کی جلد پر استعمال کیا جا سکتا ہے۔ یہ بیس پانی کے ساتھ اسپنج کے ذریعے لگائی جاتی ہے (جیسا کہ پین کیک کو استعمال کیا جاتا ہے) لیکن یہ پین کیک جتنی خشک نہیں ہوتی نہ ہی چکنی ہوتی ہے کہ دھبوں کا خطرہ ہو۔ بیس کو چھونے پر معمولی سا گیلا پن محسوس ہوتا ہے، بلینڈ کرنے میں آسان ہے اور دیر تک قائم رہتی ہے۔

داغ، چھائیاں، حلقے اور دانے چھپانے کے لیے Concealor Stick یا Concealor Cake کا استعمال کیا جاتا ہے جو بآسانی بازار میں دستیاب ہے۔ درآمد شدہ کینسیلرز اس لیے عموماً قابل استعمال نہیں ہوتے کیوں کہ جن ممالک سے انہیں درآمد کیا جاتا ہے وہاں گوری رنگت پائی جاتی ہے اور وہ رنگ صرف گوری رنگت کی Concealing کے لیے بہتر ہوتے ہیں۔ سانولی رنگت پر ان رنگوں کے استعمال سے سفیدی تہہ بن جاتی ہے جو داغ وغیرہ چھپانے میں کارآمد نہیں ہوتی۔ اس لیے ضروری ہے کہ Concealor خریدتے وقت ماہرانہ رائے حاصل کرلیں تاکہ بہتر نتیجہ حاصل ہو سکے۔

2) آئی میک اپ

آئی میک اپ ایک انتہائی تکنیکی کام ہے اور اس میں نہ صرف شیڈ یعنی رنگ بلکہ آئی میک اپ کے طریقے کو بھی بہت اہمیت حاصل ہے۔ ہر چہرے پر ہر رنگ کا استعمال نہیں کیا جا سکتا۔ ہر چہرہ اپنے لیے خاص رنگ کا انتخاب چاہتا ہے۔ اگر آپ نے لباس کی میچنگ کے عین مطابق رنگوں کا استعمال آنکھوں پر کر لیا تو یقیناً خوبصورت آئی میک اپ نہ کر پائیں گی۔ رنگوں کو ملانا اور ان میں سلور یا گولڈن کا اضافہ کرنا بہت ضروری ہے مثلاً اگر آپ جامنی رنگ بنانا چاہتی ہیں تو گلابی اور نیلے رنگ کو ملا کر استعمال کریں پھر لباس کی مناسبت سے گلابی یا نیلے کا تناسب کو بڑھاتی اور گھٹاتی رہیں، حتیٰ کہ آپ کی پسند کا رنگ حاصل ہو جائے۔ آنکھوں کو بڑا دکھانے کے لیے "بلیک اینڈ وائٹ تکنیک" کا استعمال کریں۔ آنکھوں کے ساتھ ساتھ بیرونی حصے میں گہری سیاہ لکیر بنائیں اور آنکھوں کے اندر سفید پینسل لگائیں تو آنکھیں کھلی ہوئی اور نمایاں نظر آئیں گی۔ کاجل لگانے سے آنکھوں کے اندر گہری رنگت آتی ہے اور ان کی لمبائی چوڑائی کم دکھائی دیتی ہے۔ اگر آپ ایک آنکھ میں کاجل کا استعمال کریں اور دوسری میں سفید پینسل کا تو آپ خود دیکھ لیں گی کہ کاجل والی آنکھ چھوٹی جب کہ پینسل والی آنکھ بڑی نظر آتی ہے۔

آئی لائنر

آئی لائنر کا استعمال آج کل فیشن ہے۔اس کا استعمال ہر قسم کی آنکھ پر کیا جا سکتا ہے۔ صرف یہ بات ذہن میں رکھیں کہ بڑی آنکھ پر موٹا لائنر اور چھوٹی آنکھ کے اندرونی حصے پر (ناک کے قریب) لائن چوڑی اور بیرونی حصے پر (کان کی جانب) لائن باریک ہو۔

مسکارا

مسکارا دو طرح کا ہوتا ہے۔

i) واٹر پروف ii) ڈھل کر اترنے والا

اگر آپ اپنا میک اپ خود کرتی ہیں تو ضروری ہے ایسا مسکارا استعمال کریں جو بآسانی ڈھل کر صاف ہو سکے تاکہ پلکیں گرنے کا امکان نہ رہے جب کہ دلہن میک اپ کے لیے واٹر پروف مسکارا ہی ضروری ہے۔

پلکیں

آپ پلکیں لگانے سے اس لیے خائف ہیں کہ آپ نے کسی تقریب میں ایسی خاتون کو دیکھ لیا ہے جن کی آنکھیں چھوٹی اور پلکیں بہت لمبی ہونے کے باعث بدنما دکھائی دے رہی تھیں اور آنکھیں حلقوں میں دھنسی ہوئی دکھائی دے رہی تھیں تو یہ وہم ذہن سے نکال دیں کہ آپ پر بھی یہ فیشن ایسا لگے گا جیسا کہ ان خاتون پر لگ رہا تھا۔ دراصل پلکوں کے مختلف سائز اور نمبر ہوتے ہیں۔ جو ہر آنکھ کی مناسبت سے استعمال کیے جاتے ہیں۔ اکثر ان میں لمبائی یا گھنے پن کی کمی کرنا ضروری ہوتا ہے۔

3) فیس شیپ اور بلش آن

بلش آن لگاتے ہوئے چہرے کی شیپ کا خاص خیال رکھنا چاہیے کیوں کہ صحیح طور پر لگائے گئے بلش آن کے ذریعے آپ چہرے کو چھوٹا، بڑا بھی کر سکتی ہیں اور اس سے شیپ کو بیضوی بنانے میں بھی مدد مل سکتی ہے۔

☆☆☆